تفسیر قرآن کے اُصول و مسائل

مقدمہ تفسیر میزان القرآن

www.KitaboSunnat.com

تالیف
الطاف احمد اعظمی

حمزہ بکس پبلشرز
HAMZA BOOKS PUBLISHER

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

library@mohaddis.com

www.KitaboSunnat.com

تفسیر قرآن کے اصول و مسائل

DATA ENTERED

3/12/9

تالیف

الطاف احمد اعظمی

www.kitabosunnat.com

ناشر

حمزہ بکس

الفضل مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔

فون:042-37241723, 0320-4161982

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : تفسیر قرآن کے اُصول ومسائل

تالیف : الطاف احمد اعظمی

ناشر : حمزہ بکس، الفضل مارکیٹ، اُردو بازار لاہور۔

طبع : 2015ء

قیمت : 400/روپے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فہرستِ مضامین

دیباچہ		۵
باب اول :	وحی اور اس کے متعلقات	۱۳
	وحی کی حقیقت	۱۴
	قرآن کی وجہِ تسمیہ	۳۴
	قرآن کے اسمائے صفات	۴۵
	سورتوں کی غیر نزولی ترتیب	۵۴
	نظمِ قرآن	۵۹
باب دوم :	قرآن کی علمی ولسانی خصوصیات	۸۷
	نزولِ قرآن کی غرض وغایت	۸۸
	قرآن کے بنیادی علوم	۹۷
	قرآن کی زبان	۱۲۲
	اسالیبِ قرآن	۱۴۰
	مصطلحاتِ قرآن	۱۶۱
	ظواہرِ قرآن	۱۸۸
	ناسخ ومنسوخ	۱۹۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم :	تفسیر ماثور وغیر ماثور	۲۱۹
	تفسیر اور تاویل میں فرق	۲۲۰
	علمِ تفسیر	۲۲۱
	تفسیرِ ماثور	۲۲۲
	تفسیرِ غیر ماثور	۲۳۸
	تفسیرِ علمی	۲۵۱
	تفسیرِ قرآن میں اختلاف اور اس کے وجوہ	۲۶۰
باب چہارم :	احسن طریقۂ تفسیر	۲۷۱
	قرآن کی حفاظت	۲۷۲
	قرآن خود اپنا شارح ہے	۲۷۶
	تفسیر قرآن بالقرآن	۲۸۵
	تفسیر بالقرآن کے اصول:	۲۹۴
	اخلاصِ نیت	۲۹۴
	تدبّر	۲۹۶
	سیاقِ کلام (نظم)	۳۰۴
	نظائر	۳۱۳
	ہم مضمون آیاتِ متفرقہ کا کلی مطالعہ	۳۱۷
باب پنجم :	تفسیر کے ثانوی ماخذ	۳۳۳
	شانِ نزول	۳۳۴
	حدیث	۳۴۲
	قدیم مذہبی صحائف	۳۴۷
	قدیم اقوام کی تاریخ و آثار	۳۵۲
	اشعار جاہلیت، عربی لغات، کتب تفسیر	۳۵۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

راقمِ سطور نے ''میزان القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر کے لیے جو مقدمہ لکھا گیا وہ کافی طویل ہوگیا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کو الگ سے شائع کیا جائے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تفسیر کی پہلی جلد کی ضخامت کم ہو جائے گی۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تفسیر کے مطالعہ سے پہلے مقدمہ قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہوگا اور وہ اس کے مختلف مباحث سے واقف ہو چکے ہوں گے۔ مزید برآں، انھیں صاحب تفسیر کے اصولِ تحقیق اور منہاجِ تفسیر سے بھی یک گونہ واقفیت حاصل ہو چکی ہوگی۔ یہی مقدمہ اس وقت 'تفسیرِ قرآن کے اصول ومسائل' کے نام سے قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔

اصولِ تفسیر کے موضوع پر اب تک جو چند مختصر رسائل لکھے گئے ہیں ان میں مقدمہ فی اصول التفسیر (مؤلفہ امام ابن تیمیہ)، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)، تحریر فی اصول التفسیر (سرسید احمد خانؒ) اور التکمیل فی اصول التاویل (مولانا حمید الدین فراہیؒ) قابل ذکر ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام ابن تیمیہؒ کے رسالہ 'مقدمہ فی اصول التفسیر' میں تفسیر کے جن اصولوں کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق تفسیرِ ماثور (تفسیر بالرّوایت) سے ہے۔ یہ کوئی نئے اصول نہیں ہیں۔ فقہ اسلامی میں قرآن کے کلی اصولوں سے تخریج احکام کے لیے جو اصول وضع کیے گئے تھے ان ہی اصولوں میں معمولی سا ردّ و بدل کر کے ان کو تفسیرِ ماثور پر منطبق کیا گیا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنے مذکورہ رسالے میں صحابہ کا طریقۂ تعلیم، ان کے درمیان فہم قرآن میں اختلاف اور اس کی نوعیت، الفاظِ قرآن کے معنی متعیّن کرنے کا طریقہ، عہدِ تابعین کے بعد تفسیر میں اختلافات، تفاسیر میں موضوع روایات کی شمولیت، اختلافِ تفسیر کے اسباب اور تفسیر بالرّائے جیسے اہم تفسیری مباحث پر مفید گفتگو کی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر' میں تفسیرِ منقول کے اصولوں سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے اپنی توجہ تفسیر کے دوسرے اہم مباحث پر مرکوز رکھی ہے، مثلاً قرآن کے بنیادی علوم، شانِ نزول، ناسخ و منسوخ، قرآن کی لسانی خصوصیات، اسالیب بیان اور فہمِ قرآن میں مشکلات وغیرہ۔ قرآنی آیات کے فواتح اور ان کے صوتی پہلوؤں سے بھی اس میں بحث کی گئی ہے۔ قرآن کے ایجازِ بیان کے ذکر میں محذوفات کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اپنے مباحث کی جدّت کے لحاظ سے یہ رسالہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

سر سید احمد خاں کا رسالہ بہت مختصر ہے۔ اس میں انھوں نے ان اصولوں سے بحث کی ہے جن کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تفسیر لکھی ہے۔ یہ کل پندرہ اصول ہیں۔ ان میں سے آخری اصول براہِ راست تفسیر سے متعلق ہے اور اس میں قرآن کے لسانی مسائل پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مولانا فراہیؒ کا رسالہ نہایت جامع ہے۔ یہ پہلا رسالہ ہے جس میں تاویل کے مختلف مسائل و مباحث پر بڑے عالمانہ اور محققانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو اس موضوع پر پورا عبور حاصل ہے۔ مولانا نے تاویل کے کچھ ایسے عمدہ اصول پیش کیے ہیں جن کی مدد سے قرآن کی آیات کے مفہوم و منشاء کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے اور تاویل کی غلطیوں سے بچا جاسکتا ہے۔

تاویل کے ان اصولوں میں نظمِ قرآن کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا کے نزدیک نظم کا مطلب محض آیات کے درمیان معنوی مناسبت نہیں بلکہ اس کا تعلق سورہ کے نظام سے ہے۔ ان کی تشریح کے مطابق ہر سورہ کا ایک مرکزی موضوع (عمود) ہے، جس سے اس سورہ کی جملہ آیات معنوی ربط و اتصال رکھتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ ایک نظام کے اندر مختلف معنوی جہتوں سے باہم مربوط ہوتی ہیں۔

ان مذکورہ رسائل کی اہمیت و افادیت کے باوجود راقم نے محسوس کیا کہ اس موضوع پر اب بھی ایک ایسی جامع کتاب کی ضرورت ہے جس میں ان تمام امور و مسائل پر جن کا تعلق قرآن کی تفہیم و تفسیر سے ہے، قرآن ہی کی روشنی میں بحث کی گئی ہو تاکہ ان بہت سی مشکلات کا ازالہ ہو جو آج بھی فہمِ قرآن کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرے گی۔ ان شاء اللہ

یہاں یہ بات واضح کردوں اور اس کا ذکر کتاب میں بھی ہے، کہ قرآن ایک واضح اور قطعی الدلالت کلام ہے۔ اس کے اجمالات کی تفصیل اور اس کے ابہامات کی تبیین خود اللہ تعالیٰ نے کردی ہے۔ اس لیے اب کسی مفسر کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی عقل یا نقل کی مدد سے قرآن کی آیات کا معنی و مفہوم متعین کرے بلکہ اس کا اصل

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کام قرآن کی آیات کے واقعی مفہوم کو جسے 'تصریفِ آیات' (سورۂ انعام۔۶۵) کے قرآنی طریقۂ توضیح کے تحت جگہ جگہ کھول دیا گیا ہے، خوب اچھی طرح سمجھ کر ان لوگوں کو سمجھانا ہے جو قرآن کو براہِ راست نہیں سمجھ سکتے ہیں۔

راقم نے اس مقدمہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ بابِ اوّل میں وحی کی حقیقت، قرآن کی وجہِ تسمیہ اور اس کے صفاتی اسماء، سورتوں کی غیر نزولی ترتیب اور نظمِ قرآن جیسے اہم موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

وحی کی حقیقت اور اس کی قسموں کے بارے میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ بہت سے علماء نے حدیث پر بھی اس معنی میں وحی کا اطلاق کیا ہے جس معنی میں وہ قرآن کے لیے معروف ہے۔ چنانچہ وحیِ قرآن کے ساتھ وحیِ حدیث کی اصطلاح بھی وضع کر لی گئی ہے۔ اس کو وحیِ غیر متلو بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض علماء کے نزدیک وحی کا مصدر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تھی۔ دوسرے لفظوں میں خدا اور اس کے رسول کے درمیان وحی کی ترسیل کا جو وسیلہ تھا وہ خارجی کے بجائے داخلی تھا، یعنی ملکۂ نبوت جو نبیِ امی صلی اللہ علیہ وسلم کو فیضانِ الٰہی سے ملا تھا۔ یہ سب باتیں غلط ہیں اور ان کی غلطی کو دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔

نظمِ قرآن بھی تفسیر کا ایک اہم موضوع ہے۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ قرآن کی تمام سورتوں میں نظم کا ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ وہ مختلف اوقات میں متفرق ضرورتوں کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا ہے۔ اس خیال کو اکثر لوگوں نے قبول کر لیا ہے اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ ایک عام قاری جو فکر وتدبر کا عادی نہیں ہوتا، قرآن کی تلاوت کے دوران محسوس کرتا ہے کہ اس کی آیات میں کوئی معنوی ربط وتسلسل نہیں ہے، ابھی ایک بات چل رہی ہے کہ اچانک دوسری بات شروع ہو جاتی ہے جو پہلی بات سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یکسر غیر متعلق ہوتی ہے۔

لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ قرآن کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ وہ اپنے موضوعات اور مضامین کے لحاظ سے ایک غیر معمولی مذہبی صحیفہ اور ربّانی ہدایت کے سلسلۂ زرّین کی آخری کڑی ہے۔ وہ کسی مبالغہ کے بغیر آفتابِ ہدایت اور گنجینۂ معارف ہے، وہ ایک ایسا نسخۂ کیمیا ہے جو مس خام کو کندن بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک ایسی بلند پایہ کتاب غیر منظم نہیں ہو سکتی ہے، جیسا کہ اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔

معلوم ہے کہ قرآن میں سورتوں کی ترتیب زمانۂ نزول کے لحاظ سے نہیں ہے۔ جو سورتیں پہلے نازل ہوئیں وہ مؤخر اور بعد میں نازل ہونے والی سورتیں مقدم ہو گئی ہیں۔ جو اہلِ علم اسلام کے مخالف ہیں بالخصوص مغرب کے اربابِ دانش، وہ اس ترتیب پر اعتراض کرتے ہیں اور جو لوگ اس کتابِ عزیز پر ایمان رکھتے ہیں وہ موجودہ ترتیب کو دیکھ کر دل میں بے اطمینانی محسوس کرتے ہیں مگر اس کی توجیہ سے قاصر رہتے ہیں۔ غالباً پہلی بار اس غیر نزولی ترتیب کی ایک ایسی توجیہ پیش کی گئی ہے جو ان شاء اللہ اطمینان بخش ثابت ہوگی اور معلوم ہوگا کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب میں ایک بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔

دوسرا باب اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں قرآن کے بنیادی علوم، اس کی غایتِ نزول، اس کی زبان، اس کے اسالیب، اس کی مصطلحات، ظواہرِ قرآن اور ناسخ و منسوخ جیسے مشکل قرآنی مباحث پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ان علمی کوششوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے جو ماضی میں قرآن کی تفسیر و تشریح کے سلسلے میں انجام دی گئی ہیں۔ اس میں تفسیرِ ماثور اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ غیر ماثور دونوں طریقہ ہائے تفسیر کا محاکمہ شامل ہے۔اہل علم جانتے ہیں کہ قرآن عربیِ مبین میں نازل ہوا ہے، اس کا مفہوم و مدعا واضح ہے، اس میں کسی طرح کا کوئی معنوی ابہام نہیں ہے، لیکن اس حقیقت کے باوجود قرآن کی تفسیر میں کثرت سے اختلافات ہوئے۔اس اختلاف کے متعدد اسباب ہیں جن کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں اس طریقۂ تفسیر کو بیان کیا گیا ہے جو تمام علماء کے نزدیک تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ ہے یعنی تفسیرِ قرآن بالقرآن، لیکن افسوس کہ زیادہ تر مفسرین نے نہ تو اس طریقے پر اکتفا کیا اور نہ ہی اس کے لیے مستقل اور محکم اصول وضع کیے۔ راقم نے اس سلسلے میں چند اصول مقرر کیے ہیں، جن میں اخلاصِ نیت، تدبّر، سیاقِ کلام (نظم)، نظائر اور ہم مضمون آیاتِ متفرقہ کا کلّی مطالعہ جیسے اصول قابل ذکر ہیں[1]۔ اگر دیانت داری کے ساتھ ان اصولوں کی پیروی کی جائے تو نہ صرف آیات کی تفہیم میں آسانی ہوگی بلکہ اختلافِ معنی کا امکان بھی بہت کم ہو جائے گا۔

باب پنجم کا تعلق تفسیر کے ثانوی ماخذوں سے ہے۔ ان میں شانِ نزول، حدیث، قدیم مذہبی صحائف، قدیم اقوام کی تاریخ و آثار، اشعارِ جاہلیت، عربی لغات اور کتبِ تفسیر جیسے اہم ماخذ شامل ہیں۔تفسیرِ قرآن میں ان ثانوی ماخذ سے استفادہ کرتے وقت دو باتوں کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ان کی حیثیت اصل کے بجائے فرع کی ہے، یعنی ان کے ذریعے سے حاصل کردہ وہی مفہوم قبول کیا جائے گا جو اصل یعنی قرآن کے سیاق و نظائر سے معنوی مطابقت رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ ان ماخذ کی مراجعت اسی وقت کی جائے جب قرآن کے کسی اجمال کی تفصیل ان کی مدد کے بغیر ممکن نہ ہو۔ ان دو باتوں کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے قرآن کی متعدد آیات کے فہم میں غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔

---

[1] اس سلسلے میں مولانا فراہیؒ کے اصولِ تفسیر سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ (مصنف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آخر میں قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس کتاب کو خوب غور سے پڑھیں تاکہ ان کے لیے فہمِ قرآن کا معاملہ آسان ہو۔ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ وہ اس کا تنقیدی مطالعہ فرمائیں اور اس کے خوب وزشت دونوں سے اس ناچیز مصنف کو آگاہ فرمائیں، وہ ان کا بے حد ممنون ہوگا۔

راقم سراپا عجز و نیاز بن کر اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اس کم علم و کم سواد کو اس اہم کتاب کے لکھنے کی توفیق بخشی اور ہر قدم پر آسانیاں بہم پہنچائیں۔

و اٰخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

الطاف احمد اعظمی

۲۸ر مارچ ۲۰۰۸ء

تغلق آباد، نئی دلی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل:

وحی اور اس کے متعلّقات

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

وحی کی حقیقت

قرآن تمام تر وحی پر مشتمل ہے، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست اور بالواسطہ دونوں طرح وصول کیا اور پھر آپؐ کے توسط سے یہ امت کو ملا۔ یہ وحی کیا چیز ہے اور کس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوئی اور آپؐ نے اس کو کس طرح اخذ کیا؟ ان امور کے بارے میں علماء اور مفسّرین کا اختلاف ہے۔ انھوں نے وحی کی جو حقیقت بیان کی ہے اور اس کو ''وحی متلو وغیر متلو'' میں تقسیم کیا ہے اس سے راقم کو اتفاق نہیں ہے۔ لیکن اس اختلاف پر گفتگو سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے معنی ومفہوم کو ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے۔

لغوی معنی

لغت میں وحی کے معنی متعدد ہیں۔ ایک بنیادی معنی اشارہ کرنے کے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ وحی کی اصل اشارت ہے جو بسرعت واقع ہو، چنانچہ 'امر وحی' کا مطلب ہے 'امر سریع'[1]۔ کبھی گفتگو رمز وکنایہ میں ہوتی ہے اور کبھی کسی آواز کے بغیر بدن کے کسی عضو کے ذریعہ سے اشارہ کرکے یا لکھ کر ہوتی ہے۔ آنکھوں سے اشارہ کرنے کے معنی میں ایک عربی شاعر کہتا ہے:

فاوحیٰ الیھا الطرف انی احبھا
فاثر ذاک الوحی فی وجناتھا

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، ص ۵۳۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''آنکھوں نے اس کو اشارہ سے بتایا کہ میں اس کو محبوب رکھتا
ہوں۔ پس اس اشارہ نے اس کے چہرے پر اثر کیا۔''

انگلیوں سے اشارہ کرنے کو بھی وحی کہتے ہیں۔ مثلاً یہ مصرع:

فاوحیت الینا والا نامل رسلھا[1]

''اس نے ہماری طرف اشارہ کیا اور انگلیاں اس کی پیغام بر تھیں۔''

اشارت کے علاوہ کتابت (لکھنا)، پیغام بھیجنا، چھپا کر کوئی بات کہنا اور دل میں بات ڈالنا بھی وحی کے مفہومات میں داخل ہیں[2]۔ مکتوب اور کتاب کو بھی وحی کہا جاتا ہے[3]۔

قرآنی معنی

قرآن میں وحی (وایحاء) کا لفظ لغوی اور اصطلاحی دونوں میں استعمال ہوا ہے۔ لغوی یعنی اشارہ کرنے کے معنی میں ایک جگہ ہے:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ
سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا۝ (سورۂ مریم۔۱۱)

''پس وہ حجرہ سے (نکل کر) اپنے لوگوں کے سامنے آیا اور
ان سے اشارہ سے کہا کہ صبح و شام خدا کی تسبیح کرو۔''

دوسرے معنی (الہام والقاء) میں فرمایا ہے: وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ (سورۂ انعام۔۱۲۱) ''اور شیطان (قسم کے لوگ) اپنے

---

1. لسان العرب، ج ۱۵، ص ۳۷۹
2. ایضاً
3. ایضاً

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

دوستوں کے دلوں میں یہ بات ڈال رہے ہیں (یعنی انھیں اُکسار ہے ہیں) کہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔"

دوسری جگہ ہے: وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ الخ (سورۂ قصص۔۷) "ہم نے موسیٰ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ تم اس کو دودھ پلاتی رہو۔" ایک اور جگہ ہے: وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا الخ (سورۂ نحل۔۶۸) "اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کے جی (فطرت) میں یہ بات ڈالی کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا الخ۔"

یہ تو وحی وایحاء کے لغوی معنی ہوئے۔ لیکن قرآن میں جہاں خدا کی طرف سے اس کے رسولوں کی طرف وحی کرنے کا ذکر ہوا ہے اس سے مراد کوئی ہدایت یا پیغام بھیجنا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں وحی وایحاء سے کہیں زیادہ نزول وانزال اور تنزیل کے مصادر استعمال ہوئے ہیں۔ ایک جگہ 'ایحاء' کو 'توصیۃ' کے بالمقابل استعمال کیا گیا ہے جس سے اس مفہوم پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ
اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ...... الخ

(سورۂ شوریٰ۔۱۳)

"اللہ نے تم لوگوں کے لیے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے
نوح کو حکم دیا تھا اور جس کو ہم نے تمہارے پاس وحی کیا ہے،
اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ ...... کو دیا تھا۔"

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وحی یعنی حکم وہدایت کبھی تو براہِ راست ہوتی ہے اور کبھی بالواسطہ، خواہ یہ واسطہ کوئی مادّی ذریعہ ہو، جیسے اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

درخت کے توسط سے کلام کیا تھا (سورۂ قصص۔۳۰)، یا غیر مادّی یعنی فرشتہ۔ زیادہ تر وحی اسی ذریعے سے آئی ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں ان تینوں ذریعوں کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ
حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ
(سورۂ شوریٰ۔۵۱)

''اور کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر (کسی وسیلہ سے، مثلاً) وحی والہام سے، پردہ کے پیچھے سے، یا کوئی رسول بھیجے، پھر وہ اس کے حکم سے جو اس کو منظور ہو پہنچا دے۔''

31299

وحی کا شرعی مفہوم

شرع میں جب وحی کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ مخصوص خدائی ہدایت ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے اہلِ ایمان کو ملی ہے اور اسی حکم و ہدایت کا نام قرآن ہے۔ قرآن اور وحی باعتبارِ حقیقت مترادف الفاظ ہیں، جیسا کہ درج ذیل آیت میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ؗ
(سورۂ طٰہٰ۔۱۱۴)

''اس سے پہلے کہ اس کی وحی پوری، نازل ہو چکے، قرآن کے معاملہ (یعنی اس کو یاد کرنے) میں جلدی نہ کرو۔''

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

وحی کی خصوصیت

خدا کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو وحی بھیجی گئی اس کی نوعیت کیا تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کیوں کر وصول کرتے تھے؟ اس سلسلے میں حدیث کی کتابوں میں کئی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح آتی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا:

> احیاناً یاتینی مثل صلصلة الجرس وھو اشدّہ علیّ فیفصم عنّی وقد وعیت عنه ماقال، واحیاناً یتمثّل لی الملک رجلاً فیکلّمنی فاعی مایقول۔[1]
>
> ”کبھی وحی میرے پاس صدائے جرس کی طرح آتی ہے اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے، پھر وہ حالت رفع ہو جاتی ہے اور جو کچھ اس نے کہا اسے میں محفوظ کر لیتا ہوں۔ اور کبھی وہ فرشتہ (یعنی جبریل) میرے لیے آدمی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کر لیتا ہوں۔“

اس روایت میں بدونِ واسطہ اور بالواسطہ دونوں طرح کی وحی کا ذکر ہوا ہے لیکن دوسری روایتوں میں بالواسطہ وحی کی صورت اس سے مختلف بیان ہوئی ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ ”روح القدس نے میرے دل میں پھونکا“ (ان روح القدس نفث فی روعی)۔ ایک دوسرے روایت میں ہے کہ ”روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے“۔[2]

---

[1] بخاری، باب: بدا الوحی [2] مستدرک، حاکم، ج ۲، ص ۴

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

آخری دو روایتوں سے معلوم ہوا کہ وحی خواہ بالواسطہ ہو یا بدونِ واسطہ، اس کا تعلق براہِ راست پیغمبر کے دل سے تھا اور وحی یعنی خدا کا پیغام اس کے دل میں القا کر دیا جاتا تھا، جو لفظ و معنی دونوں کے ساتھ ہوتا اور وہ پیغمبر کے دل میں محفوظ ہو جاتا تھا۔ اس خیال کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ عبادہ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ "جب رسول اللہ پر وحی نازل ہوتی تو آپ بے چین ہو جاتے، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا، سر جھکا لیتے۔ (یہ حالت دیکھ کر) صحابہ بھی اپنے سروں کو جھکا لیتے۔ وحی کے ختم ہونے پر آپ سر اٹھا لیتے۔"[1]

بعض محقق علماء نے وحی کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس کائنات میں جتنی جاندار مخلوقات ہیں ان میں سے ہر ایک کو اس کے مقصدِ تخلیق کے لحاظ سے ایک خاص فطری ملکہ یا استعداد عطا کی گئی ہے۔ اس کی ایک عمدہ مثال شہد کی مکھی ہے۔ اللہ نے اس ننھی سی جان میں شہد سازی کا ایک عجیب و غریب ملکہ ودیعت کیا ہے۔ وہ بڑے حیرت انگیز طریقے سے مختلف اقسام کے پھولوں کا رس چوس کر کمالِ دانائی سے شہد جیسا خوش رنگ و خوش ذائقہ مشروب تیار کرتی ہے۔ قرآن میں اس کی اس فطری استعداد کے لیے وحی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ
بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ
بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ

(سورۂ نحل۔ ۶۸، ۶۹)

---

[1] بخاری، باب: عرق النبی صلی اللہ علیہ وسلم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

> ''اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کے جی (فطرت) میں یہ بات ڈالی کہ تو گھر (چھتے) بنا پہاڑوں اور درختوں میں اور ان ٹٹیوں میں جو (اسی مقصد کے لیے) بلندی میں باندھتے ہیں۔ پھر ہر قسم کے پھلوں (پھولوں) کا رس چوستی پھر، پھر اپنے رب کے نہایت آسان اور ہموار راستے پر چل (یعنی اس طریقے کے مطابق شہد سازی کر جسے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے)۔ اس کے پیٹ سے ایک مشروب نکلتا ہے (یعنی شہد)، جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، اس میں لوگوں کے (امراض کے) لیے شفا ہے۔''

یہی حال کائنات کی دوسری مخلوقات کا ہے۔ انسانی دنیا میں بھی ہم مختلف استعدادوں کے لوگ پاتے ہیں۔ بعض اشخاص میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خاص کام کا فطری ملکہ ہوتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتا یا اس پایہ کا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں میں یہ فطری ملکہ اتنا نمایاں اور بلند ہوتا ہے کہ اس کو دیکھ کر بہتوں کو حیرت ہوتی ہے۔ شعر و ادب، سماجی علوم اور سائنس اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں اس کی مثالیں ہر دور میں بکثرت موجود رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

اس خصوصیت کا اطلاق روحانی اشخاص پر بھی ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس طرح کے غیر معمولی صاحب دانش و بینش افراد کے لیے 'مفہومون' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''مفہومون مختلف استعداد کے اور کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ جس شخص کو عمدہ اخلاق اور تدبیر منزل کے علوم کا القا ہوتا ہے وہ حکیم کہلاتا ہے۔ جس کو سیاست کے امور کا القا ہوتا ہے اور وہ اس کو عمل میں لاتا ہے وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خلیفہ کہلاتا ہے۔جس کو ملاءِ اعلیٰ سے تعلیم ہوتی ہے اور اس سے کرامتیں ظاہر ہوتی ہیں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے۔اور جس کے دل اور زبان میں نور ہوتا ہے اور اس کی نصیحت سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کے حواریوں اور مریدوں پر بھی نور سکینہ نازل ہوتا ہے وہ ہادی اور مزکی کہلاتا ہے۔اور جو قواعدِ ملیّہ کا زیادہ جاننے والا ہوتا ہے وہ امام کہلاتا ہے ......اور جب خدا اپنی حکمت سے مفہومین میں سے کسی بڑے شخص کو مبعوث کرتا ہے تاکہ لوگوں کو ظلمات سے نور میں لائے تو وہ نبی کہلاتا ہے[۱]۔''

شاہ صاحب کی اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے مفہومین کی طرح انبیاء میں بھی ایک مخصوص فطرت یا استعداد ہوتی ہے اور بحیثیت رسول ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ اسی فطرت سے صادر ہوتا ہے ،البتہ اس کی یہ فطرت یا استعداد دوسرے مفہومین سے مختلف اور کامل ہوتی ہے۔شاہ صاحب نے اس خیال کو مبہم الفاظ و اصطلاحات اور پیچیدہ اسلوب میں بیان کیا ہے تاکہ وہ اعتراض کا محل نہ بن سکے۔

لیکن سر سید علیہ الرحمہ نے اس خیال کو مخالفت کی پروا کیے بغیر کھول کر بیان کیا ہے اور صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ وحی کا مصدر در اصل ملکۂ نبوت ہے جو خدا کی طرف سے پیغمبر کو عطا کیا جاتا ہے اور وہ کسی واسطے (فرشتہ وغیرہ) کے بغیر کام کرتا ہے ،یعنی خلق خدا کی ہدایت کا کام انجام دیتا ہے۔اس خیال کو انہی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

> ''ایسا ہادی جس میں اس قسم کی ہدایت کی کامل فطرت ہوتی ہے وہی نبی ہوتا ہے اور وہی فطرت ملکۂ نبوت، ناموسِ اکبر، جبریل اعظم کے لقب سے ملقّب کی جاتی ہے۔وہ کسی بات کو سوچتا ہے اور کچھ نہیں

---

۱ حجة الله البالغه، ج ۱، باب حقیقة النبوة و خواصها

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

جاننا دفعتہً اس کے دل میں بغیر کسی ظاہری اسباب کے ایک القا ہوتا ہے اور قلب کو ایک صدمہ اس کے القا سے محسوس ہوتا ہے جیسے کہ اوپر سے کسی چیز کے گرنے سے صدمہ ہوتا ہے یا اس قسم کا ایک انکشاف اس کے دل پر ہوتا ہے جو سچ مچ وہ جانتا ہے کہ تمام حجاب اٹھ گئے ہیں اور جس کی میں تلاش میں تھا شل سپیدۂ دمِ صبح میرے سامنے موجود ہے[1]۔''

راقمِ سطور کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ یہاں تک تو ان حضرات کی بات صحیح ہے کہ دنیا کے دوسرے بڑے انسانوں کی طرح پیغمبر بھی ایک جداگانہ اور کامل بشری طبیعت لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس کا نفس دوسرے انسانوں کے نفوس سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ وہ کوئی ایسا ملکہ لے کر پیدا ہوتا ہے جو بذاتِ خود منبعِ وحی ہوتا ہے اور جس چیز کو ناموسِ اکبر اور روح القدس اور جبرئیل کہا جاتا ہے وہ فی الحقیقت ملکۂ نبوت ہے، صحیح نہیں ہے۔

قرآن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسولوں کے غیر معمولی کلام کا مصدر خود ان کی ذات نہیں تھی۔ اس کی بہترین مثال نبی آخر ہیں جو امّی تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّیت کو قرآن میں ثبوتِ رسالت، کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۝

(سورۂ یونس۔ ۱۶)

''کہہ دو کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ میں تمھیں اس وحی کو سناتا اور نہ

---

[1] تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۱۷ (سورۂ انعام)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ تمھیں اس سے آگاہ کرتا۔ میں اس سے پہلے تمہارے
درمیان ایک عمر بسر کر چکا ہوں، کیا تم بالکل سمجھ نہیں رکھتے؟"

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس پیغمبر کی طرف سے جو کلام پیش کیا جارہا ہے وہ اس کے دماغ کی کرشمہ سازی نہیں ہے اور نہ اس کا مصدر اس کی ذات ہے، بلکہ یہ تمام تر ایک خارجی چیز ہے یعنی عطیۂ خداوندی۔ اس کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملتا ہے وہ اس کے بندوں تک جوں کا توں پہنچا دیتا ہے۔ اگر یہ اس کی ذات کا کمال ہوتا تو آغازِ نبوت سے پہلے عمر کے کسی حصے میں زیادہ نہ سہی اس کا نہایت قلیل حصہ ہی ظاہر ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ کوئی ایسا کلام اس رسول کی زبان مبارک سے صادر نہیں ہوا جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ ایک غیر معمولی دماغ لے کر پیدا ہوا ہے۔ اعلانِ نبوت سے پہلے وہ عقلی اعتبار سے اپنے معاشرہ کے دوسرے ذی علم افراد پر کوئی فوقیت نہیں رکھتا تھا۔ اسی تاریخی حقیقت کو آیتِ مذکورہ میں "فقد لبثتُ فیکم عمرا من قبلہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر رسول اخلاقی اعتبار سے اپنے سماج کا چیدہ ہی نہیں، افضل اور کامل ترین فرد ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا نفس طہارت و تزکیہ کا کامل نمونہ ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکی معاشرہ میں جن اوصافِ حمیدہ کی وجہ سے مشہور تھے وہ کوئی عقلی وصف نہیں بلکہ اخلاقی وصف تھا، یعنی آپ صادق اور امین کے نام سے معروف تھے۔ خود قرآن مجید میں آپ کے بارے میں فرمایا گیا ہے: وانک لعلیٰ خلق عظیم (سورۂ قلم۔۴) "بے شک تم خلقِ عظیم کے مالک ہو۔"

معلوم ہے کہ آغازِ نبوت سے بہت پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں مہینوں اعتکاف فرماتے اور وہاں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے تھے۔ اس عبادت و

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ریاضت سے مقصود نفس کا تزکیہ تھا تا کہ روحانی استعداد جو آپ میں فطرتاً موجود تھی، مزید ترقی کر کے اس مقام تک پہنچ جائے جہاں آئندہ خدا کے پیغام کو وصول کرنا آپ کے لیے آسان ہو جائے۔ چنانچہ جب آئینۂ قلب پوری طرح صیقل ہو گیا تو پہلی وحی اسی غار کے اندر آپ پر نازل ہوئی۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن میں دو مقامات پر وحی کو 'قولِ رسول' یعنی فرشتہ کا قول کہا گیا ہے اور دوسروں کی طرف جیسا کہ کفارِ عرب کہتے تھے، اس قول کی نسبت کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ○ وَمَالَا تُبْصِرُوْنَ ○ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (سورۂ حاقہ: ۳۸۔۴۳)

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک باعزت رسول کا قول ہے۔ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا کلام ہے، تم بہت کم غور وفکر کرتے ہو۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔"

دوسری جگہ ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ○ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ○ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ○ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ○ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ○ مُّطَاعٍ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثَمَّ أَمِينٍ ○ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ ○ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ
الْمُبِينِ○ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ○ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ
شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ○ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ ○ (سورۂ تکویر: ۱۵۔۲۶)

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، سیدھے چلنے والے اور چھپ جانے والے (ستاروں) کی اور رات کی جب کہ وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ نمودار ہوتی ہے کہ یہ ایک باعزت رسول کا قول ہے، بڑی قوت والا اور مالکِ عرش کے ہاں بلند رتبہ رکھتا ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، اس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ اور یہ تمہارا ساتھی (یعنی خدا کا رسول) کچھ دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے اس فرشتہ کو اُفق پر دیکھا ہے۔ یہ غیب کی باتیں بتانے میں بخیل نہیں ہے (یعنی کچھ بتائے اور کچھ روک لے)، اور یہ کسی شیطان مردود کا بھی قول نہیں ہے، پھر تم کدھر چلے جارہے ہو۔''

اس آخری آیت نے کسی اشتباہ کے بغیر متعیّن کر دیا کہ جس ذریعے سے خدا کی وحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر القا کی جاتی تھی وہ ملکۂ نبوت نہیں بلکہ ایک متشخّص وجود تھا یعنی خدا کا فرشتہ جو اس کائنات کی ایک بڑی قوت اور علم و دانائی میں بہت با کمال ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فرشتہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جیسا کہ آیت میں مذکور ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے بھیجی جانے والی وحی کو خواہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ، کس طرح وصول کرتے تھے، اس کا ادراک انسانی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عقل کے لیے ممکن نہیں ہے۔ خود رسول اللہ نے اس کے بارے میں جیسا کہ ذکر ہوا، تمثیلی زبان استعمال کی ہے، یعنی وہ گھنٹی کی آواز (صلصلة الجرس) جیسی کوئی چیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگوں کی طرف سے حقیقتِ وحی کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا گیا:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝ (بنی اسرائیل۔۸۵)

''وہ تم سے روح (یعنی وحی) کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دو کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔''

وحی کی صورت

علماء کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی تھی اس میں لفظ و معنی دونوں شامل تھے یا محض معنی یعنی مضمون قلبِ پیغمبر پر القا کر دیا جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف معنی القا کیے گئے تھے، ان کو الفاظ و نظم کا جامہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہنایا[1]۔ لیکن سرسید علیہ الرحمہ نے شاہ صاحب کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ وحی لفظ و معنی دونوں کے ساتھ ہوتی تھی، کیونکہ کوئی خیال یا معنی تجریدِ لفظ کے ساتھ ناقابلِ تصور ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

''میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مضمون القا کیا گیا تھا اور الفاظ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں جن سے آنحضرتؐ نے اپنی زبان

---

[1] التفہیمات الالٰہیة، ص ۵۸۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں جو عربی تھی اس مضمون کو بیان کیا ہے۔لیکن اس سلسلے میں حجۃ الاسلام بلکہ حجت اللہ فی الانام شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس پر تعجب اور سخت تعجب ہے ...... یہ قول شاہ صاحب کا عقل اور نفس الامر دونوں کے مخالف ہے۔خود قرآن مجید میں ہے کہ: وانہ لتنزیل رب العلمین ٥ نزل بہ روح الامین ٥ علی قلبک لتکون من المنذرین ٥ بلسان عربی مبین (سورۂ شعراء:۱۹۲۔۱۹۵)۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: انا انزلنا قرانًا عربیًا لعلکم تعقلون (سورۂ یوسف۔۳)۔اس سے ظاہر ہے کہ نزول قرآن قلب آنحضرتؐ پر عربی زبان میں ہوا تھا نہ یہ کہ صرف معنی القا ہوئے تھے اور الفاظ جن سے وہ معنی تعبیر کیے گئے ہیں آنحضرتؐ کے تھے۔

نفس الامر کے اس لیے برخلاف ہے کہ خود تم اپنے نفس پر غور کرو کہ کوئی مضمون دل میں مجرد عن الالفاظ آ ہی نہیں سکتا اور نہ القا ہو سکتا ہے ......اس لیے قرآن مجید بلفظہ آنحضرتؐ کے قلب پر القا ہوا تھا اور وہی الفاظ اور اسی نظم سے جس طرح القا ہوئے آنحضرت نے لوگوں کو پڑھ کر سنایا[1]۔"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن الفاظ و معنی دونوں کے ساتھ قلبِ نبیؐ پر نازل ہوا تھا۔ عقلی دلائل کے علاوہ نصوص سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔اس سلسلے میں سورۃ قیامہ کی درج ذیل آیات قابلِ توجہ ہیں:

لَاتُحَرِّکْ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِہٖ ٥ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ ٥ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ٥ (آیات:۱۶۔۱۸)

---

[1] تفسیر القرآن، (تحریری اصول التفسیر) ج۱،ص۴۰۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"اے پیغمبر، تم اپنی زبان کو وحی کے ساتھ (جب وہ نازل ہو رہی ہو) حرکت نہ دو تاکہ اس کو جلدی سے لے لو (یعنی یاد کرلو)، ہمارے ہی ذمہ ہے اس کو (تمہارے سینہ میں) جمع کرنا (تاکہ وہ محفوظ ہو جائے) اور ترتیب دینا۔ پھر جب ہم (سورہ میں آیات کو) ایک خاص ترتیب دے دیں تو تم (تلاوت میں) اس ترتیب کی پیروی کرو۔"

غور فرمائیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے وقت اپنی زبان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تو اس کی غرض کیا تھی؟ کھلی بات ہے کہ آپ الفاظِ وحی کو جلدی جلدی یاد کرتے تھے تاکہ وہ آپ کے حافظہ سے محو نہ ہو جائیں، معانی کو یاد کرنے کے لیے زبان کو حرکت نہیں دی جاتی ہے اور نہ دی جاسکتی ہے۔ پھر آپ کے سینہ میں وحی کو ایک خاص ترتیب سے جمع کرنا الفاظ کے بغیر کیونکر ممکن ہے۔ پھر اس مرتب چیز کو دہرانا (اتباع) بھی الفاظ کے بغیر محال ہے۔

اس سے واضح ہو گیا کہ قرآن کا نزول لفظ و معنی دونوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ایک مغربی دانش ور ڈاکٹر لوکس نے علامہ اقبال سے سوال کیا کہ کیا ان کا بھی یہ اعتقاد ہے کہ قرآن کے الفاظ خدا کی طرف سے نازل کیے گئے تھے؟ علامہ نے جواب دیا کہ ہاں میں اس پر اعتقاد رکھتا ہوں اور اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا ثبوت تو میں خود ہوں۔ "مجھ پر شعر پورا اترتا ہے تو پیغمبر پر عبارت پوری کیوں نہیں اتری ہوگی۔"[1]

---

[1] روزگارِ فقیر، فقیر سید وحید الدین، اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ج ا، ص ۳۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وحی کی قسمیں

علماء و فقہاء نے وحی کی دو قسمیں قرار دی ہیں، ایک وحیِ متلو اور دوسری وحی غیر متلو[1]۔ وحی کی یہ تقسیم اور اس کے لیے جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں وہ سخت مغالطہ انگیز ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی ان دونوں قسموں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسرے کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان دونوں اقسامِ وحی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''فقہاء نے وحی کی دو قسمیں قرار دی ہیں، وحیِ متلو جو تلاوت کی جاتی ہے، اور وحیِ غیر متلو جو تلاوت نہیں کی جاتی، مثلاً وہ احکام و نصائح جو بہ روایت صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ پہلی وحی کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے ثابت ہے۔ وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے خدا کا کلام ہے، دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے[2]۔''

جب یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لفظ و معنی دونوں کے ساتھ نازل ہوتی تھی تو پھر یہ کہنا کہ وحیِ غیر متلو ''اپنے الفاظ کے لحاظ سے خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے خدا کا ارشاد ہے'' غلط ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اپنے اقوال کو قرآن کی طرح لکھوا کر محفوظ نہیں

---

[1] بعض لوگوں نے اس کو وحیِ قرآن اور وحیِ حدیث کہا ہے لیکن باعتبار مفہوم دونوں اصطلاحوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

[2] سیرت النبی، ج:

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

کرایا بلکہ سختی کے ساتھ صحابہ کو اس کی کتابت سے منع کر دیا تھا۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

لاتکتبوا عنّی غیر القرآن شیئا[1]

"مجھ سے قرآن کے علاوہ کوئی چیز نہ لکھو۔"

آپؐ نے یہ ممانعت اس لیے فرمائی تا کہ وحی (کلام خدا) غیر وحی (کلام رسول) سے مخلوط نہ ہو۔ اور یہ ممانعت ناگزیر تھی۔ وحی ہر دور کے لیے ہے اور حالات اور زمانہ کی تبدیلی کے باوجود نا قابلِ تغیّر ہے۔ لیکن کلام رسول جو دراصل وحی کی عملی تبیین و تشریح ہے، قرآن کی طرح نا قابلِ تغیر نہیں ہے، حالات اور ضرورتوں کی تبدیلی کے ساتھ اس میں بقدرِ ضرورت ترمیم و اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تشریحاتِ رسول کا بڑا حصہ عربی عہد کے تہذیبی حالات اور عربوں کے عادات و رسوم کے مطابق ہے[2]۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ خلافت بالخصوص خلیفۂ دوم کے عہد میں رسول اللہ کے بہت سے فیصلوں کے برعکس فیصلے کیے گئے اور کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔

اس گفتگو سے معلوم ہوا کہ ہمارے علماء و فقہاء نے وحی کی جو تقسیم کی ہے یعنی وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو، وہ غلط اور مغالطہ انگیز ہے۔ قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز پر حقیقی معنی میں وحی کا اطلاق نہیں ہوتا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے علماء کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی آتی تھی۔ راقم کو اس بات سے اتفاق ہے، لیکن قرآن کے علاوہ آپؐ پر جو وحی آتی تھی وہ معروف معنی میں وحی نہیں تھی بلکہ خالص لغوی معنی میں وحی تھی، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم

---

1. ترمذی
2. دیکھیں، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، باب: اسباب نزول الشرائع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی تھی[1]۔ اس کی ایک مثال سورۂ تحریم میں موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک بیوی سے کوئی راز کی بات کہی۔ ان بیوی صاحبہ نے یہ بات ایک دوسری زوجۂ مطہرہ سے کہہ دی، جو ان سے قربت رکھتی تھیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حرکت پر متعلقہ بیوی کو تنبیہ کی تو ان کو سخت تعجب ہوا کہ یہ بات آپؐ کو کیسے معلوم ہو گئی۔ انھوں نے گمان کیا کہ راز میں شریک زوجۂ نبی نے یہ بات بتا دی ہے۔ بہر حال ان بیوی صاحبہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: من انباک ھذا ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟'' نبیؐ نے فرمایا: نبانی العلیم الخبیر (سورۂ تحریم۔۳) ''مجھے یہ بات اس ہستیِ برتر نے بتائی جو علیم و خبیر ہے''۔

اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ ہر دریافت طلب بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فوراً بتا دی جاتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملے میں سخت ذہنی تردّد میں مبتلا رہے لیکن فوراً نہ تو معروف معنی میں وحی آئی اور نہ ہی دل میں کوئی خیال القا کیا گیا۔ اس کی ایک مثال حضرت عائشہؓ پر بہتان کا واقعہ ہے۔ روایتوں میں ہے کہ آپ تقریباً ایک ماہ تک متردّد رہے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ جب باقاعدہ وحی آئی تب معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ پر جھوٹا الزام لگایا گیا تھا۔ (سورۂ نور۔۱۶)

اس طرح کی وقتی وحی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص نہیں تھی بلکہ دوسرے رسولوں کو بھی کارِ رسالت کی انجام دہی میں اس نوع کی مدد بذریعۂ وحی ملی ہے، حتیٰ کہ غیر رسول کی طرف بھی اس قسم کی وحی کی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کو اسی قسم کی وحی کے ذریعہ سے ایک خاص کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (سورۂ قصص۔۷)

---

[1] وحی کی ایک شکل خواب بھی تھے، یعنی کوئی بات آپ کو خواب میں بتا دی جاتی تھی جیسا کہ مسجدِ حرام میں داخل ہونے کے واقعہ کو خواب میں دکھایا گیا تھا (سورۂ فتح۔۲۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہے کہ جب فرعون موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے تعاقب میں روانہ ہوا اور بالکل قریب پہنچ گیا تو حضرت موسیٰ کو وحی کی گئی کہ وہ اپنی لاٹھی سے سمندر پر ضرب لگائیں: فاوحینا الی موسیٰ ان اضرب بعصاک البحر (سورۂ شعراء۔۶۳)۔ کھلی بات ہے کہ یہ وحی الفاظ کے ساتھ نہیں آئی ہوگی بلکہ اس ناگہانی صورت حال سے نبٹنے کی یہ ایک تدبیر تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے دل میں القا کی گئی تھی۔

جہاں تک ان اقوال واعمال کا معاملہ ہے جو حدیث کی کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں تو ان کو حقیقی معنی میں وحی کہنا صحیح نہیں ہے۔ یہ اقوال واعمال دراصل قرآن کے اصولی احکام کی عملی تبیین ہیں، یا عام ہدایات کی ان سے مزید تفصیل ہوتی ہے۔ یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بصیرت نبوی کے مطابق انجام دیا تھا (سورۂ نساء۔۱۰۵)۔

اس تبیین کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ قرآن کا ایک اصولی حکم ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ ''نماز قائم کرو''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصولی حکم کی عملی تبیین فرمائی اور نماز پڑھنے کا طریقہ مقرر فرمایا۔ اسی پر قرآن کے دوسرے اصولی احکام کی تبیین کو قیاس کرلیں۔ قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَر (سورۂ عنکبوت۔۴۵) ''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے''۔ اس آیت کی مزید تفصیل اس روایت سے ہوتی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تمہارا کیا خیال ہے، اگر کسی کے گھر کے سامنے دریا بہہ رہا ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ بار غسل کرے تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل کچیل باقی رہ جائے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول، کوئی میل کچیل باقی نہیں رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہی معاملہ پانچ اوقات کی نمازوں کا ہے۔ اللہ ان کے ذریعہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گناہوں کو مٹا دیتا ہے"[1]

حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔ اگر کوئی قول یا فعل جو آپ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، قرآن کی کسی نص کے خلاف ہو تو وہ لاریب رسول کا قول اور فعل نہیں ہوسکتا ہے۔ علامہ شاطبی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:

"سنت اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے۔ وہ یعنی سنت قرآن حکیم کے مجمل کی تفسیر یا مشکل کا بیان یا مختصر کی تشریح ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول دلیل ہے، وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس مانزل الیھم (ہم نے تمہاری طرف ذکر نازل کیا ہے تاکہ جو ان کی طرف بھیجا گیا ہے اس کو لوگوں پر واضح کردو)۔ پس سنت میں کوئی ایسی بات نہیں ملے گی جس کی اجمالی یا تفصیلی دلالت قرآن حکیم میں موجود نہ ہو...... قرآن میں ہے: وانک لعلیٰ خلق عظیم "تم عظیم خلق کے مالک ہو"۔ حضرت عائشہؓ نے خلق کی وضاحت میں فرمایا کہ رسول کا خلق قرآن مجید ہے۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے تمام اقوال و افعال اور اقرار سب قرآن مجید کی طرف رجوع ہونے والے ہیں کیونکہ خلق کا تعلق ان ہی امور سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو تبیاناً لکلّ شئی (سورہ نحل۔ ۸۹) فرمایا ہے۔ اس سے بھی سنت کا فی الجملہ قرآن میں ہونا لازم آتا ہے...... اگر ایسا نہ ہو تو اس کو قبول کرنے میں توقف ضروری ہے[2]"۔

---

[1] بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ وغیرہم

[2] الموافقات، ج ۴، المسئلۃ الثالثۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام شافعیؒ نے فرمایا ہے: کل ماحکم به رسول الله فهو مما فهمه من القرآن[1]۔ "رسول اللہ نے جو حکم بھی دیا ہے وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے"۔

اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ حقیقی معنی میں وحی کا اطلاق صرف قرآن پر ہو گا جو لفظاً اور معناً دونوں طرح محفوظ ہے۔ ہمارے بہت سے علماء کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے دونوں طرح کی وحی پر ایک ہی حکم لگا دیا۔ نتیجہ کے طور پر وہ خود بھی فتنہ میں پڑے اور مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی مبتلائے فتنہ کیا۔

قرآن کی وجہِ تسمیہ

خدا کی طرف سے جو کتابیں انسانوں کے رشد وہدایت کے لیے مختلف زمانوں میں بھیجی گئیں ان کا کوئی نہ کوئی نام یقیناً رہا ہوگا۔ لیکن آج یہ معلوم کرنا ناممکن ہے کہ وہ نام کیا تھے۔ جن مذہبی کتابوں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں ان میں تورات، زبور اور انجیل ہیں جو بالترتیب حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دی گئی تھیں۔ ان کتابوں کے یہ نام قرآن میں آئے ہیں۔ تورات کے معنی کتاب یعنی شریعت، زبور کے معنی نغمہ اور انجیل کے معنی بشارت کے ہیں۔ یہ نام ان کی معنوی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ تورات میں شرائع کا ذکر ہے، انجیل میں آخری رسول کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اور زبور میں خدا کی حمد پر مشتمل نغمات ہیں۔ حضرت داؤد بڑے خوش الحان تھے۔ جب زبور کی تلاوت کرتے تو ان کے دلی جوش، جذبۂ صادق اور خوش آوازی کی وجہ سے شجر وحجر اور پرندے تک وجد کرنے لگتے تھے۔ (سورۂ سبا-۱۰)

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ، ص۹۳، مزید دیکھیں، تفسیر ابن کثیر (مقدمہ)، ص۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان آسمانی صحائف کی طرح آخری صحیفۂ ہدایت کا بھی نام رکھا گیا اور وہ قرآن ہے۔ بہت سے اہلِ علم کا خیال ہے کہ ابتدا میں اس کتاب کا نام کچھ اور تھا۔ روایت ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے قرآن مجید جمع کرایا تو اس کے نام کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاروں کو انجیل کہا جائے، لیکن اس رائے کو پسند نہیں کیا گیا۔ کسی نے کہا کہ اس کو یہود کے سفر ہائے پنجگانہ کی طرح سفر کہا جائے۔ یہ بات بھی قابلِ قبول نہ ٹھہری۔ آخر کار عبداللہ ابن مسعودؓ نے کہا کہ حبشہ کی مہاجرت کے زمانے میں میں نے ایک کتاب دیکھی جس کا نام مصحف تھا۔ اس خیال کو سب نے پسند کیا اور قرآن مجید کا نام مصحف[1] رکھ دیا گیا[2]۔

---

[1] کتب سماویہ کے لیے قرآن مجید میں جو مشترک لفظ استعمال ہوا ہے وہ 'صحف' ہے جو صحیفہ کی جمع ہے، مثلاً صحفِ ابراھیم و موسیٰ (النجم:۳۶)، صحفِ اولیٰ (طٰہٰ:۱۳۳)، صحف مکرّمہ (عبس:۱۳)، صحف مطھّرہ (سورۂ بیّنہ:۲) اور صحف منشّرہ (مدثر:۵۲)۔ صحیفہ اس چیز کو کہتے ہیں جو پھیلی اور کشادہ ہو۔ اسی لیے صفحہ کو بھی جس پر لکھا جاتا ہے، صحیفہ کہتے ہیں۔ نامہ کو بھی صحیفہ کہا جاتا ہے (سنن ابی داؤد، باب الزکوٰۃ، ومسند ابن حنبل ۴/۱۸۱)۔ مجموعہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ کے مجموعۂ حدیث کو جسے ہمام بن منبہ (متوفی ۱۰۱ھ) نے نقل کیا ہے، صحیفۂ ابوہریرہ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لکھے ہوئے صحائف کے مجموعہ کو جو دو جلدوں میں ہو مصحف کہا جاتا ہے اور اس کی جمع مصاحف ہے۔ لیکن بعض اہل علم کی رائے میں مصحف اور صحیفہ ہم معنی ہیں، یعنی لکھی ہوئی چیزوں کے مجموعہ کو مصحف یا صحیفہ کہا جاتا ہے۔ شعرائے جاہلیت نے اپنے کلام میں اسفارِ نصاریٰ کو مصاحف کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً امرأالقیس کہتا ہے:

اتت حجج بعدی علیه فاصبحت   کخط زبور فی مصاحف رهبان

[2] الاتقان فی علوم القرآن، امام جلال الدین سیوطی، ج۱، ص۱۸۴، وتاریخ الرسل والملوک، طبری، ص۱۹۱۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگرچہ اس روایت کی اسناد منقطع ہیں لیکن اس مضمون کی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع قرآن سے پہلے اس کا کوئی نام نہیں تھا۔ پورا مجموعۂ وحی متفرق سورتوں کی شکل میں تھا اور جب ان کو جمع کیا گیا تو اس کا نام مصحف رکھا گیا[۱]۔ راقم کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ قرآن میں اس امر کے شواہد کثرت سے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا نام شروع سے قرآن تھا۔ اس سلسلہ میں درج ذیل آیات حجتِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہیں:

(۱) شهر رمضان الذی انزل فيه القرآن (سورۂ بقرہ:۱۸۵)

(۲) وعداً عليه حقاً فی التوراة والانجيل والقرآن (توبہ:۱۱۱)

(۳) قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن ياتوا بمثل هذا القرآن لاياتون بمثله (اسرائیل:۸۸)

(۴) افلا يتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالها (سورۂ محمد:۲۴)

(۵) فقالوا انا سمعنا قرآنا عجبا (سورۂ جن:۱)

(۶) فاذا قرأت القرآن فاستعذبالله من الشيطان الرجيم (سورۂ نحل:۹۸)

(۷) يٰسٓ والقرآن الحكيم (سورۂ یٰسٓ:۱،۲)

(۸) فاقرء وا ما تيسر من القرآن (سورۂ مزمل:۲۰)

یہ نام یعنی قرآن، نہ صرف اہلِ ایمان کے درمیان معروف تھا بلکہ کفار مکہ بھی اس کو اسی نام سے جانتے تھے جیسا کہ اس آیت سے بالکل واضح ہے:

---

[۱] تفسیر طبری (جامع البیان)، محمد بن جریر طبری، ج۱، ص۲۰، مزید دیکھیں، بخاری (فضائل القرآن)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ط (سورۂ یونس: ۱۵)

"وہ لوگ جو ہم سے ملاقات کی امید نہیں رکھتے (تم سے) کہتے ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی قرآن لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو"

ان آیات کی موجودگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ گمان کرنا مشکل ہے کہ جمعِ وحی کے وقت اس کے نام کے متعلق صحابہ کے درمیان کوئی اختلاف واقع ہوا تھا۔ مذکورہ روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا نام مصحف محض اس کی سورتوں کی جمع و ترتیب کے اعتبار سے رکھا گیا تھا۔ چنانچہ جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں قرآن کو دوبارہ جمع کیا گیا اور اس کی نقلیں تیار کرا کے ممالکِ مفتوحہ میں بھیجی گئیں تو اس کا نام 'مصاحفِ عثمانی' پڑ گیا۔ اس کے علاوہ جن صحابہ نے ذاتی طور پر اپنی تلاوت کے لیے اس کو لکھا اور اپنے پاس رکھا ان کے نسخوں کا نام بھی ان کے نام کی طرف منسوب ہو کر مصحف کہلایا، مثلاً مصحفِ ابی بن کعب وغیرہ۔

لیکن روایت کرنے والوں نے اس کو اس طرح بیان کیا گویا جمع قرآن سے پہلے اس کا کوئی نام ہی نہ تھا۔ بہر حال اوپر کی گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ آخری صحیفۂ ہدایت کا نام ابتدا سے قرآن تھا اور یہی اس کا اصلی نام ہے۔

مادۂ اشتقاق اور لغوی معنی

جہاں تک قرآن کے مادۂ اشتقاق اور اس کے لغوی معنی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بہت پہلے سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ عبداللہ ابن عباسؓ (م ۶۸ھ) کا ایک قول ہے کہ قرآن 'رجحان' کے وزن پر قرأت (قرء یقرء) سے مصدر ہے، پڑھنے کے معنی میں۔ اور دوسرا قول ہے کہ اسم ہے، یعنی وہ چیز جو پڑھی جائے (ما یقرأ)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قتادہ جو تابعین کے طبقۂ دوم سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا قول ہے کہ قرآن مصدر ہے قرءٌ سے (باب نصر وفتح)، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ عرب جب کسی چیز کو یکجا کرتے اور ایک حصے کو دوسرے حصے کے ساتھ ملا کر اس میں مقداری اضافہ کرتے تو کہتے تھے: قرأت الشیٔ قرآنا ''میں نے اس میں کچھ اضافہ کیا''۔ عمرو بن کلثوم تغلبی (م ۴۰ ق ھ) جو عہد جاہلی کا ایک مشہور شاعر ہے، اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

ذراعَیْ عیطلٍ إدماءَ بکرٍ　　هِجانِ اللّونِ لم تقرأ جنینا

''میرے دونوں بازو خوبصورت اور سفید ہیں، اس جوان اونٹنی کے دست و بازو کی طرح جس نے ابھی تک (اپنے رحم میں) کسی جنین کو جمع نہیں کیا ہے (یعنی اس نے ابھی تک کوئی بچہ جنا نہیں ہے، خوب فربہ ہے)''۔

لیکن اکثر علماء اور مفسرین نے ابن عباسؓ کے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، یعنی قرآن بمعنی قرأت ہے۔ اس سلسلے میں علماءِ لغت اور فقہاء و متکلمین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو مختصراً یہاں لکھا جاتا ہے۔

زجاج (م ۳۱۱ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن مہموز ہے اور 'فعلان' کے وزن پر (مثل غفران) القرء سے مشتق ہے اور اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: قُرِءَ الماءُ فی الحوض ''حوض میں پانی جمع ہو گیا''۔ جوہری (م ۳۹۳ھ) اور اس سے پہلے سفیان بن عینیہ (م ۱۹۸ھ) نے بھی قرآن کے یہی معنی بیان کیے ہیں[1]۔

لحیانی (م ۲۱۵ھ) نے لکھا ہے کہ قرآن مصدر مہموزی ہے، رجحان اور غفران کے وزن پر اور 'قرء' سے مشتق ہے، بمعنی 'تلا' یعنی پڑھنا۔ چوں کہ مفعول کو مصدر

---

[1] البرہان فی علوم القرآن، علامہ بدر الدین زرکشی، ج ۱، ص ۲۷۷، والاتقان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۵۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی کہہ دیتے ہیں، مثلاً مکتوب کو جو لکھا ہوتا ہے کتاب کہا جاتا ہے، اسی طرح 'مقروء' سے قرآن ہو گیا[1]۔

فراء (م ۲۰۷ھ) کا قول ہے کہ قرآن قرائن سے جو قرینہ کی جمع ہے، مشتق ہے، اس لیے کہ ایک پارہ کی آیات دوسرے پارہ کی آیات سے مشابہت رکھتی ہیں۔ اور یہ لفظ دراصل بغیر ہمزہ کے ہے۔ قرطبی (م ۶۷۱ھ) اس قول کے حامی ہیں لیکن زجاج اور ابو علی فارسی (م ۳۷۷ھ) اس قول کے منکر ہیں۔

بعض دوسرے علماء لغت نے بھی اسے بغیر ہمزہ کے مانا ہے لیکن اسے 'قـری' سے مشتق بتایا ہے، بمعنی ضیافت و مہمانی، یعنی قرآن اللہ تعالیٰ کا بچھا ہوا خوانِ نعمت ہے کہ ہر شخص بقدر ظرف و استعداد اس سے بہرہ مند ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: انّ هذا القرآن مائدة فخذوا منه "یہ قرآن ایک بچھا ہوا دسترخوان ہے، اس سے لے لو"[2]

خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے لکھا ہے کہ امام شافعی (م ۲۰۴ھ) اسماعیل بن قسطنطین (معروف بہ قسط) سے قرآن پڑھتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ لفظ قرآن اسم ہے، مہموز نہیں، یعنی یہ قرأت سے مشتق نہیں ہے۔ اگر قرأت سے مشتق ہوتا تو جو کچھ پڑھا جا چکا ہوتا وہی قرآن کہلاتا۔ امام بیہقی (م ۴۵۸ھ) نے بھی لکھا ہے کہ امام شافعی قرآن کو اسمِ غیر مہموز قرار دیتے تھے، یعنی یہ کسی لفظ سے مشتق نہیں بلکہ کلام الٰہی کا ایک خاص نام ہے۔ علامہ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اور امام جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) اسی خیال کو درست سمجھتے تھے[3]۔

---

[1] تفسیر طبری، ج۱، ص ۳۲

[2] سنن دارمی (فضائل القرآن)، ص۱

[3] تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، ج۲، ص ۶۲، البرہان فی علوم القرآن، ج۱، ص ۲۷۸، الاتقان فی علوم القرآن، ج۱، ص ۵۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امام اشعری (م ۳۲۴ھ) اور ان کے متبعین کا کہنا ہے کہ لفظ قرآن 'قـرن' سے مشتق ہے۔ عرب جب کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ جوڑتے تھے یعنی ضمیمہ کرتے تھے تو کہتے تھے: قرنت الشئ بالشئ ۔اس لحاظ سے سورتوں اور ان کی آیات کی جمع وتالیف کو بھی قرآن کہتے ہیں، بالفاظ دیگر جب آیاتِ قرآن کو ایک دوسرے کے ساتھ مقرون کرتے ہیں تو اس کے مجموعہ یا اس کے اجزاء کو قرآن کہتے ہیں[1]۔ اس میں نون لفظ کے اصلی حروف کا جزء ہوگا اور ہمزہ ممدودہ زائدہ۔ اس صورت میں قرآن کا تلفظ بغیر ہمزہ کے کیا جائے گا[2]۔

قرآن میں اس لفظ کے استعمالات

قرآن کی مختلف سورتوں میں یہ نام یعنی قرآن نحوی اعتبار سے ۶۸ مرتبہ آیا ہے، پچاس بار بصورت معرفہ یعنی الف لام تعریف کے ساتھ اور سولہ بار بغیر تعریف کے۔ ان مقامات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مادہ 'قـرء' ہے جس کے اصل معنی تو جمع کرنے کے ہیں لیکن ثانوی معنی پڑھنے کے ہیں۔ پڑھنے کا عمل دراصل حروف وکلمات اور جملوں کو جمع کرنے کا عمل ہے۔ ان کو ایک دوسرے سے ملائے بغیر پڑھا نہیں جاسکتا ہے۔ اسی ثانوی معنی میں فرمایا گیا ہے: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوکِ الشَّمسِ الٰی غَسَقِ الَّیلِ وقُراٰنَ الفَجرِ ؕ اِنَّ قُراٰنَ الفَجرِ کَانَ مَشھُودًا (بنی اسرائیل: ۷۸) "نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے لے کر شب کے تاریک ہونے تک اور

---

[1] قران، مقارنت اور وصل کے معنی میں ہے۔ جس وقت دو ستارے ایک برج میں جمع ہو جاتے ہیں تو اس اجتماع کو علم نجوم کی اصطلاح میں قران کہا جاتا ہے۔ فقہ میں حج وعمرہ کو ایک ساتھ جمع کرنے کو حجِ قران کہتے ہیں۔ اسی طرح نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد کسی دوسرے سورہ کے ملانے کو بھی قران کہا جاتا ہے۔

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں، تاریخ قرآن، ڈاکٹر محمود رامیار، ص ۹ تا ۲۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خاص کر فجر کی قرأت کا (اہتمام کرو)، بے شک فجر کی قرأت میں (دل و دماغ کی) حضوری ہوتی ہے"۔ اسی معنی میں حسان بن ثابتؓ کی طرف یہ شعر منسوب ہے:

ضحّوا باشمط عنوان السجود بہ　　یقطّع اللیل تسبیحا و قرآنا

اس شعر میں واضح طور پر قرآن کو پڑھنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن 'قرء' کے اصلی معنی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، جمع و تالیف کے ہیں۔ متعدد علماءِ لغت ونحو کے اقوال سے جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اس بارے میں قرآن کی ایک آیت بڑی اہمیت رکھتی ہے جس میں جمع و قرآن کے الفاظ ایک ساتھ استعمال کیے گئے ہیں، فرمایا ہے:

لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ
وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ○ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ○

(سورۂ قیامہ: ۱۶-۱۹)

عام طور پر علماء و مفسرین نے اس آیت کے فقرہ "جمعہ" میں جمع سے ایک سورہ میں آیتوں کو جمع کرنا مراد لیا ہے[۱]، لیکن راقم کو اس سے اختلاف ہے۔ اس آیت کا پہلا فقرہ "لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ" بتاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نزولِ وحی کے وقت اپنی زبان کو اس لیے جلدی جلدی گردش دیتے تھے تاکہ اسے یاد کر لیں، مبادا حافظہ سے محو ہو جائے۔ اس عمل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دیا گیا اور فرمایا گیا کہ انھیں کلماتِ وحی کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں، اس وحی کو ان کے سینے میں جمع کر دینا ہماری ذمہ داری ہے، پھر وہ اس کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ چنانچہ ایک دوسری جگہ

۱۔ شاہ صاحب نے لکھا ہے: ان علینا جمعہ آن ست کہ لازم است وعدہ جمع کردن قرآن برما در مصاحف، "ان علینا جمعہ کے معنی یہ ہیں کہ مصاحف میں قرآن کو جمع کرنے کا وعدہ ہم پر لازم ہے"۔ (ازالۃ الخفاء، ج ۱، ص ۳۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرمایا گیا ہے: سنقرئک فلا تنسیٰ ۝ الا ما شآء اللہ (سورۂ اعلیٰ: ۶)

اسی طرح اکثر علماء نے 'قرانہ' میں قرآن کو پڑھنے کے معنی میں لیا ہے، جس کی وجہ غالباً سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ ہے جس میں یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی یہی معنی لکھے ہیں: [۱]

وقرانہ یعنی توفیق دہیم قرآء امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را وعوام ایشان را بر تلاوت آن تا سلسلۂ تواتر از ہم گسستہ نشود، خدائے تعالیٰ می فرماید کہ در فکر مباش کہ قرآن از دل تو فراموش شود و مشقت تکرار آن مکش [۲]

''اور 'قرانہ' کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی امت کے قاریوں اور عام لوگوں کو اس کی تلاوت کی توفیق عطا کریں گے تاکہ سلسلۂ تواتر ٹوٹنے نہ پائے۔ اور خدائے تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس کی ذرا بھی فکر نہ کرو کہ قرآن تمہارے دل سے فراموش ہو جائے گا۔ اس لیے اس کی تکرار کی مشقت نہ اٹھاؤ''

'قرانہ' کی یہ تشریح محلِ نظر ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کی آیات مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کی گئی تھیں۔ ان متفرق آیات کو ایک سلسلۂ نظم میں پرونا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اسی مسئلہ کے حل کے لیے ''قرانہ'' کا فقرہ

۱۔ ازالۃ الخفاء، ج ۱، ص ۳۹

۲۔ اس اقتباس کے آخری دو جملوں کا تعلق دراصل ''ان علینا جمعہ'' سے ہے جسے شاہ صاحب نے ''قرانہ'' سے جوڑ دیا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ متفرق آیات کو ایک سورہ میں ایک خاص نظم و ترتیب سے اکٹھا کر دینا کہ کہیں سے کوئی ادنیٰ معنوی خلل واقع نہ ہو، خدا کی ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ثم اِنّ علینا بیانہ ''پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت''، یعنی صرف متن کی حفاظت ہی اللہ کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کے معنی کی وضاحت و تفصیل کر کے اس کو معنوی تحریف سے محفوظ رکھنا بھی اس کی ذمہ داری میں داخل تھا۔ الحمد للہ، یہ تینوں وعدے اس طرح پورے ہوئے کہ آج دنیا اس کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہے۔

تاریخ کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام اُمتیوں کی طرح قرآن مجید کو حفظ کرنے کی مشقت نہیں اٹھائی۔ ادھر جبرئیلؑ نے وحی سنائی اور ادھر وہ لوحِ حافظہ پر نقش کالحجر ہوگئی۔ پھر جبرئیل علیہ السلام کی ہدایت کے مطابق متفرق آیات کو سورتوں کے اندر اس درجہ منظم صورت میں رکھا گیا کہ کہیں سے کوئی معنوی بے ربطی پیدا نہیں ہوئی۔

تیسرا وعدہ یعنی 'ان علینا بیانہ' اس طرح پورا ہوا کہ آج قرآن دنیا کی واحد مذہبی کتاب ہے جو اپنے متن کی خود شارح ہے۔ اس میں دین کے اساسی موضوعات سے متعلق مجمل آیات کی تفصیل اور مشکل مضامین کی توضیح اور تشریح طلب الفاظ کی معنوی شرح کا عجیب وغریب اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن متن اور شرح کے اختلاط کے باوجود نظم کلام میں کہیں بھی کسی نوع کا انتشار پیدا نہیں ہوا ہے اور یہ بلاشبہ قرآن کا اعجاز بلکہ بہت بڑا اعجاز ہے۔

'جمعہ وقرآنہ' کی اس معنوی وضاحت کے مطابق سورۂ قیامہ کی زیر بحث آیات کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ ''اے نبی تم وحی کو یاد کرنے کی غرض سے اپنی زبان کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جلدی جلدی گردش نہ دو، اس کو جمع کرنا (یعنی تمہارے سینے میں اس کو جمع کرنا، یاد کرا دینا) اور اس کی ترتیب و تالیف (یعنی متفرق آیات کو ایک سورہ کے اندر حکیمانہ طور پر مرتب کر دینا) ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اس کو ایک ترتیب سے اکٹھا کر دیں تو تم اس جمع و ترتیب کی پیروی کرو، (یعنی اسی کے مطابق اس کی تلاوت کرو اور مومنین بھی اس کی تلاوت کریں اور اس کو حفظ کریں)، اور ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی تفصیل و وضاحت''۔

قرآن کے مادۂ اشتقاق کی مذکورہ بالا تفصیلی بحث کی روشنی میں ہم اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آخری صحیفۂ ہدایت کا نام قرآن اس لیے رکھا گیا کہ اس کے اندر حروف و کلمات، آیات اور سورتیں ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ جمع ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ آسمانی صحیفوں کے اندر جو خدائی احکام اور حقائق و معارف پراگندہ یا محرّف حالت میں تھے یا جن کو ان کے حاملین نے بھلا دیا تھا ان سب کو اس آخری مجموعۂ ہدایت کے اندر محفوظ کر دیا گیا ہے (مائدہ۔۴۸)۔اس کے علاوہ آیندہ نسل انسانی کو جو ضروری ہدایات درکار تھیں وہ بھی اس میں فراہم کر دی گئی ہیں۔

اس پہلو سے دیکھیں تو اس کتاب کا نام ہی اس کے اعجاز کی دلیل ہے۔ آیات کا مختلف اوقات میں نجماً نجماً نازل ہونا اور پھر ان کو ترتیب نزولی کا لحاظ کیے بغیر ایک سورہ کے اندر اس طرح رکھ دینا کہ ہر آیت دوسری آیت سے گہری معنوی مناسبت رکھتی ہو، کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ تمام مذہبی صحیفوں کی بنیادی تعلیمات کو پوری صحت کے ساتھ اس کے اندر محفوظ کرنا بھی انسانی قدرت سے خارج ہے۔ اور ایک اُمی انسان سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن کے اسمائے صفات

آخری صحیفۂ ہدایت کا اصلی نام تو قرآن ہے جیسا کہ اوپر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا، لیکن اس کے کئی صفاتی نام بھی ہیں جو خود اس کتاب میں مذکور ہیں۔ ان ناموں سے قرآن کے بعض بنیادی اوصاف وخصائص کا اجمالی علم حاصل ہوتا ہے۔ اہم اسمائے صفات کو یہاں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

الکتاب

کتاب کا لفظ مصدر ہے بمعنی مکتوب، یعنی اس کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جو لکھی ہوئی، مرتب اور مکمل حالت میں ہو۔ اگر صرف لکھی ہوئی ہے لیکن نظم وترتیب سے خالی ہے تو اس پر کتاب کا اطلاق نہ ہوگا۔ اسی طرح اگر لکھی ہوئی ہے لیکن اپنے تمام اجزائے مطلوبہ کے اعتبار سے مکمل نہیں ہے تو بھی اس کو کتاب نہیں کہا جا سکتا ہے۔

مذکورہ معنی میں قرآن کے لیے 'الکتاب' کا لفظ بکثرت آیات میں استعمال ہوا ہے مثلاً:

(۱) ھو الّذی انزل علیک الکتاب منہ ایات محکمات (سورۂ آل عمران:۷)

(۲) الٓر تلک ایٰت الکتٰب الحکیم (سورۂ یونس:۱)

(۳) الٓر کتٰب، انزلناہ الیک (ابراہیم:۱)

(۴) الٓر تلک آیٰت الکتاب وقرآن مبین (حجر:۱)

(۵) حٰمٓ ٥ والکتاب المبین ٥ انّا جعلناہ قرانا عربیا (زخرف:۱،۲)

(۶) حٰمٓ ٥ تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم (جاثیہ:۱،۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری آسمانی کتابوں بالخصوص تورات کے لیے بھی ُالکتابُ کا لفظ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) ولقد اتینا موسیٰ الکتاب وقفّینا من بعدہ بالرسل (سورۂ بقرہ:۸۷)

(۲) والّذین اتینٰھم الکتاب یعلمون انہ منزل من ربک بالحق (انعام:۱۱۴)

(۳) ثم اتینا موسیٰ الکتاب تماماً علی الّذی احسن وتفصیلا لکل شی (انعام:۱۵۴)

(۴) قُل مَن انزَلَ الکتاب الّذی جاء بہ موسیٰ نوراً وھدیً للنّاس (انعام:۹۱)

(۵) واذ علّمتک الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل (مائدہ:۱۱۰)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہود تورات کے ابتدائی پانچ صحیفوں میں سے ہر ایک کو سفر کہتے تھے، جس کے معنی کتاب کے ہیں۔ تورات کا موجودہ نام بائبل ہے۔ اس کے معنی بھی یونانی زبان میں کتاب ہی کے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ کتاب مذہبی صحیفوں کے لیے عام طور پر مستعمل رہا ہے۔ خود لفظ صحیفہ یا صحف جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، مذہبی کتابوں کے لیے استعمال ہوا ہے، مثلاً صحف ابراھیم و موسیٰ (سورۂ اعلیٰ:۱۹)۔ قرآن مجید کو ُالکتاب' اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ مرتب حالت میں لکھا ہوا تھا۔ کتاب کا لفظ قرآن میں دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے اور ان کا ذکر ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ کہاں یہ لفظ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہاں بطورِ اسم صفت۔ لغوی اعتبار سے یہ چار معنوں میں استعمال ہوا ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) خط اور پیغام: انّی اُلقی الیّ کتاب کریم (سورۂ نمل: ۲۹)

(۲) اللہ کا وہ رجسٹر جس میں ہر چیز لکھی ہوئی اور محفوظ ہے: وعندنا کتاب حفیظ (سورۂ ق: ۴)

(۳) نوشتۂ تقدیر: لولا کتاب من اللّٰہ سبق لمسّکم فیما اخذتم عذاب عظیم (انفال: ۶۸)

(۴) قانون وشریعت: ولا تعزموا عقدة النکاح حتی یبلغ الکتاب اجلہٗ (بقرہ: ۲۳۵)

اس آخری معنی میں کتاب کا لفظ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں کوئی نہ کوئی قرینہ ایسا ضرور ہے جس سے اس معنی کی طرف رہبری ہوتی ہے، مثلاً: وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ (بقرہ: ۲۱۳) "اور اس نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی حق کے ساتھ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کردے جس میں ان کا اختلاف ہے۔" دوسری جگہ ہے: انّا انزلنا الیک الکتاب بالحقّ لتحکم بینِ الناس (نسآء: ۱۰۵)۔ ان دونوں آیتوں میں "لیحکم بین الناس" اور "لتحکم بین الناس" کے جملے بتاتے ہیں کہ یہاں کتاب کا لفظ شریعت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح فرمایا گیا ہے: وما انزل علیکم من الکتاب والحکمة یعظکم بہٖ (بقرہ: ۲۳۱)، دوسری جگہ ہے: اولٰئک الّذین اتینٰھم الکتاب والحکم والنبوة (انعام: ۸۹)، ایک اور جگہ ہے: واذ علّمتک الکتاب والحکمة والتوراة والانجیل (مائدہ: ۱۱۰)۔ ان آیات میں سے پہلی آیت میں 'یعظکم بہ' اور دوسری آیت میں 'حکم' اور تیسری آیت میں 'توراة اور انجیل' وہ قرینے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں کتاب کا لفظ شریعت کے معنی میں آیا ہے۔ تورات کے متعلق تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہے کہ وہ تمام تر احکام و قوانین کا مجموعہ ہے۔ قرآن میں بعض جگہوں پر کتاب کے ساتھ آیات کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس سے کتاب کے اس معنی کی وضاحت ہوتی ہے، مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے: یتلوا علیھم ایٰتہ ویزکّیھم ویعلّمھم الکتاب والحکمۃ (ال عمران: ۱۶۴) ''ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔'' اس آیت میں دوسرا جملہ 'یعلّمھم الکتاب والحکمۃ' دراصل پہلے جملے 'یتلوا علیم ایٰتہ ویزکّیھم' کی تشریح کرتا ہے۔ تلاوتِ آیات[1] کا تعلق کتاب سے اور تزکیہ کا تعلق حکمت سے ہے۔

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر کتاب اور حکمت کے الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں میں گہرا تعلق ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: واذکروا نعمۃ اللّٰہ علیکم وماانزل علیکم من الکتٰب والحکمۃ یعظکم بہ (سورۂ بقرہ: ۲۳۱) ''اللہ نے تم پر جو فضل واحسان کیا ہے اس کو یاد رکھو اور اس کتاب وحکمت کو بھی جو اس نے تمہاری نصیحت کے لیے اتاری ہے۔'' اس آیت سے پہلی بات یہ معلوم ہوئی کہ کتاب کی طرح حکمت بھی نازل کی گئی ہے، یعنی اس کا تعلق وحی سے ہے اور وہ بھی کتاب کی طرح محفوظ ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں۔ حدیثیں معروف معنی میں نازل نہیں ہوئی ہیں۔ حدیث میں بھی بلاشبہ حکمت کی باتیں ہیں لیکن وہ قرآن کی طرح نازل نہیں کی گئی ہیں۔

---

[1] قرآن میں آیات کا لفظ احکام کے معنی میں بکثرت آیا ہے، مثلاً سورۂ نور کا آغاز ہی اس جملہ سے ہوتا ہے: سورۃ انزلناھا وفرضنھا وانزلنا فیھا آیٰت بیّنٰت۔ اور یہ معلوم ہے کہ اس سورہ میں معاشرتی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ اکثر جگہوں پر احکام کے ذکر کے بعد یہ جملہ ضرور آتا ہے: کذٰلک یبیّن اللّٰہ لکم الاٰیٰت واللہ علیم حکیم (سورۂ نور: ۵۸)۔ سورۂ بقرہ میں عائلی زندگی کے متعلق احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہوا ہے: کذٰلک یبیّن اللّٰہ لکم اٰیٰتہ لعلکم تعقلون (آیت: ۲۴۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حکمت کتاب ہی کا ایک لازمی جز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'یعظکم بہ' میں ضمیر مجرور واحد ہے جو کتاب کی طرف راجع ہے۔

اس حکمت سے مراد اخلاقی ہدایات وقوانین ہیں۔ اس بات کو دوسری آیات میں واضح کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے: یعلّمه الکتٰب والحکمة والتوراة والانجیل (ال عمران: ۴۸) ''اس کو کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل کی تعلیم دے گا۔'' آیت میں ''والتوراة والانجیل'' کے الفاظ دراصل کتاب اور حکمت کی وضاحت کے لیے لائے گئے ہیں۔ معلوم ہے کہ تورات میں زیادہ تر احکام وشرائع اور انجیل میں اخلاقی قوانین اور دوسری حکیمانہ باتوں کا ذکر ہوا ہے۔ سورۂ لقمان میں حکمت کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں کا بیان ہے۔ فرمایا ہے: ولقد اتینا لقمان الحکمة ان اشکر لِلّٰه (سورۂ لقمان: ۱۲) ''ہم نے لقمان کو دانائی دی (اور اس کو ہدایت کی کہ) تم اللہ کا شکر ادا کرو۔'' اس کے بعد جن تعلیمات کا ذکر ہوا ہے ان میں حکمت کا اصطلاحی مفہوم نمایاں ہے، یعنی اخلاقی تعلیمات (آیات: ۱۳-۱۹)۔

اس پہلو سے کتاب اور حکمت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کتاب یعنی شریعت نفس کے منفی داعیات کو حدود سے متجاوز ہونے سے روکتی ہے، لیکن اس سے نفس کا تزکیہ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق کتاب کے دوسرے جز حکمت سے ہے، یعنی اخلاقی احکام وتعلیمات۔

فرقان

قرآن کو ایک سے زیادہ آیات میں فرقان کہا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ ہے:

تَبارَکَ الّذی نَزّلَ الفرقان علیٰ عبده لیکون للعٰلمین نذیرا (سورۂ فرقان: ۱)

''بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ سارے جہاں کے لیے ڈرانے والا ہو۔'' بعض آیات میں تورات اور انجیل کو بھی فرقان کہا گیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے: واذ اٰتینا موسیٰ الکتاب والفرقان لعلّکم تہتدون (سورۂ بقرہ:۵۳) ''اور یاد کرو اس بات کو کہ ہم نے موسیٰ کو کتاب دی یعنی فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی)، تاکہ تم سیدھی راہ پالو۔'' دوسری جگہ فرمایا ہے: وانزل التوراۃ والانجیل مِن قبلُ ھدیً للنّاس وانزل الفرقان (اٰل عمران:۴) ''اور اسی نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کی یعنی فرقان اتارا۔''

فرقان، فرق سے مشتق ہے اور اس کی مثال ''خسر سے خسران'' ہے۔ یہ اسم فاعل کے بجائے بر سبیلِ مبالغہ مصدر ہے، جیسے کہتے ہیں: رجل عدل ''بہت زیادہ عادل آدمی''۔ اس لحاظ سے فرقان کے معنی ہوں گے، بہت زیادہ فرق کرنے والا، یعنی دو چیزوں کے درمیان فرق کر کے ان کو جدا کر دینے والا۔ اس فرق سے علماء تفسیر نے حق و باطل میں فرق کرنا مراد لیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی نجات، نصرت اور مخرج کے بھی لکھے ہیں۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ عبرانی لفظ 'پُرقان' یا سریانی لفظ 'پُرقانہ' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی نجات کے ہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ لفظی مشابہت کے باوجود یہ لفظ معرب نہیں بلکہ اصیل عربی ہے۔

قرآن میں یہ لفظ لغوی معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے: یا ایّھا الذین اٰمنوا اِنْ تتقوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لکم فُرقانا (انفال:۲۹) ''اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی نافرمانی سے بچو گے تو وہ تم کو فرقان عطا کرے گا''۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے: وما انزلنا علٰی عبدنا یومَ الفرقان یومَ التقی الجمعانِ (آیت:۴۱) ''ہم نے اپنے بندے پر جو چیز نازل کی فرقان کے دن، جس دن دونوں فوجیں مقابل ہوئی تھیں۔'' بعض اہلِ علم نے اوّل الذکر آیت میں فرقان کے معنی مخرج کے لکھے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن راقم کے نزدیک یہ اس نورِ بصیرت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو تقویٰ کے نتیجہ میں بندۂ مومن کے اندر پیدا ہوتا ہے، جس سے وہ حق و باطل اور خیر و شر میں بآسانی امتیاز کر لیتا ہے۔ دوسری آیت میں بھی اس کے لغوی معنی مراد ہیں۔ یہ آیت جنگ بدر سے متعلق ہے اور اسی کو یومِ فرقان کہا گیا ہے۔ اہلِ ایمان اور کفار مکہ کے درمیان لڑی جانے والی اس پہلی لڑائی نے بالکل واضح کر دیا کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن کے لیے بطور صفت تین لفظ استعمال ہوئے ہیں، ھدی، بیّنات من الھدی اور فرقان۔ فرمایا گیا ہے: شھرُ رمضانَ الّذی اُنزل فیه القراٰن ھُدیً للنّاس وبیّناتٍ من الھدیٰ والفرقان (بقرہ:۱۸۵) ''رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور روشن دلائلِ حق اور فرقان بھی۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کتاب ہدایت ہونے کے ساتھ ہی اپنے اندر اس ہدایت کے برحق ہونے کے روشن دلائل رکھتا ہے، اور یہ حق و باطل کی کسوٹی بھی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کتاب صرف یہی نہیں بتاتی کہ فلاں راہ حق کی راہ ہے اور فلاں راہ ضلالت کی طرف لے جانے والی ہے بلکہ ان دونوں راہوں کو اس طرح نمایاں کر کے دکھا دیتی ہے کہ ہر وہ شخص جو عقلِ سلیم اور قلبِ منیب رکھتا ہو ان میں بآسانی فرق و امتیاز کر لے گا۔

میزان

قرآن مجید کا ایک صفاتی نام میزان بھی ہے، یعنی میزانِ حق و باطل، فرمایا گیا ہے: لقد ارسلنا رُسُلَنا بالبیّنات وانزلنا معھم الکتٰبَ والمیزانَ لیقومَ النّاسُ بالقسط (سورۃ حدید:۲۵) ''ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی نازل کیں تا کہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔'' گویا قرآن وہ کسوٹی ہے جس کی مدد سے کھرا کھوٹا معلوم ہو جاتا ہے یعنی کون سی بات حق ہے اور کون سی باطل۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

برہان ونور

قرآن کو برہان اور نور بھی کہا گیا ہے: یا ایّھا الناس قد جاء کم برھانٌ من ربّکم وانزلنا الیکم نوراً مبینا (النسآء:۱۷۴) ''اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے برہان آ گیا اور ہم نے تمہارے پاس نور مبین بھیج دیا ہے۔'' برہان کے لغوی معنی دلیل کے ہیں۔ یہ اصطلاحاً معجزہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے: فذٰنک برھانان من ربک الی فرعون وملائِہٖ ط (سورۂ قصص:۳۲) ''یہ دونوں دلائل (یعنی معجزے) تمہارے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کے لیے ہیں۔'' قرآن کے لیے برہان کا لفظ استعمال کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب مکمل طور پر دلیلِ حق ہے، یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو اس کے کتاب الٰہی ہونے کی واضح شہادت دیتا ہے، یہ ایک نور مبین ہے جس کی مدد سے حق کا جویا راہ ہدایت کو بآسانی دیکھ لیتا ہے۔ اس کو حق وباطل میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا۔ اس کو ہر چیز دن کے اجالے کی طرح صاف اور روشن نظر آتی ہے۔

ذکر

قرآن کا ایک نام ذکر بھی ہے یعنی نصیحت، جیسا کہ درج ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے:

(۱) او عجبتم ان جاء کم ذکر من ربّکم علیٰ رجل منکم لنتذرکم ط (اعراف:۶۹)

(۲) وما تسئلھم علیه من اجر ط ان ھو الا ذکر للعٰلمین (یوسف:۱۰۴)

(۳) انّا نحن نزّلنا الذکر وانّا له لحافظون (حجر:۹)

(۴) وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للنّاس ما نُزّل الیھم (نحل:۴۴)

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

(۵) وھذا ذکرٌ مبارکٌ انزلناہ ط افانتم لہ منکرون (انبیآء:۵۰)

(۶) اِن ھو الا ذکر وقران مبین[1] (سورہ یٰسٓ:۶۹)

قرآن کے لیے 'ذکریٰ' اور 'تذکرۃ' کے الفاظ بھی استعمال کیے گئے ہیں:

(۱) قل لا اسئلکم علیہ اجراً ط ان ھو الا ذکریٰ للعٰلمین (انعام:۹۱)

(۲) اَنّٰی لھم الذکریٰ وقدجاء ھم رسول مبین (دخان:۱۳)

(۳) ما انزلنا علیک القرآن لتشقیٰ o الّا تذکرۃ لمن یخشیٰ (طٰہٰ:۲،۳)

(۴) انّ ھٰذہ تذکرۃ ج فمن شآء اتخذ الی ربہ سبیلا (مزمل:۱۹)

مذکورہ تینوں صفاتی اسماء پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ خدا کا کلام ہے اس لیے یہ لازماً اس کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ جو شخص خدا سے محبت رکھتا ہے وہ لازماً اس کے کلام سے بھی محبت کرے گا اور اس کی یاد سے اپنے دل ودماغ کو منوّر رکھے گا۔ اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس میں اللہ نے بندوں کو بہت سے اوامر ونواہی دیے ہیں اور یہ اس کی فطرت میں بھی اجمالاً ودیعت کردیے گئے ہیں: فالھمھا فجورھا وتقوٰھا o قد افلح من زکّٰھا o وقد خاب من دسّٰھا (سورۂ شمس:۸-۱۰) ''اس کے نفس میں فجور اور تقویٰ دونوں اس نے الہام کردیے ہیں، پس جس نے اس کا تزکیہ کیا وہ بامراد ہوا اور جس نے اسے دبادیا (یعنی غیر مزکّی حالت میں چھوڑ دیا) وہ نامراد ہوا۔''

قرآن انسانوں کو ان کی فطرت کے ان ہی دونوں پہلوؤں یعنی خیر وشر کی طرف متوجہ کرتا ہے اور برابر یاددہانی کرتا رہتا ہے کہ دیکھو یہ فجور کی راہ ہے، تباہی کے کھڈ کی طرف لے جانے والی راہ، اور یہ تقویٰ کی راہ ہے جو کامیابی کی منزل تک

---

[1] مزید دیکھیں، سورۂ صٓ:۸۷، سورۂ القلم:۵۲، سورۂ تکویر:۲۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پہنچائے گی۔ گویا اس کی حیثیت ایک سچے منادی کی ہے۔

سورتوں کی غیر نزولی ترتیب

قرآن میں سورتوں کی موجودہ ترتیب زمانۂ نزول کے مطابق نہیں ہے۔ جو سورتیں پہلے نازل ہوئی تھیں وہ مؤخر ہو گئیں اور بعد میں نازل ہونے والی سورتیں مقدم ہو گئیں۔ آخر اس تقدیم و تاخیر کی علت کیا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جان لیں کہ قرآن کے اجزائے ترکیبی کو سورہ کے نام سے کیوں موسوم کیا گیا؟ سورہ کے معنی فصیل کے ہیں۔ جس طرح فصیل شہر کی حد بندی کر کے اس کو نمایاں کرتی ہے اور دشمنوں سے اس کی حفاظت کا ایک مضبوط ذریعہ بنتی ہے، اسی طرح ایک سورہ بھی آیتوں کی ایک معیّنہ مقدار کو اس کے آگے اور پیچھے کی آیات سے جدا اور ممتاز کرتی ہے اور شیطان کی وسوسہ انگیزی سے اہلِ ایمان کی حفاظت کرتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیات کا یہ مجموعہ اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے مکمل ہے۔ اسی لیے کسی ایسے مجموعۂ آیات کو سورہ نہیں کہا جاتا ہے جس میں بات ناتمام اور ادھوری ہو۔ دیکھیں، ایک بہت چھوٹی سورہ کا نام 'کوثر' ہے حالاں کہ اس میں کل تین آیتیں ہیں۔ اس کو سورہ کا درجہ اس لیے حاصل ہوا کہ اس کا مضمون ہر پہلو سے مکمل ہے۔

سورہ کے معنی و مفہوم کی وضاحت کے بعد اب میں اس مسئلے کی طرف آتا ہوں کہ قرآن میں سورتوں کو ان کی نزولی ترتیب کے لحاظ سے کیوں نہیں رکھا گیا ہے؟ علماء نے اس کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں لیکن ان میں سے ایک توجیہ بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ اس سلسلے میں خدا کی توفیق سے میں نے جو بات سمجھی ہے وہ لکھتا ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن کے اوّلین مخاطب اہلِ عرب تھے۔ یہ لوگ دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر دینِ شرک پر چل رہے تھے، اگر چہ وہ آسمانوں اور زمین کا اور خود اپنا خالق اللہ ہی کو مانتے تھے (سورۂ زمر:۳۸، سورۂ زخرف:۸۷)، بلکہ رازق بھی اسی کو خیال کرتے تھے (سورۂ یونس:۳۱)۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ کائنات کے نظم وانصرام میں کچھ مخلوق ہستیاں بھی شریک ہیں، جن میں فرشتے اور ان کے وفات یافتہ نیک لوگ شامل تھے (سورۂ اعراف:۱۹۴)۔ ان مخلوق ہستیوں کو وہ اپنا رب قرار دیتے تھے اور ان کو خدا کے دربار میں اپنا شفیع سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے (سورۂ یونس:۱۸)۔

یہ لوگ آخرت کی زندگی کے بھی منکر تھے۔ وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور ان کے اعمال کا محاسبہ ہوگا اور جزا وسزا کے فیصلے کیے جائیں گے (سورہ مومنون:۳۵)۔ ان کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

اموت ثم بعث ثم نشر

حديث خرافة يا ام عمرو

"مرنا، پھر دوبارہ زندہ ہونا اور پھر چلت پھرت؟

اے امّ عمرو، یہ بکواس ہے، بالکل لغو بات ہے۔"

کفارِ عرب کے ان باطل خیالات کی اصلاح کے لیے جب خدا کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے تو انھوں نے ان کو رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی بشر خدا کا رسول نہیں ہوسکتا ہے (سورۂ یٰسٓ :۱۵)۔

مخاطبینِ قرآن کی اس ذہنی حالت اور ان کے کفر وشرک کی شدت کے پیش نظر نہایت ضروری تھا کہ رسول کی دعوت کا رخ ان اُمور کی اصلاح کی طرف ہو جن کے وہ منکر تھے، یعنی توحید، رسالت اور معاد۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۹۰ سورتوں میں زیادہ تر توحید، رسالت اور آخرت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف مدنی سورتوں میں جن کی تعداد ۲۴ ہے، احکام و شرائع کا بیان زیادہ ہے۔ان سورتوں میں اہلِ کتاب کے انحرافی رویّوں کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد کے مضامین بھی اختصار کے ساتھ جا بہ جا بیان کیے گئے ہیں تا کہ دین کی اصل اور اس کے مرکز سے توجہ نہ ہٹے۔

اس دعوت حق کے نتیجہ میں بالعموم اور فتح مکہ کے بعد بالخصوص اہلِ عرب کی غالب تعداد مسلمان ہوگئی اور جو لوگ پہلے دین اسلام کے بدترین مخالف تھے وہ اس کے جاں فروش حامی بن گئے۔ حالات کی اس تبدیلی کا تقاضا تھا کہ اب اہلِ عرب کو خدا کی شریعت کی تعلیم دی جائے اور ان کے معاشرہ کو اسلامی احکام کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ انھیں تفصیل سے اہلِ کتاب کے عقاید واعمال اور خدا کی شریعت سے ان کی روگردانی سے آگاہ کیا جائے اور ان تمام مقامات کی واضح طور پر نشان دہی کی جائے جہاں انھوں نے فکری اور عملی اعتبار سے ٹھوکریں کھائی ہیں۔

چنانچہ سورۂ فاتحہ کے بعد جو دیباچۂ قرآن ہے، چار بڑی مدنی سورتیں (بقرہ، آل عمران، النسآء، مائدہ) رکھی گئی ہیں، جن میں اہلِ کتاب کے عقاید واعمال اور ان کی نافرمانیوں کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان سورتوں میں خطاب کی ترتیب زیادہ تر اس طرح ہے کہ پہلے اہلِ کتاب کے احوال بیان کیے گئے ہیں اور اس کے بعد اہلِ ایمان یعنی مسلمانوں کو ہدایات دی گئی ہیں کہ وہ اہلِ کتاب کے برعکس خدا کی اطاعت وفرماں برداری کریں تا کہ اس کے فضل وانعام کے مستحق قرار پائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مائدہ کے بعد پھر دو سورتیں انعام اور اعراف مکی ہیں اور ان کے بعد دو سورتیں مدنی ہیں، یعنی انفال اور توبہ۔ اس طرح سورۂ فاتحہ کو چھوڑ کر کل آٹھ سورتیں ہوئیں۔ ان آٹھ سورتوں میں دراصل حق و باطل کی اس کش مکش کا ذکر ہوا ہے جو اسلام اور اس کے مخالفین کے درمیان مکہ میں شروع ہوئی اور مدینہ میں بھی جاری رہی۔ بالآخر فتح مکہ نے اس جدل ونزاع کا خاتمہ کیا اور دین اسلام جزیرۃ العرب کے جملہ ادیان پر اس وعدۂ الٰہی کے مطابق غالب ہوگیا جس کا ذکر مختلف سورتوں میں ہوا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

(سورۂ توبہ: ۳۳)

"وہی اللہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ کل دین شرک پر اس کو غالب کردے، خواہ مشرکین کو یہ بات کتنی ہی ناگوار گزرے۔"

سورۂ توبہ کے بعد سورتوں کی ترتیب اور ان کے مضامین دونوں میں واضح تبدیلی ملتی ہے۔ یہاں سے مکی سورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے چودہ مکی سورتیں ہیں، جن کے غالب حصے میں ان رسولوں کی دعوت حق کا ذکر ہوا ہے جو جزیرۃ العرب سے باہر کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان سورتوں میں توحید، رسالت اور معاد جیسے اساسی مضامین کو مختلف الفاظ واسالیب میں پیش کیا گیا ہے۔

آگے بھی سورتوں کی ترتیب اسی نہج پر قائم ہے، البتہ درمیان میں ایک سے تین تک مدنی سورتیں بھی آگئی ہیں تاکہ دعوت حق کا عملی پہلو نظروں سے اوجھل نہ ہو۔ سورۂ واقعہ تک یہ تسلسل قائم رہتا ہے۔ اس کے بعد دس سورتیں مدنی ہیں اور یہ مدنی سورتوں کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سب سے بڑا اجتماع ہے۔ ان سورتوں میں اہلِ کتاب اور منافقوں کو اتمامِ حجت کے طور پر ایک بار پھر اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے انکار پر قائم رہے تو پھر ان کے استیصال کا فیصلہ کر دیا گیا اور اس طرح دین شرک کا جزیرۃ العرب سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ آخری دو مدنی سورتوں، طلاق و تحریم، کے ذریعے سے اسلامی شریعت کی تکمیل کی گئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

ان دس مدنی سورتوں کے بعد سورۂ ملک سے سورۂ والناس تک ۴۸ سورتیں ہیں، جن میں تین سورتیں (دھر، بیّنۃ، نصر) مدنی اور بقیہ مکی ہیں۔ اس مجموعۂ آیات میں آخری چند سورتوں کو چھوڑ کر آخرت کا مضمون غالب ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے دین میں توحید اور معاد کے تصورات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری دو سورتیں (لہب، اخلاص) بالترتیب معاد اور توحید کے مضمون پر مشتمل ہیں۔ دیکھیں، قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ کی شکل میں توحید سے ہوا تھا (ایاک نعبدُ وایاک نستعین) اور اس کا اختتام بھی توحید پر ہوا (قل ھو اللہ احد)۔ سورۂ اخلاص کے بعد 'معوّذتین' ہیں، جن میں بالخصوص توحید کے دشمنوں سے خدا کی پناہ مانگی گئی ہے۔

اگر اس زاویۂ نگاہ سے سورتوں کی موجودہ ترتیب پر غور کیا جائے تو ماننا ہوگا کہ یہ ایک عمدہ ترتیب ہے۔ مکی اور مدنی سورتوں کو جس حکیمانہ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھا گیا ہے اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ دین کے نظری پہلو (ایمانیات) کو اس کے عملی پہلو (شریعت) پر تقدّم حاصل ہے۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ ایمان کی پختگی کے بغیر دل کی کامل رضا و رغبت کے ساتھ شریعت کی پابندی ممکن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی جو عملی حالت ہے وہ اس کا بیّن ثبوت ہے:

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ ۭ (سورۂ حجرات: ۱۴)

''ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔''

نظمِ قرآن

کہا جاتا ہے اور بالکل بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن ایک علمی اور روحانی معجزہ ہے۔ اس کے متنوّع اور اعلیٰ مضامین اور اس کی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر عرب کے مایۂ ناز شعراء اور جلیل القدر خطباء کی زبانیں گنگ ہوگئیں اور وہ اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ بظاہر قرآن کی آیات میں معنوی بے ربطی پائی جاتی ہے؟

قرآن پر مستشرقین نے جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس کی آیات میں نظم و ترتیب کا فقدان ہے، دوسرے لفظوں میں وہ منتشر افکار و خیالات کا ایک بے ترتیب مجموعہ ہے۔ اس کے اجزاء میں منفرد طور پر لفظی اور معنوی دلربائی تو ہے لیکن وہ حسن و زیبائی کہاں جو معنوی اعتبار سے ایک منظم و مرتب کلام کا خاصہ ہے۔

اس خیال کا اظہار ان مستشرقین نے بھی کیا ہے جو پیغمبر اسلام کی عظمت و بزرگی کے قائل ہیں۔ کارلائل کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ قرآن مجید کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ''تمام رو رعایت کے باوجود ایک شخص کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے بالخصوص اس آدمی کے لیے جو مخالف ہے کہ قرآن کی تخلیق آسمان پر ہوئی، دنیا کے لیے ایک بہترین نعمت کے طور پر، ایک عمدہ طرز پر لکھی ہوئی کتاب کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حیثیت سے، عمدہ چھوڑیے، محض ایک کتاب کی حیثیت سے، بلکہ وہ یہ ماننے کے لیے مجبور ہوگا کہ یہ بے ربط اور منتشر مضامین کا مجموعہ ہے۔

جہاں تک تحریر کا تعلق ہے وہ یقیناً ایک لکھی ہوئی کتاب ہے لیکن شاید دنیا کی سب سے خراب لکھی ہوئی کتاب۔ لیکن اسی کے ساتھ میں کہوں گا کہ یہ ناقابلِ فہم نہیں ہے ورنہ عرب اس سے اس درجہ محبت کیوں کرتے۔ جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ دوسروں کے دل پر بھی اثر کرتی ہے۔ میرے نزدیک قرآن کی جو خوبی (Merit) ہے وہ اس کی اصلیت (Genuineness) ہے۔ وہ بلا شبہ سچائی اور نیک نیتی پر مبنی کتاب (Bonafide Book) ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بہتوں نے اس کتاب کو دغابازیوں (Juggleries) کا مجموعہ کہا ہے، لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس قسم کے خیالات کو رد کردیا جائے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ سنجیدہ (Sincere) رہے ہیں، کون ہمیشہ سنجیدہ رہتا ہے۔ لیکن میں ان ناقدوں سے اتفاق نہیں کرسکتا جو کہتے ہیں کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ فریب کاری کی ہے اور اس قرآن کو ایک جعلی اور فریبی کی حیثیت سے لکھا ہے۔ جو شخص بھی قرآن کو پڑھے گا وہ اس خیال کی نفی کرے گا۔

میرا خیال ہے کہ قرآن ایک عظیم ناتراشیدہ (Rude) روح کا غیر واضح اور پراگندہ جوش و خروش (Confused Ferment) ہے، ناتربیت یافتہ جو کہ پڑھ بھی نہیں سکتا تھا لیکن پرجوش خیالات کو الفاظ کا قالب دینے کی شدید کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے پاس خیالات کا ہجوم ہے، وہ بہت کچھ کہنے کی کوشش میں کچھ زیادہ نہیں کہہ پاتے۔ جو معانی ان کے پاس تھے وہ کسی باضابطہ تالیف کی صورت میں نہیں ڈھل سکے۔ بس اسے افکارِ پریشاں کہہ سکتے ہیں۔ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ حد درجہ بے نظمی اور بے ترتیبی کا شکار ہے۔ اسی لیے میں نے پہلے اسے سادہ لوحی (Stupidity) سے تعبیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا ہے لیکن فطری سادہ لوحی (Natural Stupidity) ہی اسے کہا جائے گا۔ اور یہی قرآن کی خصوصیت ہے[1]۔"

انیسویں صدی کے ایک دوسرے مستشرق سر ولیم میور نے بھی اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ "قرآن میں حد درجہ بے نظمی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔ مضامین ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ ہیں (Chaotic Mingling of Subjects)، اس میں نہ زمانی ترتیب ہے اور نہ معنوی ترتیب۔ جو ٹکڑا مدینہ میں نازل ہوا وہ مکی ٹکڑے سے پہلے آ گیا ہے۔ بعد کا قانون پہلے قانون کا ناسخ ہے یا اس میں ترمیم کرتا ہے، ابھی ایک بحث چل رہی ہے کہ اچانک ایک دوسرا جملہ ایسا آ جاتا ہے جو موقع و محل کے لحاظ سے بالکل بے تعلق بلکہ اجنبی ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اس وقت قرآن جس مرتب شکل میں ہے عہدِ نبوی میں بھی وہ اسی نظم و ترتیب سے تھا[2]۔"

یہ مستشرقین کے خیالات ہیں جو قرآن مجید کو آسمانی کتاب نہیں مانتے بلکہ اس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اس رائے میں کچھ تو ان کے قومی و مذہبی تعصب کا دخل ہے اور کچھ یہ کہ ان میں سے اکثر عربی زبان و ادب اور قرآن کے اسالیب کلام سے واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے اگر ان کو قرآن مجید میں نظم و ترتیب کی کمی یا فقدان نظر آیا تو وہ قابلِ فہم ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بہت سے علماءِ اسلام بھی یہی خیال رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ مستشرقین کے برخلاف قرآن کو کلامِ الٰہی مانتے ہیں اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ وہ علوم و معارف کا گنج گراں مایہ اور ہدایت کا آخری معتبر وسیلہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

۱۔ The Hero As Prophet, By Thomas Carlyle, pp.35-37

۲۔ The Life of Mahomet, By William Muir, Vol.I, p.VII

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چوں کہ قرآن مختلف اسباب وحوادث اور احوال وحاجات کے تحت نازل ہوا ہے اس لیے اس میں نظم وترتیب کا نہ ہونا کچھ تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اس کی مثال سمندر کی ہے جس میں بے شمار لولو اور مرجان پائے جاتے ہیں لیکن منتشر حالت میں۔

اس خیال کے حامل علماء میں شیخ عزّ الدین بن عبد السلام (م ۶۶۰/۱۲۶۱ء) نمایاں ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ”مناسبت ایک عمدہ علم ہے مگر ارتباطِ کلام کے حسن میں یہ بات شرط ہے کہ وہ کسی ایسے کلام کے پیچھے واقع ہو جو کہ متحد ہو اور اس کا اوّل اس کے آخر سے ربط واتصال رکھتا ہو۔ لہٰذا اگر کلام کا وقوع مختلف اسباب کے تحت ہوگا تو اس میں ہرگز ارتباط نہ ہوگا اور جو شخص ایسے کلام کو ربط دے گا وہ خواہ مخواہ ایک امرِ ناشدنی کی تکلیف کرے گا...... قرآن مجید کا نزول بیس سال سے بھی کچھ زیادہ عرصہ میں ہوا اور مختلف اسباب کی بنا پر مختلف اوقات میں مختلف احکام کے لیے نازل ہوا تھا۔ اس طرح کے کلام کو کبھی مربوط نہیں کیا جا سکتا ہے[1]۔“

ہندی علماء میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (م ۱۷۶۲ء) کا بھی یہی خیال ہے کہ قرآن کی جملہ آیتوں میں نظم وترتیب کی تلاش بے سود ہے کیوں کہ اہلِ عرب کلام میں اس طرح کے تصنیفی نظم وترتیب سے کلیۃً ناآشنا تھے جس کا رواج متأخرین کے یہاں ملتا ہے۔ انھوں نے ’الفوز الکبیر‘ میں لکھا ہے کہ ”قرآن مجید میں علومِ پنجگانہ کا بیان قدیم عربوں کی روش پر ہوا ہے، متأخرین کا اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ آیاتِ احکام میں اختصار جیسا کہ متن نویسوں کا قاعدہ ہے، اور غیر ضروری قیود کی تنقیح کا جیسا کہ اصولیوں کا طریقہ ہے، التزام نہیں کیا گیا۔ علم مباحثہ کی آیات میں مشہور ومسلّم اقوال اور خطابیاتِ نافعہ کا التزام تو ہے مگر ترتیب براہین میں منطقیوں کے اسلوب کی پیروی

1. الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۱۴۴

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

اور ایک مضمون کے بعد دوسرے مضمون کے شروع کرنے میں مناسبت کی رعایت جیسا کہ ادباءِ متأخرین کا قاعدہ ہے، نہیں کی گئی ہے بلکہ خداوند تعالیٰ نے جس حکم کو بندوں کے لیے مہتم بالشان سمجھا اس کو بیان کیا، خواہ کوئی حکم مقدم ہو جائے یا مؤخر[1]۔"

اس کے بعد شاہ صاحب نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ قرآن مجید میں ان بنیادی موضوعات کو ایک خاص ترتیب سے کیوں نہیں بیان کیا گیا؟ فرماتے ہیں:

"اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ سے یہ بات ناممکن نہ تھی لیکن ایسا نہ کرنے کی وجہ حکمت اور مصلحت ہے اور وہ حکمت یہ ہے کہ قرآن مجید کے ادب و زبان اور اسلوبِ بیان میں عربوں کی زبان اور طرزِ کلام کے ساتھ موافقت کی گئی ہے[2]۔"

شاہ صاحب سورتوں کے مابین بھی کسی نظم و تعلق کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک قرآن کا اسلوب بیان شروع سے آخر تک مکتوب یا شاہی فرمان کی مانند ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "قرآن مجید کو ادنیٰ درجہ کی کتابوں کی طرح ابواب و فصول میں اس طرح تقسیم نہیں کیا گیا ہے کہ ہر مبحث ایک جداگانہ باب یا فصل میں بیان کیا جاتا بلکہ قرآن کو مجموعۂ مکتوبات کے مثل سمجھنا چاہیے۔ جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کو حسبِ ضرورت ایک فرمان لکھتا ہے، اس کے بعد دوسرا اور تیسرا فرمان، یہاں تک کہ بہت سے فرامین جمع ہو جاتے ہیں اور کوئی شخص ان فرامین کو ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کر دیتا ہے۔ بعینہٖ قرآن مجید کی سورتوں کو جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں جداگانہ مرتب اور محفوظ تھیں، ایک مصحف کی صورت میں جمع کر دیا گیا[3]۔"

قرآن مجید کی آیات اور اس کی سورتوں میں بے نظمی اور بے ترتیبی کی جو توجیہ

---

1. الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۵
2. ایضاً، ص ۷۱
3. ایضاً، ص ۶۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متذکرہ صدر علماء نے کی ہے وہ بعض جزوی صداقتوں کے باوجود صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ قرآن مختلف حالات و کوائف میں نجماً نجماً نازل ہوا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے۔

معلوم ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب نزولی نہیں، توقیفی ہے۔ جو سورتیں پہلے نازل ہوئیں وہ ترتیب میں مؤخر اور جو بعد میں نازل ہوئیں وہ مقدم ہوگئیں اور اس کی وجہ سورتوں کے مضامین کی مناسبت ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی آیت یا آیتیں نازل ہوتیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کاتبینِ وحی سے فرماتے کہ ان کو فلاں سورہ میں فلاں آیت کے پہلو میں رکھو۔ اگر آیات یا سورتوں کے درمیان کوئی معنوی مناسبت مدِ نظر نہ ہوتی تو پھر اس حکم کی کیا ضرورت تھی؟

سورتوں کی موجودہ مقداری تقسیم سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ اگر ہر سورہ کا ایک خاص موضوع اور معنوی نظام نہیں ہے تو آیات کی حد بندی اور ان کے تسمیہ کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ یہ سورۂ بقرہ ہے اور یہ سورۂ آلِ عمران ہے۔ تمام سورتیں کسی نام کے بغیر اوّل سے آخر تک ایک ہی سلسلۂ تحریر میں منسلک ہوتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیات کو ایک خاص نظم و ترتیب سے لکھواتے اور جب ایک سورہ متعیّن مقداری حد پر پہنچ جاتی تو وہ ایک خاص نام سے موسوم ہوتی اور اسے مکمل سورہ کا درجہ حاصل ہو جاتا۔ اس طرح ۲۳ سال کی طویل مدت میں تمام سورتیں درجۂ تکمیل کو پہنچیں۔

شاہ صاحب کا یہ خیال عجیب ہے کہ ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے، ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے اور ایک باب کا دوسرے باب سے واضح طور پر مربوط ہونا ادب جاہلی اور اہل عرب کے نزدیک جزءِ بلاغت نہیں تھا۔ اس لیے قرآن مجید کی آیات کے مابین ہر جگہ نظم و مناسبت کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حق بات یہ ہے کہ قرآن نے اپنے بیانات میں اہلِ عرب کے مذاق کلام کی رعایت تو کی لیکن اس کی مکمل پابندی نہیں کی بلکہ ان کے مروّجہ اسالیبِ بیان میں اضافہ کیا اور بلاغت کے نت نئے جلوے دکھائے۔ جو اسالیب کلام عربوں میں مقبول تھے ان میں بھی اس نے جدّت طرازی کی اور ان کو منتہائے کمال تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عرب اپنے معروف اسالیب کلام میں بھی قرآن سے معارضہ کی جرأت نہ کر سکے۔

ارباب بلاغت نے اعجازِ قرآن کے وجوہ میں اس کے اسلوبِ بدیع کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی ہے۔ اعجازِ قرآن پر ابوعیسیٰ رمانی (م۳۸۴/۹۹۴ء) کی ایک کتاب ہے جس میں اس نے لکھا ہے کہ ”عربوں کے معروف انواعِ کلام معدودے چند تھے، جیسے شعر، سجع اور محاورہ (بول چال کی زبان)۔ قرآن مجید نے ان سے بالکل الگ طریقہ اختیار کیا جو عربوں کی معروف عادت کلام کے بالکل خلاف تھا لیکن حسن و جمال میں اس سے بڑھ کر۔ مثلاً شعر میں وزن اس کے حسن کو بڑھاتا ہے لیکن قرآن مجید نے شعری وزن کو باقی نہیں رکھا یعنی دو مصرعوں کا برابر ہونا لیکن اس کے باوجود اس کا حسن شعر کے حسن سے کہیں زیادہ ہے[۱]۔“

اعجازِ قرآن پر گفتگو کرتے ہوئے استاذ الحمصی نے لکھا ہے کہ ”قرآن مجید کے امتیازی اوصاف میں اس کے اسلوبِ بیان کی خوبی کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ یہ اسلوبِ بیان عربوں کے اسالیب کلام کے برعکس ہے۔ دیکھو، آیتوں اور سورتوں کا آغاز کس طرح ہوتا ہے۔ مثلاً سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطعات آئے ہیں۔ پھر اسلوبِ خطاب دیکھو: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، یا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا۔ اس کے علاوہ آیات کا خاتمہ ایسے فواصل پر ہوتا ہے جن میں موسیقی کی کیفیت ملتی ہے۔ بالعموم اس کا آخری

---

۱ نظریۃ اعجاز القرآن عند عبدالقاہر الجرجانی: اسرار البلاغۃ و دلائل الاعجاز، محمد حنیف نقیمی، ص ۱۴۶

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

حرف ساکن اور اس کے ماقبل حرف مدّہ (ا،و،ی) آتا ہے، جس سے ایک شیریں ضرب پیدا ہوتی ہے جو موسیقی کا خاصہ ہے۔ الفاظ کی داخلی موسیقی اس کے علاوہ ہے۔ اواخرِ آیات میں حروف کا توافق و تقارب بھی قابلِ غور ہے جو سجع کے مشابہ ہے لیکن نفوس پر اثر اندازی کے لحاظ سے اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ جملوں کی مقدار میں جو تقارب ہے وہ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے مفرد اور مرکب الفاظ میں غیر معمولی موزونیت اور حسنِ ترتیب ہے، جس سے آیات ایک مخصوص وزن پر رواں دواں نظر آتی ہیں[۱]۔"

استاذ رافعی نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ "قرآن کا اعجاز اس کے اسلوبِ بدیع میں ہے۔ اس کا اسلوب جملہ انسانوں کے معروف اسالیبِ کلام سے جداگانہ ہے۔ اسی وجہ سے عرب قدیم اس کا جواب دینے سے قاصر رہے۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ یہ کلام کی ایک ایسی جنس ہے جو ان کے طبائع اور مذاق کے برخلاف ہے لیکن لطف و شیرینی میں اس سے بڑھ کر ہے[۲]۔"

دل چسپ بات یہ ہے کہ خود شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اعجازِ قرآن کے بیان میں اسی دلیل کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "اعجازِ قرآن کے بہت سے وجوہ ہیں، جن میں اوّل اس کا اسلوبِ بدیع ہے۔ عربوں کے پاس بلاغت کے چند میدان تھے جن میں وہ اپنی فصاحت کی ترکتازی دکھاتے اور ہم عصروں سے مسابقت کی سعی کرتے تھے۔ اور وہ میدان قصائد، خطبے، رسائل اور محاورات ہیں۔ اہلِ عرب ان چار اسالیب کے علاوہ کسی اور اسلوب سے واقف نہ تھے اور نہ کسی پانچویں اسلوب کے اختراع پر قادر تھے۔ اس بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اگرچہ آپ امّی تھے، ایک خاص اور ممتاز اسلوب

---

۱ نظریۃ اعجاز القرآن عند عبدالقاہر الجرجانی، ص ۱۸۶

۲ ایضاً، ص ۱۹۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی ایجاد جو ان کے مروّجہ اسالیب کے علاوہ ہے، بے شک زمرۂ اعجاز میں شمار ہوگا۔[۱]"

قرآن مجید کے اس اعجازی پہلو کو وزن اور قوافی کے ذکر میں بھی انھوں نے نمایاں کیا ہے۔ لکھتے ہیں: "اگر کوئی سوال کرے کہ شعراء کے وزن اور قافیہ کو جو زیادہ حلاوت بخش ہیں، کیوں نہیں اختیار کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کلام کی حلاوت میں زیادتی ہر قوم اور ہر ذہن کے مذاق کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شعراء کا وزن لذیذ تر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے باوجودیکہ آپؐ اُمّی تھے، ایک عدیم المثال وزن و قافیہ کی ایجاد آپؐ کی نبوت کا کھلا ہوا نشان ہے۔ اگر شعرائے عرب کے وزن اور قافیہ میں قرآن مجید نازل کیا جاتا تو کفار برملا کہتے کہ یہ تو ایسے ہی اشعار ہیں جو عربوں میں عام ہیں اور ہر کس و ناکس کی زبان پر ہیں۔ اس خیالِ باطل کی وجہ سے قرآن مجید کی طرف ادنیٰ التفات بھی نہ کرتے اور اس کو کسی شمار میں نہ رکھتے۔ نظم و نثر کے اربابِ کمال بھی جب اپنے ہم عصر فضلاء میں خود کو نمایاں اور ممتاز کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس مقصد کے لیے کوئی تازہ زمین یا کوئی جدید اسلوب اختراع کرتے ہیں اور پھر دعویٰ سے کہتے ہیں کہ ہے کوئی جو اس زمین میں ایسی غزل یا اس اسلوب میں ایسی نثر لکھ سکے؟ اگر یہ لوگ قدیم طرز انشاء کی پیروی کریں یا پامال زمینوں میں طبع آزمائی کریں تو محققین کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے کمال کا اعتراف نہ کرے گا۔[۲]"

حقیقت یہ ہے کہ قرآن اپنے اسلوبِ بیان اور انواعِ مضامین دونوں کے لحاظ سے ایک منفرد اور یکتا کتاب ہے۔ قرآن کے علاوہ دنیا میں ایسی کوئی کتاب نہیں خواہ دینی ہو یا غیر دینی، جو ہر اعتبار سے کامل اور دین و دنیا کے تقاضوں کا ایک خوشگوار آمیزہ ہو۔

---

۱ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص۷۲، ۷۳

۲ ایضاً، ص۷۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مثلاً اس میں عقاید وعبادات کا تذکرہ ہو اور اخلاقی تعلیمات کا بیان بھی، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق واضح رہنمائی ہو اور حیات اُخروی کے جملہ احوال و مقامات کا واضح بیان بھی، دعوت انبیاء کے تذکرے ہوں اور اقوامِ ماضیہ کے عروج وزوال کی داستان بھی، تزکیۂ نفس کی دعوت دی گئی ہو اور باطل کے خلاف جہاد کی ترغیب بھی، ذکرِ اللہ کا بیان ہو اور آثارِ کائنات پر غور وفکر کی تلقین بھی، خلقِ عالم کی نیرنگیاں دکھائی گئی ہوں اور اس کے اسرار سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہو، ابداعِ عالم کی غرض وغایت بیان کی گئی ہو اور تخلیقِ انسان کا مقصد ومنشاء بھی واضح طور پر متعیّن کیا گیا ہو، غرض یہ کہ جسم وروح، عقل و جذبات اور فرد اور جماعت کے مسائل کے بیان میں کامل درجہ کا عدل وتوازن ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ہر تعلیم خطا سے پاک اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہو۔ اس میں نہ رہبانیت کو راہ دی گئی ہو اور نہ دنیا پرستی کی اجازت ہو۔ ایک صاف وسیدھی اور روشن شاہراہ ہے، فکر کے اعتبار سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی۔

ادبی زاویۂ نگاہ سے دیکھیے تو بھی قرآن مجید کی انفرادیت اور اس کی یکتائی مسلّم ہے۔ بلا مبالغہ وہ دنیا کے ادبی ذخیرہ کا گوہرِ شب تاب ہے، ہومر، شیکسپیر، فردوسی اور دنیا کے دوسرے ادباء وفضلاء کے ادبی کمالات اس کے ادبی محاسن کے سامنے خزف ریزوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہر دور کے اربابِ علم نے اس کتاب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ بڑے بڑے شعراء وادباء نے اس کے آگے اعتراف کی پیشانی جھکائی ہے۔

اس کے الفاظ کا در وبست، اس کی تراکیب کی بندش، اس کے جملوں کی سبک خرامی، اس کے قوافی کی ندرت ونغمگی، اس کے طرز بیان کی سحر انگیزی، اس کے استعارات وتشبیہات اور امثال ومحاورات کی جدّت طرازی اور اثر آفرینی بے مثل و بے نظیر ہے۔ ہر آیت میں الفاظ تراشے ہوئے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ معانی

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کی وسعت و بے کرانی کا حال یہ ہے کہ لفظ لفظ میں جہانِ معنی پنہاں ہے، ہر آیت سے علوم و معارف کے چشمے ابلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

شیکسپیئر اٹھارہویں صدی کا ایک عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار گزرا ہے لیکن اس کی زبان بیسویں صدی کی انگریزی زبان سے مختلف ہے۔ اس کے ڈراموں کے بہت سے الفاظ و تراکیب اب متروک ہو چکے ہیں، لیکن قرآن مجید کا ایک بھی لفظ، ایک بھی ترکیب اور ایک بھی محاورہ آج تک متروک الاستعمال نہیں ہوا۔ متروک ہونا تو بڑی بات ہے، وہی اب بھی فصیح تر مانے جاتے ہیں۔ علمِ بلاغت میں بیان کے نئے نئے طرز ایجاد ہو گئے ہیں لیکن اس کی روح اور اس کا معیار کمال اب بھی وہی ہے جو ۱۴سو سال پہلے قرآن حکیم کی بلاغت نے متعین کر دیے تھے، یعنی سلاستِ بیان اور اثر انگیزی۔ اس اعتبار سے قرآن مجید ایک بے مثل کلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو سن کر ایک کافر کی روح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ اس پُر تاثیر کتاب نے عرب قدیم کے شعراء، خطباء اور بلغاء کو جن کو اپنی زبان دانی اور طلاقتِ لسانی پر بڑا غرہ تھا، چیلنج دیا کہ وہ اس کا مثل لائیں:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ (سورہ طور: ۳۳، ۳۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن خود تصنیف کر لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ ایمان ہی لانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ اپنے قول میں سچے ہیں تو اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں۔"

جب کہیں سے کوئی حریفانہ صدا بلند نہ ہوئی تو کہا گیا، اچھا پورا قرآن نہ سہی، دس سورتیں ہی بنا لاؤ[1] لیکن یہ بھی ان سے بن نہ پڑا۔ آخر الامر اتمامِ حجت کی خاطر کہا

---

[1] سورہ ہود: ۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

گیا کہ ایک ہی سورہ، چھوٹی بڑی کی قید نہیں، اس کی مانند پیش کرو[1] مگر وہ اس کی بھی جرأت نہ کر سکے اور تب اعلان کر دیا گیا کہ اگر سارے جن مل کر اس کام میں انسانوں کی مدد کریں تو بھی اس کا مثل لانا ان کے بس میں نہیں ہے[2]۔

غور فرمائیں، کیا اس تحدّی کا محل ایک ایسی کتاب ہو سکتی ہے جو اپنی ساخت و ترکیب میں غیر منظم ہو، جس کے مضامین میں کوئی ربط و تسلسل نہ ہو، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ سے معناً غیر مربوط ہو۔ اور کیا اسی پراگندہ خیالی کا جواب پیش کرنے سے عرب کے نامور شعراء اور خطباء عاجز ہو گئے؟ ان کے لیے تو نہایت آسان تھا کہ وہ قرآن کا چیلنج سنتے ہی بول اٹھتے کہ اس کتاب کا جواب کون لکھ سکتا ہے جس کی ہر سورہ خیالاتِ پریشاں کا ایک دفتر ہے، جس کے اجزائے ترکیبی میں نظم و ترتیب نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی، لیکن وہ قرآن پر اس نوع کا الزام عائد نہ کر سکے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ایک منظم اور مرتب کلام سمجھتے تھے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان کے ذہین افراد نے اعتراف کیا کہ یہ ایک غیر معمولی کلام ہے۔ اس سلسلے میں مکی سردار مغیرہ بن شعبہ[3] کے تأثرات ملاحظہ ہوں:

"بخدا شعر ہو یا رجز، قصائد ہوں یا جنّی اشعار، عربی کلام کی ایک ایک

۱۔ سورۂ بقرہ: ۲۳، سورۂ یونس: ۳۸

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل: ۸۸

۳۔ یہ قریشی سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے اسے قرآن پڑھ کر سنایا۔ وہ بہت متأثر ہوا اور چپکے سے اپنے گھر چلا گیا۔ یہ خبر ابوجہل تک پہنچی تو وہ گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا اور کہا: چچا جان! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں چند الفاظ ایسے فرما دیجیے جن کو سن کر آپ کی قوم کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ آپ اس شخص کے دعوائے نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے جواب میں ولید نے مذکورہ خیال کا اظہار کیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صنف کو میں تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔ لیکن خدا کی قسم یہ شخص جو کلام پیش کر رہا ہے وہ ان میں سے کسی چیز کے بھی مشابہ نہیں۔ بخدا اس کے کلام میں ایک عجیب حلاوت ہے اور ایک خاص طرح کا حسن ہے۔ اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی اور اس کی جڑیں بالکل شاداب ہیں۔ یقیناً وہ ہر کلام سے بلند ہے اور کوئی دوسرا کلام اسے نیچا نہیں دکھا سکتا۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ہر اس چیز کو توڑ کر رکھ دے گا جو اس کے نیچے آئے گی[1]۔"

قرآن مجید کی اسی بے پناہ تاثیر کا نتیجہ تھا کہ کفار قریش عاجز آ کر تلاوتِ قرآن کے دوران شور و ہنگامہ کرتے تھے تاکہ لوگ اسے سن نہ سکیں:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (حٰمٓ سجدہ:٢٦)

"کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں شور وغل مچاؤ شاید کہ تم اس طرح غالب آجاؤ۔"

قرآن کی اس غیر معمولی تاثیر کی وجہ کلام کی سچائی اور اس کی بے نظیر فصاحت و بلاغت ہے۔ جو کلام جس درجہ سچا اور فصیح و بلیغ ہوگا اسی قدر مؤثر ہوگا اور نظم و ترتیب بلاغت ہی کا حصہ ہے۔ پس اگر قرآن بلیغ کلام ہے اور یقیناً ہے تو لازمی ہے کہ اس میں غایت درجہ کا نظم و ترتیب ہو۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے لکھا ہے کہ دنیا میں جتنی چیزیں عمدہ اور حسین ہیں

---

[1] المستدرک، حاکم نیشاپوری، ج۲، ص۵۰۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان کے حسن و جمال کی وجہ ان کے اجزائے ترکیبی کا ایک خاص نظم ہے۔ اگر تم اس نظم و ترکیب کو ختم کر دو تو ان کا حسن آن واحد میں معدوم ہو جائے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک چیز بظاہر حسین و جمیل ہو لیکن باعتبارِ نظم و ترکیب عمدہ نہ ہو۔ جس شے میں جس قدر زیادہ نظم و ترتیب ہوگی اسی قدر وہ شے اپنے منتہائے کمال پر ہوگی۔ اشیاء سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کی کثرت و قلت بھی حسنِ ترتیب پر منحصر ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مطابقِ حقیقت ہوگا کہ وہی ماہیتِ اشیاء کی اصل اور ان کے وجود کی حقیقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صنعت اور اس کا کمال دراصل ترکیب کی درستی کا نام ہے۔ کسی شے کے صانع کی تعریف کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اس کی صنعت میں کمال درجے کی ترکیب و تنظیم ہے، اور اس کی تنقیص کے معنی یہ ہیں کہ مصنوع کی ترکیب و ترتیب حد درجہ بودی ہے۔ یہی حال اعمال و تدابیر کا ہے۔ یہ ایک ایسا منضبط اصول اور قاعدۂ راسخہ ہے جو یقیناً اہلِ نظر سے مخفی نہ ہوگا[1]۔

اس اصول کا انطباق انسانی کلام کی ترکیب پر بھی ہوگا۔ کلام اسی وقت با معنی بنتا ہے جب اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک طور پر مربوط ہوں۔ یہ دراصل کلام کی صورتِ ترکیبی ہے جو اس کے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ ایک لفظ کی ترکیب پر غور کرو تو یہ بات بالکل عیاں ہو جائے گی۔ لفظ با معنی اس وقت بنتا ہے جب اس کے حروف ایک ترکیب کے ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک جملے کے اندر کلمات کی ترکیب کا ہے۔ جب اس کے کلمات ایک مخصوص ترکیب حاصل کرتے ہیں اس وقت اس میں معنی پیدا ہوتا ہے۔ اسی پر جملوں کی ترکیب کو قیاس کر لو۔ کلام کا حسن و جمال، اس کی اثر انگیزی، اس کی قوتِ استدلال، اس کا حسنِ بلاغت اور اس کی حکمتِ بالغہ سب اس کے

---

[1] دلائل النظام، ص ۱۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جملوں کے نظم و ترتیب کی خوبی پر منحصر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر کلام اپنے اندر ایک نظم رکھتا ہے اور اس میں جو حسن پیدا ہوتا ہے یا وہ سخنِ بلیغ بنتا ہے تو محض اس کے اجزاء کی وجہ سے نہیں بلکہ ان اجزاء کے نظم و ترتیب کی کرشمہ سازی ہوتی ہے۔ اس لیے جو شخص کلام کے حسنِ بیان، اس کے زورِ استدلال اور نفوس کے اندر اس کی تاثیرات اور اس میں پوشیدہ حکمتوں سے باخبر ہونا چاہتا ہے ان کے لیے لازم ہے کہ وہ جملوں کی ترکیب اور وجوہِ ترکیب سے پوری طرح آگاہ ہو[1]۔

یہ بات کہ کلام کی ظاہری خوبی اور اس کی تاثیر اس کے نظم و ترتیب سے وابستہ ہے، ایک بدیہی حقیقت ہے۔ تم ایک بلیغ خطبہ کو لو جو ترغیب، ترہیب، امثال و حکم اور حجت و استدلال پر مشتمل ہو اور اس سے اس کا نظام الگ کردو، یعنی کسی رعایت کے بغیر اس کے جملوں کو مقدم اور مؤخر کردو، پھر دیکھو گے کہ کس طرح اس خطبہ کا سارا حسن زائل ہو جاتا ہے۔ دعویٰ اور دلیل میں کوئی مطابقت باقی نہ رہے گی، حسنِ بیان اور کمالِ بلاغت کا کہیں نام و نشان بھی نہ ہوگا، کلام کا مقصد و منشا پورے طور پر فوت ہو چکا ہوگا اور پڑھنے والے کو صاف محسوس ہوگا کہ یہ خللِ دماغ کے کسی مریض کی بے سروپا ہرزہ سرائی ہے[2]۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند سورتوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے تاکہ یہ دعویٰ کہ قرآن مجید ایک منظم و مرتب کلام ہے، مزید واضح اور متحقق ہو جائے۔

'فاتحہ' قرآن کی پہلی سورہ ہے۔ یہ فاتحۃ الکتاب کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس کو غور سے پڑھیں، کہیں ادنیٰ احساس بھی نہ ہوگا کہ اس میں کوئی معنوی بے ربطی

---

1. دلائل النظام، ص ۱۹
2. ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ سورہ کی ہر آیت اپنے ماقبل و مابعد کی آیت سے پوری طرح مربوط ہے۔ اس سورہ کا مرکزی موضوع اجمالاً توحید ہے۔ اسی کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد اس کی عبادت اور اسی سے استعانت کا عہد و پیمان کرتا ہے۔ اس کے بعد خدا کی جناب میں درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کو توحید کی سیدھی راہ دکھائے۔ اس سلسلے میں وہ صرف اس بات کی التجا نہیں کرتا کہ خدا اس کو توحید کی علم بردار جماعت (منعم علیھم) کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق بخشے بلکہ یہ استدعا بھی کرتا ہے کہ جن لوگوں نے توحید کی راہ سے دیدہ و دانستہ روگردانی اختیار کی اور خدا کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے (مغضوب علیھم) یا جو لوگ اس کی راہ سے بھٹک گئے (ضالین) ان کی اتباع سے اس کو محفوظ رکھے۔ ہے اس میں کوئی معنوی بے ربطی؟

سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ بقرہ ہے۔ اس کا یہ نام بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس سے بہتر اس کا کوئی دوسرا نام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں ایک مقام پر بیل (گائے) کی قربانی کا ذکر ہے (آیات: ۶۷-۷۱)۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہود سے کہا کہ "اللہ تم کو ایک بیل کی قربانی کا حکم دیتا ہے" (اِنَّ اللہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً)۔ اس حکم کو سن کر انھوں نے کہا "کیا تم ہم سے ہنسی مذاق کرتے ہو" (قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا)۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جاہلوں کی سی بات کروں" (قَالَ اَعُوْذُ بِاللہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ)۔ لیکن اس کے بعد بھی یہود نے سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور تعمیلِ حکم سے بچنے کے لیے وضاحت پر وضاحت طلب کرتے رہے۔ اس رویے سے ان کی سرکش طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سورہ کے تقریباً نصف حصے میں ان کی نافرمانیوں کا ذکر ہے۔ اس بنا پر ماننا ہوگا کہ اس سورہ کا یہ موزوں ترین نام ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس سورہ کے نظم کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے اس کی ساخت و ترکیب کا مطالعہ ضروری ہے۔ سورہ کو غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ دو ابواب (خطبات) پر مشتمل ہے اور ہر باب میں متعدد فصلیں (رکوعات) ہیں۔ پہلے باب (خطبہ) کا تعلق بنی اسرائیل کے اقوال و اعمال یعنی ان کی داستانِ سرکشی سے اور دوسرے باب (خطبہ) کا تعلق اہلِ ایمان کی تعلیم و تربیت سے ہے۔ بالفاظ دیگر پہلے باب میں 'مغضوب علیھم' کی داستانِ کبر و تمرّد اور دوسرے باب میں 'منعم علیھم' کے عقائد و اعمال کی تفصیل ہے اور انہی کی راہ پر مسلمانوں کو چلنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب و بامراد ہوں۔

ترکیبِ سورہ کی تفہیم کے بعد اس کے مرکزی موضوع کا تعیّن ضروری ہے۔ اس سورہ کا مرکزی موضوع حقیقتِ ایمان ہے۔ یہود نے جس طرح زبان سے دعوائے ایمان کے باوجود عمل سے گریز کیا اور اللہ کے احکام سے روگردانی کی اس کی تفصیل سورہ کے پہلے باب میں جو ۱۴۱ آیات پر مشتمل ہے، موجود ہے۔ اس کے بعد اہلِ ایمان یعنی مسلمانوں کو ایمان کی دعوت اس کی جملہ تفصیلات کے ساتھ دی گئی ہے اور انھیں اللہ کے حکموں کی اطاعت و اتباع پر ابھارا گیا ہے۔ ان سے واضح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ وہ یہود کی طرح محض زبانی ایمان اور جزوی اطاعت پر اکتفا نہ کریں بلکہ پوری زندگی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں (آیت ۲۰۸)۔

ترکیبِ سورہ اور مرکزی موضوع کے تعیّن کے بعد اب میں اس کا نظم اجمالاً بیان کرتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ امر ذہن نشین کیا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس میں ان سب لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد اہلِ تقویٰ کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ تقابل قرآن کا معروف اسلوب کلام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ چنانچہ اہل تقویٰ کے ذکر کے بعد کفّار و منافقین کا تذکرہ ہے۔ منافقین کے مفسدانہ اعمال اور ان کے ذہنی تردّدات کو ایک تمثیل کے ذریعہ نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

مخاطبینِ سورہ کے ذکر کے بعد اس کے بنیادی موضوعات، توحید، رسالت اور معاد کا اجمالی بیان ہے۔ یہاں تک پہلے باب (خطبہ) کی تمہید ہے۔ اس کے بعد اصل موضوع یعنی یہود کی داستانِ سرکشی شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے خلافت آدم کا تذکرہ ہے اور ایک تمثیل کے ذریعہ ابلیس و آدم کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے تاکہ یہود دیکھ لیں کہ وہ کس مقام پر کھڑے ہیں اور کس کے اسوہ کا اتباع کر رہے ہیں؟

اس تمثیل کے بعد بنی اسرائیل پر اللہ کی پیہم عنایات کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ ان کی نافرمانیوں کو بھی ایک ایک کر کے بیان کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اس قوم کے اندر سے روحانی زندگی اور اس کی ترقی کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہیں اور ہدایتِ ربانی کے جس منصب پر وہ فائز کیے گئے تھے اب اس کے اہل نہیں رہے بلکہ سزا کے مستحق ہیں، وقت آگیا ہے کہ امامتِ عالم کی ابراہیمی وراثت ان سے چھین کر بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دی جائے۔

اس باب کا خاتمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر پر ہوا ہے اور اس سلسلے میں یہود کی متعدد غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے۔ مثلاً وہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے عہد لیا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو تا قیامت نوازتا رہے گا اور ان کو برابر دینی سیادت حاصل رہے گی۔ انھیں بتایا گیا کہ اس عہد کا تعلق ظالموں سے نہیں ہے اور وہ یقیناً ظالم و مشرک ہیں۔ اسی طرح یہود خانۂ کعبہ کے بارے میں کتمانِ حق سے کام لیتے تھے۔ واضح کیا گیا کہ اصل بیت اللہ خانۂ کعبہ ہی ہے اور اس کی تعمیر خود حضرت ابراہیم علیہ السلام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت مقامِ ابراہیم ہے جو آج بھی جائے عبادت ہے۔ آخری پیغمبر کی بعثت بھی دعائے ابراہیمی کا ثمرہ ہے۔ بیت اللہ کی تعمیر کے وقت انھوں نے دعا کی تھی کہ بنی اسمٰعیل کے اندر سے ایک پیغمبر مبعوث ہو اور اللہ نے یہ دعا قبول کی۔

یہودی فخر کی نفسیات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ وہ گھمنڈ سے کہتے تھے کہ ابراہیمؑ ہمارے باپ ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ ان کا طرزِ زندگی ابراہیمؑ کے طرزِ زندگی سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ نہ یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ مسلمِ کامل تھے، جب کہ ان کی اکثریت فاسق و فاجر اور مشرک ہے۔ اس لیے ابراہیمؑ سے قولی نسبت جوڑنے سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا حق صرف ان لوگوں کو حاصل ہے جنھوں نے ان کی مخلصانہ پیروی کی اور شرک سے محفوظ ہیں اور یہ نبیِ آخر اور ان کے پیرو ہیں۔

اس سورہ کے دوسرے باب (خطبہ) کا تعلق جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت سے ہے۔ اس کا آغاز تحویلِ قبلہ کے ذکر سے ہوا ہے۔ مسلمانوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ ہر حال میں خانۂ کعبہ کی طرف منہ کر کے عبادت کریں کہ وہی اہلِ توحید کا حقیقی قبلہ ہے۔ تحویلِ قبلہ کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ یہ دراصل دینی سیادت سے بنی اسرائیل کی معزولی اور اس منصب پر بنی اسمٰعیل کی تقرّری کا اعلان تھا۔

اس دینی سیادت کی ذمہ داریوں سے ٹھیک طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے مسلمانوں کو سب سے پہلا حکم یہ دیا گیا کہ وہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد لیں، اس لیے کہ اللہ صبر و ثابت قدمی دکھانے والوں کے ساتھ ہے (استعینوا بالصبر والصّلوٰۃ ؕ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰابِرِیْن)۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو قوم صبر و استقلال کا جوہر نہیں رکھتی، اللہ اس کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مدد نہیں کرتا۔ نماز پر صبر کا تقدّم اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں صبر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر دین کی مکمل پیروی ممکن نہیں ہے، یہاں تک کہ نماز کا قیام بھی مشکل ہے۔ دین میں صبر کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے آگے صفا اور مروہ کا ذکر ہے جو شعائر اللہ میں سے ہیں۔ یہی وہ مقامِ صبر و ثبات ہے جہاں 'ذبحِ عظیم' کا واقعہ پیش آیا اور اسی واقعہ نے بنی اسمٰعیل کے عروج و سربلندی کی راہ کھولی۔

صبر اور صلوٰۃ کی تعلیم کے بعد توحید کی حقیقت واضح کی گئی ہے کہ اس کائنات میں ایک ہی مرکزِ اقتدار ہے اور وہ اللہ ہے۔ اس کے سوا ہر وجود بالذات عاجز و بے قوت ہے (اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا)، وہ تنہا جملہ مخلوقاتِ عالم کا حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو مطلق طور پر نفع و ضرر کا مالک سمجھنا توحید کے منافی اور کھلا شرک ہے۔

توحید میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اللہ ہی اصل شارع و قانون ساز ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے کو علی الاطلاق قانون سازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ برسبیلِ تذکرہ یہودی فقہاء (فریسی) کی روش کی مذمت کی گئی ہے جو بزعم خود شارع اور قانون ساز بن بیٹھے تھے اور اللہ کی سند کے بغیر اپنی تاویلاتِ فاسدہ کے ذریعہ حلال و حرام کے فتوے دیتے تھے۔ انھوں نے اللہ کے قانونِ قصاص اور قانونِ وصیت میں بھی تبدیلی کر دی تھی۔ مسلمانوں کو اس روش سے اجتناب کی ہدایت کی گئی ہے۔

توحید اور متعلقاتِ توحید کے بیان کے بعد عبادات کا ذکر ہے اور بالترتیب روزہ (نماز کا ذکر پہلے آچکا ہے)، حج، جہاد، اور انفاقِ مال کے بارے میں احکام بیان کیے گئے ہیں۔ انفاقِ مال کے ضمن میں مالی معاملات میں کتابت اور حرمتِ سود کا بھی ذکر آگیا ہے۔ غور سے دیکھیں تو یہ سارے امور مقاماتِ صبر ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس دوسرے باب (خطبہ) کا اختتام توحید کے مضمون پر ہوا ہے اور اس کے بعد ایک حد درجہ مؤثر دعا ہے، جس میں بندہ سمع وطاعت کے عہد کے ساتھ اللہ سے عفود درگزر اور احکام و فرائض میں تخفیف کا طالب ہے۔ اس کی علت بالکل واضح ہے۔ اس سورہ میں کثرت سے احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد وہ اللہ کی کارسازی کے اقرار کے ساتھ کفار کے مقابلے میں اس کی نصرت کا خواہاں ہے (اَنۡتَ مَوۡلٰنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَی الۡقَوۡمِ الۡکٰفِرِیۡنَ)۔

آپ نے دیکھ لیا کہ یہ سورہ بھی بطریق احسن ایک سلسلۂ نظم میں پروئی ہوئی ہے، تمہید، موضوع اور خاتمہ تینوں اعتبار سے اس میں کہیں کوئی معنوی انتشار نظر نہیں آتا بلکہ حیرت انگیز حد تک منظم و مرتب ہے۔

سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ میں اجمالاً نظم و ترتیب دکھانے کے بعد اب میں قرآن مجید کی آخری تین سورتوں کو لیتا ہوں یعنی اخلاص اور معوذتین۔ اخلاص تمام تر توحید کی تعلیم پر مشتمل ہے۔ معوذتین میں بالخصوص توحید کے دشمنوں سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہے، گویا یہ توحید پر استقامت کی دعا ہے۔ ان تینوں سورتوں میں باہم جو معنوی ربط و اتصال ہے وہ بالکل واضح ہے اور چنداں محتاجِ تشریح نہیں۔

یہ بات بڑی اہم اور معنی خیز ہے کہ قرآن مجید کا آغاز دعا (سورۂ فاتحہ) سے ہوتا ہے اور دعا (معوذتین) ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ دعا کا موضوع بھی ایک ہے یعنی توحید۔ پہلی دعا میں توحید کی راہ پر چلنے کی خواہش کا اظہار ہے اور آخری دعا میں اس راہ کے خطرات سے خدا کی پناہ چاہی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید دراصل کتاب توحید ہے۔ اس کا اوّل بھی توحید اور اس کا آخر بھی توحید ہے۔ درمیان میں جو امور حیطۂ تحریر میں آئے ہیں، خواہ ان کا تعلق عبادات اور اخلاق و شرائع سے ہو، خواہ آخرت اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رسالت سے، اور خواہ انفس و آفاق کے اسرار و حقائق کی پردہ کشائی سے، ان سب کا رشتہ توحید سے جڑا ہوا ہے۔ توحید اصل ہے اور بقیہ ساری چیزیں اسی اصل کی فرع ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی حیثیت سرچشمۂ توحید سے نکلی ہوئی نہروں کی ہے۔

اوپر کی تفصیلی گفتگو سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن اعجاز کی حد تک ایک مرتب اور منظم کتاب ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں میں نظم و ترتیب ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ اکثر علماء کی نگاہ سے یہ نظم پوشیدہ رہا؟ جو علماء نظم کے قائل تھے وہ بھی اپنی جملہ مساعی کے باوجود قرآن کی جملہ سورتوں میں نظم و ترتیب کو ایک واضح حقیقت کے طور پر دکھانے سے قاصر رہے۔ اور ہنوز یہ صورت برقرار ہے۔

راقم کے نزدیک خفائے نظم کی تین بڑی وجہیں ہیں۔ ایک وجہ قرآن مجید کا اسلوبِ بیان ہے جس میں بغایت ایجاز ہے اور اس کی وجہ سے عام اذہان تو کجا نہایت ذہین لوگ بھی جو غور و فکر نہیں کرتے، اس کے فہم سے قاصر رہتے ہیں۔ کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ جب قرآن کتاب ہدایت ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں سارے انسانوں کے لیے رہنمائی ہے (هُدًى لِلنَّاس) تو یہ کیونکر ممکن ہے؟ اہلِ علم جانتے ہیں کہ قرآن کا بڑا حصہ تذکیری تعلیمات پر مشتمل ہے اور ان کو ہر وہ شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے جو عربی زبان سے واقف ہے، فرمایا ہے: وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (سورۃ قمر:۱۷)، ''اس نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کردیا ہے، ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟'' لیکن کتاب کا وہ حصہ جو حقائق و معارف پر مشتمل ہے تدبّر کے بغیر ناقابلِ فہم ہے۔ ان مقامات کا تعلق عام لوگوں کے بجائے اربابِ علم و دانش سے ہے۔

اسلوب بیان میں ایجاز کا لحاظ رکھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ قرآن کا حجم کم ہوگیا اور حفاظ کے لیے اس کو زبانی یاد کرلینا آسان ہوگیا۔ قرآن کی حفاظت میں حفاظ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی خدمات سے کون واقف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس اسلوب کو اختیار کرنے کی ایک اہم وجہ اس کے مخاطبِ اوّل یعنی اہلِ عرب تھے۔

یہ بات معلوم ہے کہ عربی ادبِ جاہلی کا بڑا حصہ اشعار پر مشتمل ہے۔ عرب اپنے احساسات و جذبات کا اظہار زیادہ تر اشعار ہی میں کرتے تھے اور ان کا یہ قومی مزاج بن چکا تھا، وہ اس طرزِ کلام کے اس قدر خوگر تھے کہ خطبوں میں بھی اس کے اثر سے دامن بچا لے جانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مقفّٰی اور مسجّع عبارتیں ان کے خطبوں میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن کلام میں جو چیز سب سے زیادہ ان کو عزیز تھی وہ ایجاز تھا۔ چوں کہ اہلِ عرب نہایت ذہین اور ذکی الحس تھے اس لیے تفصیل وصراحت کے بجائے اشارہ وکنایہ میں اظہارِ مدعا کو پسند کرتے تھے اور اشعار میں اس کا خصوصی التزام کرتے تھے۔ ویسے بھی رمز وایما شعر کی روح ہے اور دنیا کا کوئی ادب اس خصوصیت سے خالی نہ ملے گا۔ عربوں کے اس قومی مزاج اور مذاقِ ادب کا لحاظ کرتے ہوئے قرآن میں ایجازِ بیان کو ترجیح دی گئی ہے۔ جاحظ نے اپنی کتاب 'کتاب الحیوان' میں اس کی مثالیں دیتے ہوئے لکھا ہے:

ولی کتاب جمعت فیه آیٔ من القرآن لنعرف بها ما بین الایجاز والحذف وبین الزوائد والفضول والاستعارات. فاذا قرأتها رأیت فضلها فی الإیجاز والجمع للمعانی الکثیر بالالفاظ القلیلة. فمنها قوله حین وصف خمر اهل الجنة "لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنزِفُونَ"، وهاتان الکلمتان جمعتا جمیع عیوب خمراهل الدنیا. وقوله عزّ وجل حین ذکر فاکهة اهل الجنة" لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ"، جمع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بهاتين الكلمتين جميع تلك المعاني[1]

''میں نے اپنی ایک کتاب میں قرآن کی کچھ آیات کو جمع کیا ہے تاکہ ان سے ہم کو ایجاز وحذف اور زوائد وفضول اور استعارات کی حقیقت معلوم ہو۔ جب تم ان آیتوں کو پڑھو گے تو تم کو ایجاز کے پہلو سے ان کی فضیلت و برتری معلوم ہوگی کہ کس طرح تھوڑے الفاظ میں بہت زیادہ معانی جمع کر دیے گئے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی شراب کی تعریف میں فرمایا ہے کہ ''نہ اس سے دردِ سر لاحق ہوگا اور نہ ہی بے خودی و بے عقلی پیدا ہوگی۔'' ان دو فقروں نے اہلِ دنیا کی شراب کی تمام خرابیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اسی طرح اللہ عزّ و جل نے اہلِ جنت کے پھلوں کے ذکر میں فرمایا ہے ''نہ وہ ختم ہوں گے اور نہ روکے جائیں گے۔'' ان دو فقروں میں سارے معانی آ گئے۔''

ظاہر ہے کہ جب کلام میں غایت درجہ کا ایجاز ہوگا تو پھر بکثرت محذوفات ہوں گے جیسا کہ ہم اشعار میں دیکھتے ہیں۔ اس لیے تفہیمِ معنی میں لازماً غور وفکر کی ضرورت پڑے گی۔ غور و تامّل سے ان روابط کا علم ہوگا جو کلام میں ارتباط پیدا کرتے ہیں۔ فہمِ کلام کے لیے ان روابط کو ٹھیک طور پر معلوم کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں غور وتدبر کی دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا

(سورۂ محمد۔ ۲۴)

''کیا وہ قرآن کی آیات میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہوئے ہیں۔''

---

[1] نظریۃ اعجاز القرآن عند عبدالقاہر الجرجانی، ص ۱۴۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری جگہ فرمایا ہے:

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ

اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿ (سورۃ صٓ۔۲۹)

''ہم نے تمہاری طرف ایک مبارک کتاب اتاری ہے تاکہ وہ

اس کی آیات میں غور وفکر کریں اور عقل منداس سے نصیحت

حاصل کریں۔''

اس تدبّر کا ایک اضافی فائدہ یہ ہے کہ اس سے ذہن وفکر کو جلا ملتی ہے اور اس کے پوشیدہ کمالات کو ظہور کا موقع ملتا ہے۔ بہر حال تدبّر کے بعد قرآن مجید کی تمام سورتیں اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے واضح اور مرتّب کلام معلوم ہوتی ہیں اور صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ ایجاز کے دامن میں معارف وبصائر کے کتنے خزانے مستور تھے۔ بطور مثال سورۂ رحمٰن کی درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

اَلرَّحْمٰنُ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۝

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ

يَسْجُدٰنِ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا

تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا

تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ۝ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ۝ فِيْهَا

فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ۝ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ

وَالرَّيْحَانُ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝

(سورۂ رحمٰن:۱۔۱۳)

''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا پھر اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند حساب کے ساتھ (چلتے) ہیں اور
پودے اور درخت سب (اللہ کے) مطیع ہیں۔ اور اسی نے آسمان
کو بلند کیا اور اس میں میزان رکھی۔ تم ناپ تول میں زیادتی نہ کرو
اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول کو گھٹاؤ مت۔ اور
اسی نے انسانوں کے لیے زمین کو (اس کی موزوں جگہ پر) رکھا
ہے۔ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت بھی جن (کے
پھلوں) پر غلاف ہوتا ہے۔ اور اس میں غلہ ہے جس میں بھوسا
بھی ہوتا ہے۔ اور اس میں خوشبو دار پھول ہیں۔ تم اپنے رب کی
کن کن نعمتوں اور کرشموں کا انکار کرو گے۔''

مذکورہ ابتدائی چار آیتوں میں جن تین بڑی عنایات کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق براہِ راست انسان کی ذات سے ہے، یعنی تعلیمِ قرآن، تخلیقِ انسان اور تعلیمِ بیان یعنی نطق۔ تعلیمِ قرآن کو مقدم کر کے بتایا گیا ہے کہ یہ خدائے رحمان کی سب سے بڑی عنایت ہے جس سے اس نے انسان کو نوازا ہے۔ لیکن دوسری نعمتوں کی طرح اس نعمت سے بھی وہ مکمل طور پر غافل ہے۔

ان عنایاتِ ثلاثہ کے ذکر کے بعد بتایا گیا کہ اس عالم کی ہر چیز خدا کے مقرر کردہ قوانین کی پیروی کر رہی ہے۔ کچھ اور نہیں تو انسان سورج اور چاند ہی کو دیکھ لے کہ وہ کس طرح خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ایک متعین فاصلے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہ کر شب و روز گردش میں مصروف ہیں۔ زمین کے اشجار و نباتات بھی اس کے ساختہ قوانین کے مطابق اپنے طبعی وظائف انجام دے رہے ہیں۔ (پھر وہ کیوں خود کو خدا کی اطاعت سے بالاتر سمجھتا ہے؟)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد رفعِ آسمان کا ذکر ہے کہ وہ کسی ظاہری ستون کے بغیر محض خدا کے حکم سے فضا میں قائم ہے۔ یہ حکم دراصل وہ میزان یعنی قانونِ عدل وتوازن ہے جو مختلف اجرامِ سماویہ کے قیام وبقا کا ضامن ہے۔ آگے ایک استطرادی[1] جملہ کے ذریعہ انسان کو اس کے ایک غیر عادلانہ رویّے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یعنی ناپ تول میں کمی۔ نصیحت کی گئی ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کیونکہ اس ناانصافی سے انسانی معاشرہ میں بے اعتدالی اور انتشار پیدا ہوگا۔

اس نصیحت کے بعد انسان کو زمین کی پیدائش اور ان نعمتوں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اس کی پشت پر ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ پھر سوال کیا گیا ہے کہ انسان ان تمام سماوی اور ارضی نعمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور ان سے مستفید ہونے کے باوجود آخر کیوں اپنے محسن ومنعم کے اعتراف سے گریز کرتا ہے اور اس کے دل میں شکر کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

اوپر سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیات کی جو تشریح کی گئی ہے اس سے بالکل عیاں ہوگیا کہ ان آیتوں کی ظاہری معنوی بے ترتیبی کی اصل وجہ ایجاز ہے۔ غور وفکر کے بعد اس اجمال کی تفصیل ہوگئی اور آیات کا معنوی ربط ونظم بالکل واضح ہوگیا۔

قرآن مجید کے نظم کے مخفی رہ جانے کی دوسری بڑی وجہ سورتوں بالخصوص بڑی سورتوں کی ترکیب وتنظیم ہے۔ چھوٹی سورتوں میں تقریبا ہر جگہ نظم واضح ہے، جہاں غیر واضح ہے وہاں تھوڑے سے غور وفکر سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان

---

[1] کلام میں خارج از بحث موضوع کی طرف التفات کو استطراد کہتے ہیں۔ یہ علم بلاغت ہی کا حصہ ہے۔ اس میں زیرِ بحث مضمون کی رعایت سے وہ بات کہی جاتی ہے جو اضافی ہونے کے باوجود بے حد بلیغ اور برمحل ہوتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورتوں میں جو نظام ہے وہ ایک ہی مرکزی موضوع کے گرد گھومتا ہے، یعنی موضوع اور نظام دونوں میں وحدت ہے۔ لیکن بڑی سورتوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ان میں نظام اور بنیادی موضوع تو ایک ہی ہے لیکن ان سے متعلق مضامین و مباحث کا دائرہ کافی وسیع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے عام قارئین کی نظروں سے نظام اور مرکزی موضوع دونوں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ذیلی مباحث کو جوڑنے والے روابط بیشتر جگہوں پر محذوف ہیں، اس لیے پڑھتے وقت آیات میں معنوی بے ربطی معلوم ہوتی ہے۔ اگر غور و تدبر سے ان روابط کو جن کے قرائن تقریباً ہر جگہ موجود ہیں، متعین کر لیا جائے تو ہر سورہ کا نظم بالکل واضح ہو جائے گا۔

تیسری وجہ اور یہ کم اہم نہیں ہے کہ قرآن کی نثر کوئی عام سی نثر نہیں ہے۔ وہ ایک منفرد نثر ہے، جس میں کلاسیکی عربی ادب کی تمام اعلیٰ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں نظم کے محاسن بھی موجود ہیں۔ پھر اس میں دقیق معانی ہیں۔ ان وجوہ سے بھی اس کے نظم میں تھوڑی سی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ لیکن جس وقت اہلِ فکر جو شعر و ادب کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں اور ساتھ ہی قرآن کی زبان اور اس کے اسالیب سے اچھی طرح واقف ہیں، تدبر کی نگاہ ڈالتے ہیں تو نہ صرف آیات کی ظاہری بے ربطی ختم ہو جاتی ہے بلکہ معانی کا ایک ایسا سحر انگیز عالم نظروں کے سامنے روشن ہو جاتا ہے، جس میں ہر طرف علم و حکمت کے موتی منظم طور پر آویزاں نظر آتے ہیں اور زبان سے بے اختیار صدا نکلتی ہے کہ یہ یقیناً اللہ کا کلام ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب دوم:

قرآن کی علمی ولسانی خصوصیات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزولِ قرآن کی غرض و غایت

خدا کی طرف سے ہر دور میں جو کتاب بھی بھیجی گئی اس کی بنیادی غرض ہدایت (Guidance) تھی، مثلاً تورات کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ جَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الخ

(سورۂ بنی اسرائیل۔۲)

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا۔"

ایک دوسری جگہ تورات اور انجیل دونوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ الخ

(سورۂ آل عمران۔۳،۴)

"اور اس نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل نازل کی تھی۔"

قرآن جو آخری آسمانی صحیفہ ہے، اس کے نزول کی غرض بھی نوعِ انسان کی ہدایت ہے۔ فرمایا ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ

(سورۂ بقرہ۔۱۸۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں
کے لیے ہدایت ہے۔"

اس ہدایت کا دائرہ کافی وسیع ہے لیکن اس کی روح کا نام قرآن کے الفاظ میں انذار و تبشیر ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا ہے:

تَبٰرَکَ الَّذِی نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ
نَذِیْرًا ۝ (سورۂ فرقان۔۱)

"بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان
نازل کیا تا کہ وہ اہلِ جہاں کے لیے ڈرانے والا ہو۔"

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَا اِلٰی رَجُلٍ مِّنْھُمْ اَنْ اَنْذِرِ
النَّاسَ (سورۂ یونس۔۲)

"کیا یہ بات لوگوں کے لیے باعثِ تعجب ہے کہ ہم نے انہی
میں سے ایک شخص کی طرف وحی بھیجی ہے کہ لوگوں کو
ڈرا دے۔"

ایک اور مقام پر ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّھُدًی وَّ
رَحْمَۃً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ ۝ (سورۂ نحل۔۸۹)

"اور ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے، جس میں ہر چیز کی
پوری وضاحت ہے، اور یہ ہدایت و رحمت اور بشارت ہے
فرماں برداروں کے لیے۔"

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ آیت بھی دیکھیں:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًاo

(سورۂ بنی اسرائیل۔۱۰۵)

"(اے محمد)، ہم نے تم کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

اس انذار وتبشیر کا مفہوم کیا ہے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کئی اہل علم نے قرآن کی غایتِ نزول کے تعین میں غلطی کی ہے اور بہت سے مسلمان گم راہی کا شکار ہوئے ہیں۔قرآن کی متعدد آیات میں انذار کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ شرک سے ڈرانا ہے۔شرک یہ ہے کہ خدائے واحد کو چھوڑ کر کسی اور کی عبادت وبندگی کی جائے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍo اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌo (سورہ ہود۔۱۔۲)

"الٓرٰ، یہ کتاب ہے، جس کی آیات کو (پہلے) محکم کیا گیا ہے، پھر ایک حکیم وخبیر خدا کی طرف سے اس (کے مجملات) کی تفصیل کی گئی ہے۔(اس کتاب کی دعوت یہ ہے کہ) ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت وبندگی نہ کرو۔ میں اس کی طرف سے تمہارے لیے ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔"

دوسری جگہ ہے:

اَتٰٓی اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

يُشْرِكُوْنَ ○ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ
يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ○

(سورۂ نحل۔۲،۱)

"جلدی نہ کرو، اللہ کا فیصلہ بس آ ہی گیا۔ اس کی ذات پاک اور اس شرک سے بہت بلند ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ وہ اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی کے ساتھ فرشتوں کو بھیجتا ہے کہ وہ (لوگوں کو شرک سے) ڈرا دیں (اور انہیں بتا دیں) کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پس وہ (مخلوق کی عبادت و بندگی سے) بچیں۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ
النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ

(سورۂ احقاف۔۲۱)

"تم قوم عاد کے بھائی کا ذکر کرو، جب کہ اس نے اپنی قوم کو جو احقاف (یعنی ریت کے مستطیل خم دار ٹیلوں) کے پاس رہتی تھی، ڈرایا ــــ اور ان سے پہلے اور اس سے پیچھے بہت سے ڈرانے والے (پیغمبر) گزر چکے تھے ــــ کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت و بندگی نہ کرو۔"

ان آیات سے واضح ہو گیا کہ سارے پیغمبروں نے اپنی اپنی قوم کو جس بات سے ڈرایا وہ شرک تھا۔ شرک صرف یہ نہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کو معبود قرار دے کر اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور مراسم عبودیت بجالائے جائیں۔ یہ تو شرکِ غلیظ ہے۔ شرک میں یہ بات بھی داخل ہے کہ خدا کے سوا کسی دوسرے کو کارساز سمجھ کر حاجتوں اور مصیبتوں میں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ کسی غیر خدا کو علی الاطلاق کارساز سمجھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ بھی مافوق الفطرت قدرت و اختیار کا مالک ہے، حالانکہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی دوسرا وجود بالذات اس نوع کی طاقت و اختیار کا مالک نہیں ہے، بلکہ وہ سرے سے کوئی طاقت و اختیار ہی نہیں رکھتے۔ اس لیے بندوں کا حقیقی معنی میں کارساز صرف اللہ ہے۔ انذار کے اس پہلو کو ایک سے زیادہ آیات میں واضح کردیا گیا ہے، مثلاً:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًاؕ (بنی اسرائیل۔۲)

"ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور حکم دیا کہ) میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔"

دوسری جگہ فرمایا ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا (سورۂ مزمل۔۹)

"(اللہ ہی) مشرق اور مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، (اس لیے) اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔"

قرآن میں بالواسطہ کارسازی کے تصور کی بھی نفی کی گئی ہے، یعنی یہ خیال کہ خدا کے کچھ مقرب بندے ہیں جو خود تو کسی کی حاجت روائی نہیں کرتے لیکن وہ اللہ سے کہہ کر بندوں کی مشکل کشائی کرتے ہیں۔ عربوں کا شرک یہی تو تھا۔ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اپنے قومی معبودوں کو اصلی کارساز نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو خدا کے ہاں ذریعہ اور وسیلہ سمجھ کر ان سے طالب مدد ہوتے تھے۔ اس بالواسطہ کارسازی کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (سورۂ زمر۔۲،۳)

''اللہ کی خالص اطاعت و بندگی کرو (اس میں کسی اور کی اطاعت و بندگی شامل نہ ہو)۔ سن لو کہ خالص عبادت و بندگی صرف اللہ کے لیے ہے۔ جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا حامی اور کارساز بنا رکھا ہے (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، (لیکن اس طرح کے اولیاء کا خدا کے ہاں کوئی وجود نہیں ہے)''۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (سورۂ یونس۔۱۸)

''یہ لوگ اللہ کے سوا ایسوں کی عبادت و بندگی کرتے ہیں جو (بالکل بے اختیار ہیں)، نہ کسی کو نقصان پہنچا سکیں اور نہ فائدہ، اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

(یعنی خدا سے کہہ کر ہمارے کام کرا دیتے ہیں)، کہہ دو، کیا تم
اللہ کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جو اس کو معلوم نہیں، نہ
آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔ وہ ان کے اس شرک سے
پاک اور بہت بلند ہے۔"

اللہ اپنے بندوں کا تنہا معبود اور ان کا بلاشرکتِ غیرے کارساز ہی نہیں ہے بلکہ حاکم علی الاطلاق اور مطاع بھی ہے۔ یہ بات کسی بندے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی واقعی مجبوری کے بغیر خدا کے نازل کردہ حکم و ہدایت کو چھوڑ کر کسی اور کے حکم کی اتباع کرے۔ یہ شرک فی الحکم ہے۔ انبیاء کے انذار میں یہ بات بھی شامل رہی ہے، جیسا کہ درج ذیل آیت میں فرمایا گیا ہے:

آلمّٓصٓ ٥ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِکَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ٥ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ
اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ط

(سورۂ اعراف۔۱۔۳)

" آلمّٓصٓ، یہ کتاب ہے جو تمہارے پاس بھیجی گئی ہے۔ پس یہ
تمہارے لیے کسی تنگی کا باعث نہ ہو۔ (یہ اس لیے نازل کی گئی
ہے کہ) تم اس کے ذریعہ سے (لوگوں کو) ڈراؤ۔ اور یہ
مومنوں کے لیے یاددہانی ہے۔ (اے لوگو!) تم اس چیز کی
پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس بھیجی
گئی ہے اور اس کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ
کرو، (وہ تمہاری رہ نمائی سے قاصر ہیں)۔"

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انذار کا دوسرا اہم پہلو روزِ آخرت کی باز پرس سے خبردار کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اس دن کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ فرمایا ہے: وَاَنْذِرْھُمْ یَوْمَ الْحَسْرَۃِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ (سورۂ مریم۔۳۹) "انھیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا دو جب (کسی رو رعایت کے بغیر) ہر معاملے (یعنی جزا و سزا) کا فیصلہ کر دیا جائے گا"۔

قرآن کے نزول کی دوسری غرض تبشیر ہے، یعنی خدا کے فرماں بردار اور اطاعت شعار بندوں کو آخرت میں کامیابی کی بشارت دینا۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

طٰسٓ o تِلْکَ اٰیٰتُ الْقُرْاٰنِ وَ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ o ھُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ o الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ o (سورۂ نمل۔۱۔۳)

"طٰس، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں، یہ ان مومنوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔

ایک دوسری جگہ انذار و تبشیر کے مذکورہ دونوں مفاہیم کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے۔ فرمایا گیا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا o قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَ یُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ اَجْرًا حَسَنًا o مَّاکِثِیْنَ فِیْہِ اَبَدًا o وَّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا o (سورۂ کہف۔۱۔۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

"تعریف ہے اس اللہ کے لیے جس نے اپنے بندے پر
کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی کوئی کجی نہیں رکھی،
درست اور متوازن، تاکہ وہ (مجرموں کو) خدا کے سخت
عذاب سے ڈرا دے اور ان مومنوں کو خوش خبری دیدے جو
نیک کام کرتے ہیں کہ ان کے لیے بہترین بدلہ ہے (یعنی
ایسی جنت) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور ان لوگوں کو بھی
ڈرا دے جو کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے۔"

معلوم ہوا کہ تبشیر کا تعلق اہلِ ایمان سے ہے جو عملِ صالح رکھتے ہوں۔ ان کو بشارت دی گئی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے صلہ میں جنت میں داخل کیے جائیں گے، جہاں وہ ہمیشہ آرام و سکون کی زندگی گزاریں گے۔ اور انذار کا تعلق مجرموں سے ہے جو کھلم کھلا برائیاں کرتے ہیں اور خدا سے بالکل نہیں ڈرتے۔ اس کا تعلق مشرکوں سے بھی ہے جو اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت و بندگی کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ ان کے کارساز ہیں۔ ایسے مجرموں اور مشرکوں کو متذکرہ بالا آیات میں 'باس شدید' یعنی جہنم کی خوفناک سزا سے ڈرایا گیا ہے۔

اوپر انذار کے مفہوم کی جو وضاحت کی گئی ہے اسی کو اصطلاحاً توحید کہا جاتا ہے۔ تمام انبیاء کے دین کا مغز و جوہر توحید کی تعلیم رہی ہے، جس میں بعد میں شرک داخل ہو گیا۔ قرآن نے اس توحیدی تعلیم کو شرک سے پاک کیا اور ساری دنیا کو خدائے واحد کی عبادت و بندگی کی دعوت دی اور شرک کی تمام انواع سے خوب اچھی طرح باخبر کر کے اس سے دور رہنے کی تاکید کی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید کے بنیادی علوم

قرآن میں پانچ قسم کے علوم کا ذکر ہوا ہے۔ان علوم کو علماء کی تشریح کے مطابق علم تذکیر بآلاء اللہ، علم احکام، علم تذکیر بایام اللہ، علم مباحثہ، اور علم تذکیر بالموت کہا جاتا ہے۔آسان زبان میں ان کو علم عقائد، علم احکام، علم تاریخ، علم موعظت اور علم آخرت کہا جاسکتا ہے۔بعض علماء نے ان علوم کو بالاختصار علم توحید، علم رسالت اور علم آخرت بھی کہا ہے۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن کے جملہ علوم کی زمرہ بندی اس طرح کی ہے[1]:

(۱) علم احکام: واجب، مستحب، مکروہ، حلال وحرام۔ان احکام کا تعلق عبادت، تدبیر منزل (معاشرت) اور سیاست مدن وغیرہ سے ہے۔

(۲) علم مناظرہ: چاروں گم راہ فرقوں، یعنی یہود ونصاریٰ، مشرکین اور منافقین کے بارے میں بحث۔

(۳) علم تذکیر بآلاء اللہ: اللہ کی نشانیوں اور انعامات کا ذکر، یعنی تخلیق ارض وسما اور خدا کی صفات کاملہ کا بیان۔

(۴) علم تذکیر بایام اللہ: ان واقعات کا ذکر جو خدا کی اطاعت کرنے والوں کی جزا اور مجرموں کی سزا سے متعلق ہیں۔

(۵) علم تذکیر بالموت: حشر ونشر، حساب، میزان اور جنت ودوزخ کا بیان۔

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، باب اول، ص ۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جدید دور کے علماء و فضلاء نے علومِ قرآن کی تقسیم ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے کی ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال نے حکیم عرشی امرت سری سے ایک بار دورانِ گفتگو فرمایا کہ "علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید نے ان چاروں کی طرف رہ نمائی کی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ وحی ہے اور وہ ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا ذریعہ آثارِ قدیمہ اور تاریخ ہے جس پر قرآن کی آیات متوجہ کر رہی ہیں۔ 'سیروا فی الارض': اس آیت نے علمِ آثار کی بنیاد رکھ دی جس پر مسلم مصنفین نے عالی شان قصر تعمیر کیے۔ 'ذکرھم بایّام اللّٰہ'، یہ آیت تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کیے۔ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے جس کا آغاز 'وفی انفسکم افلا تبصرون' سے ہوتا ہے۔ اس علم کو حضرت جنید بغدادیؒ اور ان کے رفقاء نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفۂ فطرت ہے، جس پر قرآن کی بے شمار آیات دلالت کر رہی ہیں، مثلاً 'والی الارض کیف سطحت'۔ اس پر علماء اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔ (اس کے بعد) علامہ اقبال نے کہا کہ موجودہ دنیا اپنے تمام علوم و تہذیب اور صنائع و بدائع سمیت مسلمانوں کی مخلوق ہے[۱]۔"

راقم کے نزدیک قرآن کے علومِ پنجگانہ کی مذکورہ تشریح میں کئی نقائص اور کمیاں ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کو کسی افراط و تفریط کے بغیر اس طرح بیان کیا جائے جس طرح قرآن میں ان کا ذکر آیا ہے۔ علماء کی تقسیمِ علوم اور ان کی اصطلاحوں کو باقی رکھتے ہوئے آگے علومِ قرآن کی وضاحت کی گئی ہے۔

۱؎ ماہنامہ البیان، امرت سر، دسمبر ۱۹۳۶ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق ان بے شمار نعمتوں سے ہے جو اس کائنات کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی ہیں اور انسان ان سے شب و روز متمتع ہوتا ہے۔لیکن اکثر لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ان نعمتوں سے مستفید ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے خالق و محسن کو پہچانیں اور اس کے احسانات کے اعتراف کے ساتھ اس کا حق بھی ادا کریں۔قرآن میں بکثرت مقامات پر ان نعمتوں کی طرف انسانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے تا کہ انھیں محسنِ حقیقی کا عرفان حاصل ہو۔مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝ (سورۂ عبس:۲۴۔۳۲)

"انسان کو چاہیے کہ اپنی غذا کو دیکھے،ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو پھاڑا، پھر اس کے اندر غلّے ،انگور ، ترکاریاں، زیتون ،کھجوریں، گھنے باغ اور میوے اور چارے اُگائے ،تمہارے لیے سامانِ زیست کے طور پر اور تمہارے جانوروں کے لیے بھی۔"

دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ (سورۂ نحل۔۶۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''اور تمہارے لیے چوپایوں میں بھی جائے غور وفکر ہے۔ ان کے شکم میں گوبر اور خون کے درمیان سے ہم تمھیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (سورۂ قصص: ۷۱۔۷۳)

''اے پیغمبر ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی غور کیا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ رات ہی طاری رہنے دے تو اللہ کے سوا کون ہے جو تمہارے لیے روشنی لائے۔ کیا تم اس بات پر کان نہ دھرو گے؟ ان سے کہو، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ قیامت تک تم پر ہمیشہ دن ہی رہنے دے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمھیں رات لا کر دے، جس میں تم آرام پاؤ۔ کیا تم (خدا کی اس نعمت کو) دیکھتے نہیں؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں سکون و

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

راحت پاؤ اور دن میں اپنے رب کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو اور تاکہ تم (ان نعمتوں پر) اس کا شکر ادا کرو۔"

ایک اور مقام پر بڑے بلیغ اسلوب میں فرمایا گیا ہے:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ اَفَرَءَیْتُمُ النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ ۝ ءَ اَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۝ (سورۂ واقعہ: ۶۳۔۷۳)

"کیا تم نے کبھی سوچا، یہ جو تم کھیتی کرتے ہو اس کو تم (زمین سے) اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم باتیں ہی بناتے رہو کہ ہم تو تاوان زدہ ہو گئے، بلکہ ہماری قسمت ہی خراب ہے۔ کیا کبھی تم نے سوچا، یہ پانی جو تم پیتے ہو اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کو ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنا دیں۔ (جب حقیقت یہ ہے تو) پھر تم شکر گزار کیوں نہیں بنتے؟ تم نے کبھی سوچا، یہ آگ جو تم سلگاتے ہو، اس کے درخت تم نے پیدا کیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں؟ ہم نے اس کو یاد دہانی
اور صحرا کے مسافروں کے لیے فائدے کی چیز بنایا ہے۔"

جن نعمتوں کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا وہ خدا کی بالکل کھلی ہوئی نعمتیں ہیں اور ہر عالم و جاہل ہر روز انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ محسنِ حقیقی کے عرفان سے قاصر رہتے ہیں۔

علمِ تذکیر بآلاءِ اللہ کا دوسرا حصہ وہ ہے جو کائنات کے آثار و حوادث سے تعلق رکھتا ہے۔ آثار و مظاہرِ فطرت دراصل خدا کے علم و قدرت کی نشانیاں ہیں۔ اگر ایک صاحب علم انسان کھلے دل و دماغ کے ساتھ آثارِ کائنات پر غور و فکر کرے تو وہ ہر قدم پر محسوس کرے گا کہ یہ کائنات کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ ایک عزیز و قدیر اور علیم و حکیم ہستی کا کارخانۂ خلق و ایجاد ہے، جہاں ہر طرف حیران کن علم کی جلوہ گری اور بے مثال نظم و قانون کی حکمرانی ہے۔ ایک ہی طاقت و ارادہ ہے جو ہر جگہ غالب و نافذ ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک نظامِ عمل کی پابند ہے اور ان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے دائرہ سے ایک ثانیہ کے لیے بھی قدم باہر نکال سکیں۔

قرآن کی متعدد آیات میں کائنات کی اس حکیمانہ خوبی اور اس کے حیرت انگیز نظم و قانون کی طرف تمام ہوش مند انسانوں کو متوجہ کیا گیا ہے اور اربابِ علم و عقل کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے تاکہ اس ہستیِ برتر کا انھیں عرفان حاصل ہو جو اس کائناتِ بے کراں کی خالق و آمر ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل آیات بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

(۱) اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ
بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا
وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ ۢ بَهِيْجٍ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

○ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ○ (سورۂ ق: ۶۔۸)

''کیا انھوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا؟ ہم نے اسے کیسا بنایا اور کس خوبی سے اس کو آراستہ کیا ہے۔ اس میں کہیں کوئی شگاف نہیں ہے۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ نصب کیے اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش نما چیزیں اُگا ئیں۔ اس میں سامانِ دید ہے اور یاددہانی بھی، ہر اس بندے کے لیے جو (خدا کی طرف) رجوع کرنے والا ہو۔''

(۲) وَفِي الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ○ (سورۂ رعد۔۴)

''اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے کئی خطے ہیں، انگور کے باغ ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، جن میں کچھ اکہرے (ایک تنہ والے) اور کچھ دہرے (دو تنہ والے)، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر مزہ میں ہم ایک کو دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ ان چیزوں میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں۔''

(۳) وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ○

(سورۂ روم۔۲۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف بھی ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اصحابِ علم و دانش کے لیے۔''

(۴) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (سورۂ فاطر: ۲۷، ۲۸)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے ہم نے پھل پیدا کیے، جن کے رنگ مختلف ہیں۔ اور پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے وہی لوگ اس سے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ بے شک اللہ بڑا زبردست اور بہت بخشنے والا ہے۔''

ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن میں خدا شناسی کے جو دلائل دیے گئے ہیں وہ انسان کی عقل اور اس کی فطرت دونوں کو بغایت اپیل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ اگر عقل پختہ اور تربیت یافتہ ہو اور خارجی اثرات سے مغلوب ہو کر کج رو اور کج اندیش نہ ہوگئی ہو تو کائنات کے آثار و حوادث کے مشاہدہ سے وہ حقیقت الحقائق (Ultimate truth) تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ اسی بات کو اوپر کی آیت میں 'انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء' کہا گیا ہے۔

میں یہاں دورِ جدید کے ایک ممتاز ریاضی داں اور ماہرِ علمِ فلکیات (Astronomer) سر جیمس جینز[1] (Sir James Jeans) سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر

---

[1] سر جیمس ایک ممتاز ماہرِ علم ہیئت، عظیم ریاضی داں اور ایک جید عالم طبیعیات (Physicist) گزرے ہیں۔ ایک عالمِ طبیعیات کی حیثیت سے 'نظریۂ گیس' اور 'اشعاع' کے باہمی تعلق اور آزاد الکٹران کے مختلف پہلوؤں پر ان کی فاضلانہ تحقیقات اور عالمانہ آراء ناقابل فراموش ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنسی دنیا ایک عظیم المرتبت سائنس داں کی حیثیت سے ان کے کارہائے نمایاں کو ہمیشہ یاد کرتی رہے گی۔

۱۹۰۶ء میں وہ کل ۲۸ سال کی عمر میں رائل سوسائٹی کے فیلو منتخب کر لیے گئے۔ ۱۹۱۷ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے ان کے ایک مضمون ''نظریۂ تخلیق اور کوکبی حرکیات کے مسائل'' پر انھیں آدمس پرائز دے کر ان کی عزت افزائی کی۔ کیمبرج فلاسوفیکل سوسائٹی نے بھی 'نظریۂ گیس'، 'اشعاع' اور 'سیاراتی نظام کے ارتقاء' پر ان کی گراں قدر تحقیقات پر انہیں ہاپ کنس پرائز عطا کیا۔ سائنس کی دنیا میں ایک ماہر علمِ فلکیات کی حیثیت سے ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ نظریۂ تخلیق سے متعلق ان کی فاضلانہ تحقیقات پر سر آتھر ایڈنگٹن نے انہیں رائل اسٹرونومیکل سوسائٹی کا سنہری تمغہ پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۷ء تک وہ اس سوسائٹی کے صدر رہے۔ ہندوستان میں کلکتہ اور بنارس جیسی معروف یونیورسٹیوں نے انھیں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں۔ سائنس سے متعلق انڈین ایسوسی ایشن نے ۱۹۳۷ء میں انھیں 'مکرجی میڈل' دیا۔ اسی سال بنگال کی ایشیائی سوسائٹی نے بھی انہیں میڈل دے کر ان کا رتبہ بڑھایا۔ ۱۹۲۸ء میں 'نائٹ ہوڈ' اور ۱۹۳۹ء میں 'آرڈر آف میرٹ' جیسے بلند اعزازات سے نوازے گئے۔

سر جینز نے مختلف موضوعات پر متعدد عالمانہ کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

Mysterious Universe, Astronomy and Cosmogony. Universe Around us. Introduction to the Kinetic Theory of Gases.

یہ ان کی آخری تصنیف ہے جو انھوں نے ۱۹۴۲ء میں لکھی۔ اس کے ۴ سال بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ (مصنف)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کروں گا جس کے راوی علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"۱۹۰۹ء کا ذکر ہے، اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی۔ میں کسی کام سے باہر نکلا تو جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمز جینس پر نظر پڑی جو بغل میں انجیل دبائے چرچ کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، 'تم کیا چاہتے ہو؟' میں نے کہا دو باتیں۔ اوّل یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں داب رکھا ہے۔ سر جیمز اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرۂ آفاق عالمِ سائنس گرجا میں عبادت کے لیے جا رہا ہے، یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمز لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔

چنانچہ میں شام کو ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک ۴ بجے لیڈی جیمز نے باہر آ کر کہا، 'سر جیمز تمہارے منتظر ہیں'۔ اندر گیا تو ایک چھوٹی سی میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے، کہنے لگے، 'تمہارا کیا سوال تھا؟' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اجرامِ آسمانی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پہنائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریا و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت و خشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں، اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے، عنایت اللہ خاں! جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لگتی ہے اور جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں ''تو بہت بڑا ہے'' تو میری ہستی کا ہر ذرّہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گنا زیادہ کیف ملتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خاں، تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمز کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا، جناب والا! میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے، اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ فرمایا، ضرور۔ چنانچہ میں نے یہ آیت پڑھی:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا
وَغَرَابِيبُ سُودٌ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ
مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهُ كَذَالِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ
الْعُلَمٰٓؤُا (سورۂ فاطر۔ ۲۸)

''پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں، (بعض) سفید اور سرخ، ان کے بھی رنگ مختلف ہیں، اور (بعض) بہت گہرے سیاہ رنگ کے۔ اور اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔ اللہ کے بندوں میں سے صرف اہلِ علم ہی اس سے ڈرتے ہیں''۔

یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمز بولے، کیا کہا، اللہ سے صرف اہلِ علم ڈرتے ہیں، حیرت انگیز، بہت عجیب۔ یہ بات مجھے پچاس برس مسلسل مطالعہ و مشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی، محمد کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے؟ اگر

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمدؐ اَن پڑھ تھے۔ انھیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہو سکتی۔ انھیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی۔ بہت خوب، بہت عجیب[1]۔"

علامہ مشرقی سے پروفیسر جیمز کی مذکورہ گفتگو ایک دفترِ بصیرت ہے اور ہر صاحبِ نظر کے لیے ایک ایمان افروز سبق۔ اس عجیب وغریب واقعہ کا ذکر مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم نے بھی اپنے رسالہ 'صدق' مورخہ ۲رفروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں کیا ہے۔

(۲) علمِ احکام کا تعلق بندۂ مومن کے طرزِ عمل سے ہے۔ خدا کی ذات پر ایمان لانے کے بعد اس پر بقدرِ استطاعت خدا کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی پابندی لازم ہو جاتی ہے۔ یہ احکام دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق اعمالِ پرستش سے ہے۔ یہ احکامِ عبادات ہیں اور ناقابلِ تغیّر ہیں۔ دوسرے وہ احکام ہیں جن کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ اس زمرہ میں معاشرتی، اقتصادی وسیاسی اور اخلاقی احکام داخل ہیں۔ اخلاقی احکام کو چھوڑ کر بقیہ احکام میں حالاتِ زمانہ کی تبدیلی کے لحاظ سے حسبِ ضرورت ترمیم واضافہ ہو سکتا ہے۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔

قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول وکلیات بیان کیے گئے ہیں اور بعض کے جزئیات بھی۔ ان تمام کلی اور مخصوص جزئی احکام کے معنی ومفہوم کو قرآن میں مختلف طریقوں سے خوب اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے۔ اب کسی شخص کو خواہ وہ اپنے وقت کا کتنا ہی بڑا عالم اور فقیہ کیوں نہ ہو، یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے معنی ومفہوم میں کوئی ادنیٰ حذف واضافہ کرے۔ علماء اور فقہاء کا کام صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کے کلی اصولوں کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتوں کی روشنی میں زمانہ

---

[1] نقوش، شخصیات نمبر، ص ۱۲۰۸، ۱۲۰۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے احوال وظروف کی رعایت کے ساتھ ہر دور میں جزئی احکام کی تخریج کریں۔

(۳) علمِ تذکیر بایّامِ اللہ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، دراصل علمِ تاریخ ہے۔ اس کو مذہبی اصطلاح میں علمِ قصص کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مذہبی تاریخ ہے جس میں اخلاقی اور دعوتی عنصر غالب ہے۔ اس اعتبار سے اس تاریخ کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آخری نبیؐ کے عہد تک کی اہم قوموں اور ان میں مبعوث ہونے والے قابل ذکر پیغمبروں کے احوال و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ان واقعات کے بیان کرنے کی ایک بڑی غرض انذار اور عبرت آموزی ہے۔ چنانچہ ایک طرف آخری نبی کے مخاطبین کو بتایا گیا ہے کہ یہ کوئی نئی دعوت نہیں ہے، بلکہ پچھلی دعوتوں ہی کی تجدید اور ان کی تکمیل ہے، تو دوسری طرف حق کے منکرین کو خبردار کیا گیا ہے کہ سنت اللہ کے مطابق ایک دن ان کو بھی اسی انجامِ بد سے دوچار ہونا ہے جس سے ان سے پہلے کی سرکش قومیں دوچار ہو چکی ہیں۔ اسی کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین وتشفی دی گئی ہے کہ حق و باطل کی اس لڑائی میں حق کو فتح حاصل ہوگی اور باطل سرنگوں ہوگا۔ اس باب میں اللہ کی سنت ناقابلِ تغیر ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ
فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِي هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّ
ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِينَ ٥ (سورۂ ہود۔ ۱۲۰)

"اور رسولوں کے احوال میں سے یہ سارے قصے ہم تم سے
بیان کرتے ہیں (اور غرض یہ ہے) کہ ان کے ذریعہ سے ہم
تمہارے دل کو تقویت دیں، (اس کو جمائے رکھیں) اور جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حق بات ان قصوں میں ہے وہ تم تک پہنچ چکی ہے اور (اس میں) مومنوں کے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ۝ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ (سورۂ یوسف۔ ۱۱۰)

"یہاں تک کہ جب پیغمبر بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ (کفار پر عذاب آنے کے معاملے میں) ان سے حق بات نہیں کہی گئی، (ٹھیک اس وقت) ہماری مدد ان کے پاس پہنچ گئی، پھر (اس عذاب سے) ہم نے جس کو چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے پھرتا نہیں (یعنی واقع ہو کر رہتا ہے)۔ ان (انبیاء) کے قصوں میں عقل مندوں کے لیے عبرت ہے، (وہ ان سے سبق لیں)۔"

تاریخی واقعات کے بیان سے قرآن کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ اہلِ ایمان اس سے یاددہانی حاصل کریں، جیسا کہ سورۂ ہود کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا ہے "ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ"۔ اس سلسلے میں قرآن میں خاص طور پر اہلِ کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کے واقعات مکرر بیان کیے گئے ہیں تاکہ مسلمان دیکھ لیں کہ ان کی دینی اور دنیوی بربادی کے اسباب کیا تھے۔ مثلاً یہودیوں کے مذہبی افتراق اور فرقہ بندی کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ (سورۃ آل عمران۔۱۰۵)

''ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو متفرق ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا جب کہ ان کے پاس حق کے واضح دلائل آ چکے تھے۔''

عیسائی علماء اور درویشوں کے خلافِ توحید افعال اور ان کی دنیا پرستی کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

(سورۃ توبہ۔۳۴)

''اے ایمان والو، اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (یعنی توحید) سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ (حبِ دنیا میں مبتلا ہونے کی وجہ سے) سونا اور چاندی کو ذخیرہ کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اس کو خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خبر دے دو۔''

قرآنی قصص کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت اجمال کے ساتھ بیان

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

کیے گئے ہیں، یہاں تک کہ بعض قصوں میں صرف اشارے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ صرف تین سورتوں، یوسف، کہف، مریم، میں واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اجمال ہو یا تفصیل دونوں با مقصد ہیں۔ جہاں اجمال ہے وہاں ہدایت کے نقطۂ نظر سے اجمال ہی مطلوب ہے اور جہاں تفصیل ہے وہاں تذکیر کا پہلو متقاضی تھا کہ اس کو کھول کر بیان کیا جائے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انسان کی فطرت میں قصہ گوئی کی طرف طبعی میلان پایا جاتا ہے اور قصوں سے اس کو یک گونہ شغف ہے۔ اگر داستان دلچسپ ہو تو اس کا یہ طبعی میلان اور بڑھ جاتا ہے۔ قصوں کی تفصیل سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کا ذہن داستان کی نیرنگی اور بوالعجبی میں کھو جاتا ہے اور اس کا تذکیری پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے۔ چونکہ قرآن کا مقصد داستان گوئی نہیں ہے، اس لیے ہر جگہ واقعات کے بیان میں اختصار کو ترجیح دی گئی ہے تاکہ عبرت و موعظت کا پہلو جو مقصودِ داستان ہے، نگاہوں سے اوجھل نہ ہو۔

بہت سے مفسرین نے قرآنی قصوں کے اجمال کی اس غرض و غایت کو نہیں سمجھا اور ان کی تفصیل کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کے مجمل قصوں کی تفصیل یا وضاحت کی غرض سے موضوع احادیث اور اسرائیلی روایات کو کسی نقد و تحقیق کے بغیر نقل کر دیا ہے، حتیٰ کہ بیہودہ روایات کو بھی قبول کر لیا گیا ہے۔ مثلاً تفسیرِ ابن کثیر میں جو تفسیری طبری کا ملخص ہے، ہاروت اور ماروت کی داستانِ عشق دیکھ لیں[1]۔ اسی طرح 'ولقد فتنا سلیمان والقینا علیٰ کرسیه جسدًا' (سورۂ ص۔۳۴) کی تفسیر میں بالکل بے سرو پا روایات بیان کی گئی ہیں[2]۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے لکھا ہے کہ 'لقد

---

1. تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۵۹ 2. تفسیر ابن کثیر، ج ۷، ص ۲۰۱ تا ۲۰۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فتنا سلیمان ؑ کا محل جب کہ حدیث میں انشاء اللہ کے ترک کرنے اور اس پر مواخذہ کا ذکر ہوا ہے تو کیا ضرورت تھی کہ صخرہ کا قصہ بیان کیا جائے[1]۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے کسی مجمل قصہ کی تفصیل کرنا کوئی کارِ گناہ ہے۔ اصولی طور پر یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے کہ قرآن میں جہاں قصوں کے بعض جزئیات چھوڑ دیے گئے ہیں ان کی تلاش و جستجو میں نہ پڑا جائے کیونکہ تذکیر کے لحاظ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ترک خود اس بات کی دلیل ہے کہ متروک اجزاء غیر ضروری تھے۔

قرآنی قصص کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اختلافی امور کو نظر انداز کر کے قصے کے مرکزی خیال کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ کہف میں اصحابِ کہف اور ان کے کتوں کی تعداد اور غار میں ان کی مدتِ قیام کے بارے میں پہلے سے مختلف رائیں تھیں (آیات ۲۲ تا ۲۵)، اس لیے قرآن نے ان کو مبہم ہی رہنے دیا اور ان غیر ضروری باتوں کو نظر انداز کر کے قصہ کی اصل روح کو نمایاں کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ نیکو کار بندوں کی مدد کے سلسلے میں خدا کا وعدہ سچا ہے (سورۂ کہف۔۲۱)۔ لیکن مفسرین نے حسب عادت اس اختلافی مسئلے میں قیاس آرائی سے گریز نہیں کیا ہے۔

غیر نزاعی واقعات میں کسی اجمال کی تفصیل غیر محمود نہیں ہے۔ جہاں محسوس ہو کہ اجمال کی تفصیل سے واقعہ زیادہ قابلِ فہم اور اس کا تذکیری پہلو مزید نمایاں ہوگا، یا اس سے قرآن کا اعجاز ظاہر ہوگا، یا اس سے قرآن کے کسی بیان کی تصدیق ہوگی تو وہاں تفصیل و توضیح میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مثلاً درج ذیل آیات کی تفصیل مفید ہوگی:

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۷۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) انّ الارض یرثها عبادی الصالحون (سورۂ انبیاء۔۱۰۵)

(۲) وَقَضَیْنا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین (سورۂ بنی اسرائیل۔۴)

(۳) ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد (سورۂ صف۔۶)

اسی طرح سورۂ ابولہب، سورۂ کوثر اور سورۂ روم میں جو تاریخی پیشین گوئیاں ہیں ان کی تفصیل میں بھی کوئی مضائقہ نہیں بلکہ یہ تفصیل مفید ہوگی کیونکہ اس سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ان کے علاوہ وہ قصے جو قرآن میں مجمل لیکن تورات میں تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں، ان کی تفصیل احتیاط کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔اس سے تفہیم آیت میں مدد ملے گی۔ابتدائی چار سورتوں (بقرہ، آل عمران، نسآء، مائدہ) میں اہلِ کتاب سے متعلق ایسے کئی واقعات ہیں جو اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن میں بیان کردہ بعض واقعات تورات کے بیان سے مختلف ہیں۔اگر عقلی و علمی اور تاریخی شواہد کی روشنی میں ان واقعات کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے قرآنی بیان کی صداقت ثابت ہوگی۔مثلاً آدم وحوا کا قصہ اور سلیمان علیہ السلام کی طرف علم سحر کی نسبت وغیرہ۔

(۴) علمِ مباحثہ کا تعلق اس طریقۂ استدلال سے ہے جو قرآن میں مشرکینِ عرب، منافقینِ مدینہ اور یہود و نصاریٰ کے عقائد و اعمال کی تردید میں اختیار کیا گیا ہے۔اس کو معروف علمِ مناظرہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا جو تمام تر جدلی اور کلامی نوعیت کا علم ہے۔اس سے مذہبی نزاع تو کیا ختم ہوگی، اس میں کچھ مزید اضافہ ہو جائے گا۔ قرآن کا طریقۂ بحث و مجادلہ بالکل فطری اور سادہ مگر عقلی براہین پر مبنی ہے۔مثلاً تعددِ الٰہ کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے وہ کتنی مضبوط اور فیصلہ کن ہے۔فرمایا گیا ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لو کان فیھما الھۃ الا اللّٰہ لفسدتا (سورۂ انبیاء۔۲۲)

''اگر آسمانوں اور زمین میں ایک اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ ہوتا تو ان کا نظم و انتظام درہم برہم ہو جاتا۔''

شرک کی تردید میں آفات وحوادث کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ان نازک مواقع پر اکثر انسان سب سہاروں کو بھول کر خدا ہی کو پکارتے ہیں، بالخصوص ان حالات میں جب نجات کے سارے ظاہری اسباب و وسائل معدوم نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں شرک نہیں، توحید ہے۔۔ ماحول کے غلط اثر کی وجہ سے یہ اصل فطرت محجوب ہو جاتی ہے لیکن مصائب اس عارضی حجاب کو اٹھا دیتے ہیں اور اس کی اصل فطرت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کی طرف قرآن کی متعدد آیات میں اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ حَتّٰٓي اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَاۗءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاۗءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّھُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڬ لَىِٕنْ اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○

(سورۂ یونس۔۲۲)

''وہ اللہ ہی تو ہے جو تم کو خشکی اور تری دونوں میں سفر کراتا ہے، حتیٰ کہ (بعض اوقات) جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو بادِ موافق کے سہارے لے کر چلتی ہیں اور وہ اس سے شادمانی محسوس کر رہے ہوتے ہیں کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(اچانک) بادِ مخالف کا ایک جھونکا آتا ہے اور سمندر کی لہریں
ہر طرف سے ان پر آپڑتی ہیں اور وہ یقین کر لیتے ہیں کہ
بالکل گھر چکے ہیں، (اس وقت) وہ خلوص اور للّٰہیت کے
ساتھ خدا کو پکارتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے نجات
دی تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے"

عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی تردید میں جو عقلی دلیل دی گئی ہے وہ مختصر لیکن انتہائی مسکت ہے۔ ارشاد ہوا ہے: کانایا کلان الطعام (سورۂ مائدہ۔ ۷۵) "وہ دونوں (یعنی مریم و عیسٰی) کھانا کھاتے تھے۔" یہودیوں کو اپنی تمام بد اعمالیوں اور نافرمانیوں کے باوجود یہ گھمنڈ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسحاق علیہما السلام ان کے باپ تھے۔ ان کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذرّیت سب یہودی تھے۔ اور عیسائی کہتے تھے کہ وہ سب عیسائی تھے (سورۂ بقرہ۔ ۱۴۰)۔ ان کی اس خوش گمانی کے جواب میں نہایت مختصر لیکن دل میں اتر جانے والی بات کہی گئی ہے۔ فرمایا ہے:

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ
وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (سورۂ بقرہ۔ ۱۴۱)

"یہ (خدا پرستوں کی) ایک جماعت تھی جو (دنیا سے)
جا چکی، اس کے لیے اس کی کمائی ہے اور تمہارے لیے
تمہاری کمائی، تم سے ان کے کاموں کے بارے میں نہیں
پوچھا جائے گا۔"

اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں دونوں نے جہالت اور مذہبی تعصب کی وجہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے ہدایت کے معاملے کو ایک قومی اور نسلی معاملہ بنا دیا تھا اور دعوے سے کہتے تھے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں جو یہودی اور عیسائیوں کے بقول عیسائی ہیں۔ ان کے اس زعمِ باطل کی تردید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ کو پیش کیا گیا جن کو یہ دونوں قومیں اپنا مقتدا مانتی تھیں، اور کہا گیا کہ ہدایت یاب صرف وہ لوگ ہیں جو ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرتے ہیں۔ ابراہیمؑ توحید کے علم بردار تھے جب کہ وہ شرک کی راہ میں چل رہے ہیں۔ اس دلیلِ قاطع کو قرآن کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ
اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(سورۂ بقرہ۔۱۳۵)

"وہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا عیسائی تو ہدایت پالو گے۔
کہہ دو (کہ ایسا نہیں ہے)، ہدایت پر وہ ہے جس نے ابراہیم
کا طریقہ اختیار کیا جو سب سے کٹ کر خدا کا ہو رہا تھا اور وہ
مشرک نہیں تھا، (جب کہ ان کا دامن شرک سے آلودہ ہے)"

قرآن میں مثبت مباحثہ کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں۔ فرمایا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ

(سورۂ نحل۔۱۲۵)

اپنے رب کے (سیدھے) راستے کی طرف بلاؤ، حکمت
(یعنی علمی دلائل) اور عمدہ نصیحت سے، اور (اگر بحث کی
نوبت آجائے تو پھر) اچھے ڈھنگ سے بحث کرو۔"

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس مجادلۂ حسنہ کی ایک عمدہ مثال قرآن ہی میں موجود ہے۔ اس بحث کا تعلق حضرت ابراہیمؑ اور بادشاہِ بابل سے ہے جو خود کو رب سمجھتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا، میں بھی یہ کام کرتا ہوں (بقرہ۔ ۲۵۸)۔

دیکھیں، بادشاہ کا یہ جواب حقیقتِ واقعہ کے خلاف تھا لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس پر اعتراض کرنے کے بجائے کہ اس سے بحث دوسرے رخ پر چلی جاتی، ایک دوسری عقلی دلیل دی کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تو اس کائنات کا رب (حاکم اعلیٰ) ہے تو اس کو مغرب سے نکال دے۔ یہ سن کر وہ لا جواب ہو گیا: فبھت الذی کفر ط (سورۂ بقرہ۔ ۲۵۸)

مباحثہ کا ایک عمدہ طریقہ 'مباہلہ' بھی ہے۔ یہ طریقہ اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب فریقِ مخالف کسی طرح حق بات ماننے کے لیے تیار نہ ہو اور اپنے خیال کی صحت پر مصر ہو۔ قرآن میں اس طریقہ کا ذکر ہوا ہے۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد جس میں ان کے علماء بھی تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لیے مدینہ آیا۔ ان کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا اور ان کے ساتھ نہایت کریمانہ سلوک کیا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دورانِ گفتگو ان کو اسلام کی دعوت دی اور الوہیتِ مسیح کے عقیدے کی غلطی ان پر واضح کی[1]۔ لیکن انھوں نے انکار کیا اور کہا کہ ان کے عقیدے میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس لیے وہ اسلام قبول نہیں کر سکتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کج بحثی سے گریز

---

[1] عیسائی علماء نے اپنے عقیدے کے اثبات میں حضرت عیسیٰ کے بن باپ کے پیدا ہونے کو بطور دلیل پیش کیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ کے تو باپ نہیں تھے، حضرت آدم کے تو نہ باپ تھے اور نہ ماں، پھر وہ کیسے پیدا ہو گئے اور پیدا ہو کر انسان ہی رہے، خدا نہیں ہو گئے۔ (دیکھیں سورۂ آل عمران۔ ۵۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہوئے ان کو مباہلہ کی دعوت دی۔ قرآن میں ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝ (سورۂ آل عمران۔ ٦١)

"اب جب کہ تمہارے پاس (مسیح کے باب میں قطعی) علم آ چکا ہے تو جو شخص اس کے بعد بھی تم سے اس معاملہ میں حجت کرے تو کہو کہ آؤ ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لیں اور تم بھی اپنے بچوں اور عورتوں کو بلا لو اور خود ہم بھی اور تم بھی (ان میں شامل ہوں)، پھر ہم سب عاجزی سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو"۔

لیکن عیسائی علماء مباہلہ کے لیے تیار نہیں ہوئے، کیونکہ انھیں اپنے عقیدے کی سچائی پر دل سے یقین نہیں تھا۔ یہ کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے عقیدے کی صحت پر کامل یقین و اطمینان رکھتے ہوں۔ اور یہ لوگ اس یقین سے محروم تھے۔

(۵) قرآن کے علومِ پنجگانہ میں سے آخری چیز علمِ تذکیر بالموت ہے۔ اس علم کا تعلق وقوعِ قیامت، حشر و نشر، پرسشِ اعمال اور جزا و سزا یعنی جنّت اور دوزخ کے احوال و مقامات کے بیان سے ہے۔ عالمِ آخرت کے احوال سے واقفیت کا ذریعہ صرف وحی ہے، کیونکہ عقل اس عالم کے ادراک سے قاصر ہے۔ اس علم کے مطابق ایک دن عالمِ مادی نیست و نابود ہو جائے گا اور ایک دوسرا عالم وجود میں آئے گا جہاں بندوں کو ان کے دنیوی اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چونکہ اس عالمِ غیر مادّی کے احوال و معاملات کی تفصیل و توضیح انسانی زبان میں جو مادّی خواص رکھتی ہے، ممکن نہیں تھی، اس لیے قرآن میں ان کے بیان میں تمثیل و مجاز کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور غیر مشہود حقائق کو ممکن حد تک مشہود و محسوس صورت میں پیش کیا گیا ہے تاکہ بندے اس عالم اور اس کی نعمتوں کو بقدرِ فہم و استعداد سمجھ سکیں اور ان کے دلوں میں ان کے حصول کی تمنا پیدا ہو اور وہ دنیا کے لذائذ میں کھو کر نہ رہ جائیں۔

اس دوسری دنیا کے اثبات میں قرآن نے جو عقلی دلائل دیے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق فطرت کے حقائق اور مظاہر سے ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا گیا ہے کہ اس کائناتِ مادّی کی ہر چیز 'زوجین' یعنی جوڑوں کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ اس کلّیہ سے اس عالم کی کوئی چیز مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہر شے نہ صرف اپنے وجود کے لیے 'زوجین' کی محتاج ہے بلکہ اس کا مقصدِ تخلیق بھی ان ہی پر منحصر ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝
فَفِرُّوٓا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝

(سورۂ ذاریات۔ ۴۹، ۵۰)

''ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو، پس اللہ کی طرف تیز گامی کرو، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھول کر ڈرا دینے والا ہوں''۔

اس آیت میں 'زوجین' سے مراد ایسے جوڑے ہیں جو اپنی ساخت اور خواص کے لحاظ سے باہم اختلاف رکھتے ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان میں کامل درجہ کا اتحاد و موافقت ہے، ایسا غیر معمولی اتحاد کہ اس کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کی ایک عمدہ مثال خود مرد اور عورت کا وجود ہے، یہ جوڑا اپنی تمام خلقی اور نفسیاتی اختلافات کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہے۔ زوجین کے اس اتحاد و اختلاط کو قرآن میں وجود خدا کی ایک بڑی نشانی کہا گیا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖۤ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْۤا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۝ (سورۂ روم۔۲۱)

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور غم گساری پیدا کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں''۔

جب اس کائنات کی ہر چیز کی تخلیق اصولِ زوجین پر ہوئی ہے تو پھر ماننا ہوگا کہ اس عالمِ مادّی کا بھی ایک زوج ہے اور وہ عالم آخرت ہے۔ اور یہی انسان کے سفرِ زندگی کی آخری منزل ہے۔ سورۂ ذاریات کی مذکورہ بالا آیات میں 'تذکرون' اور 'ففروا الی اللّٰہ' کے جملوں سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آخرت یعنی عالمِ غیر مادّی کا وجود انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کو مانے بغیر اس کے بہت سے مسائل کا کوئی حل ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس دنیا میں ظلم و زیادتی کے اندوہ ناک واقعات برابر پیش آتے رہے ہیں اور موجودہ دور بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ قانون اور عدالت کے باوجود بسا اوقات مجرموں کو ان کے جرائم کی سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو وہ مکمل سزا نہیں ہوتی۔ مثلاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک شخص سیکڑوں افراد کو ناحق قتل کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں اس جرم کی بڑی سے بڑی سزا اس کے سوا اور کیا ہوگی کہ اس قاتل کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن کیا اس سزا کو سیکڑوں لوگوں کے قتل کی سزا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو ایک مقتول کی سزا ہوئی، بقیہ مقتولین کی سزا اسے کہاں ملی۔ اس کے جرم کی مکمل سزا تو یہ ہوگی کہ اس کو سومرتبہ قتل کیا جائے، اور یہ اس دنیا میں ممکن نہیں ہے۔ یہ صورت حال خود مطالبہ کرتی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور دنیا ہو جہاں مجرموں کو ان کے جرائم کی مکمل سزا دی جائے۔ اور اسی کا نام عالمِ آخرت ہے۔

قرآن کی زبان

اصحابِ علم وادب جانتے ہیں کہ قرآن اپنے عہد کی مستند ترین زبان میں نازل ہوا تھا۔ اس کو قرآن میں عربِی مبین کہا گیا ہے (سورۂ نحل۔۱۰۳)، یعنی ایک ایسی زبان جو اپنے مفردات ومرکبات دونوں کے لحاظ سے بالکل واضح، سلیس وشستہ اور اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے انتہائی فصیح وبلیغ ہے۔ اس کے اسالیبِ ابلاغ میں کہیں کوئی لسانی ژولیدگی اور معنوی ابہام نہیں ہے (سورۂ زمر۔۲۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نہ صرف اپنے عہد کی فصیح وبلیغ زبان کے تمام محاسن کا جامع ہے بلکہ اس نے اس زبان کو حسنِ معنی اور طرفگیِ ادا کے لحاظ سے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں تک عرب کے فصحاء وبلغاء کی رسائی ان کی تمام کوششوں کے باوجود نہ ہو سکی، جیسا کہ قرآن کی تحدی سے ثابت ہے (سورۂ بقرہ۔۲۳)۔

تاریخ وسیر کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کے کئی مایۂ ناز شعراء نے اعتراف کیا کہ یہ بشر کا کلام نہیں ہے۔ سبعۂ معلقہ کے آخری شاعر لبید نے اسلام لانے کے بعد شعر کہنا چھوڑ دیا۔ جب لوگوں نے اس ترک کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا: ابعد القرآن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''کیا قرآن کے بعد بھی''۔

قرآن کی زبان کتنی عمدہ، شیریں اور اثر سے بھری ہوئی ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت مختلف عربی قبائل میں تیزی کے ساتھ پھیلنے لگی تو اس کی روک تھام کے لیے ولید بن مغیرہ کے ہاں جو ایک عمر رسیدہ مگر ذہین وزیرک سردار تھا، ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس مسئلہ پر غور ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام کو کہانت کہیں کہ وہ اس سے ملتا جلتا ہے۔ ولید نے کہا: ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے۔ خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں اسرار و رموز اور قوافی کا اہتمام اور کاہنوں کی خفیہ باتوں اور ان کی قافیہ بندی میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ کسی نے رائے دی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مجنون کہا جائے، یعنی انھیں مرضِ جنون لاحق ہوگیا ہے۔ ولید نے کہا: ہم جنونیوں کو پہچانتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں خلجان اور وسوسے بھرے ہوتے ہیں، یہ صورت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نظر نہیں آتی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شاعر کہا جائے۔ ولید نے کہا: شاعری کی تمام اقسام اور ان کی خصوصیات کو ہم جانتے ہیں اور ان کی پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کلام اپنی خصوصیات کے اعتبار سے شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ اس رائے کو کوئی نہیں مانے گا۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا: ہم نے ساحروں کو بارہا دیکھا ہے۔ وہ منتر پڑھ کر پھونکتے اور گرہیں لگاتے ہیں۔ محمد ایسا نہیں کرتے۔ یہ سن کر حاضرینِ مجلس نے کہا کہ اے ابوعبد شمس، اب تمہیں بتاؤ کہ کیا کیا جائے، ہم سب تمہاری رائے مانیں گے۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں بلا کی شیرینی ہے۔ یہ ایک ایسا درخت ہے جس کی جڑیں گہرائی میں

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

اتری ہوئی اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہوئی ہیں۔ اس لیے تم نے جو رائیں دی ہیں ان کو کوئی تسلیم نہیں کرے گا اور ان کو جھوٹ پر محمول کرے گا۔ ہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس معنی میں جادوگر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام میں جادو ہے۔ جس طرح جادو سے دل میں محبت و نفرت کے جذبات پیدا کر دیے جاتے ہیں، اسی طرح ان کا کلام بھی قریبی رشتوں تک میں تفریق کر دیتا ہے۔ اس میں باپ کو بیٹے سے اور بیٹے کو باپ سے جدا کر دینے کی صلاحیت ہے۔ سب نے ولید کی اس تجویز کو مان لیا[1]۔

اس سلسلے میں ایک دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ قبیلہ دوس کا ایک سردار طفیل بن عمرو عمرہ کی غرض سے مکہ آیا۔ وہ اپنے قبیلہ کا ایک بڑا باصلاحیت آدمی اور شاعر بھی تھا۔ اس نے سنا کہ ایک شخص کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے۔ اس نے مختلف لوگوں سے اس بارے میں دریافت کیا۔ ہر شخص نے اس کو مشورہ دیا کہ وہ ان سے نہ ملے کیونکہ ان کے پاس ایک ایسا جادو ہے جس سے وہ میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتے ہیں۔ یہ سن کر وہ خاموش ہو رہا۔ لیکن چند روز کے بعد تجسّس کے فطری جذبہ سے مجبور ہو کر اس نے آپ سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک دانا و بینا آدمی ہوں، شاعر ہوں، شاعری کی پرکھ کا مجھ میں ملکہ ہے، بھلا یہ ساحر کس طرح مجھے بہکا سکتا ہے۔ بہرحال وہ آپ کے پاس پہنچا اور کلام سنانے کی درخواست کی۔ آپ نے اس کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ وہ یہ کلام سن کر اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً مسلمان ہو گیا۔ جب گھر واپس لوٹا تو اس کی کوشش سے اس کی والدہ اور بیوی اور اس کے قبیلہ کے چند دوسرے لوگ بھی مسلمان ہو گئے[2]۔

---

[1] السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام، ج ۱، ص ۲۷۰، مزید دیکھیں، مستدرک، حاکم، ج ۲، ص ۵۰۶

[2] السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام، ج ۱، ص ۳۸۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان واقعات سے بالکل واضح ہے کہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا اس کو اس عہد کے لوگ معنی و بیان کے لحاظ سے عربی ادب کا کامل ترین نمونہ تصور کرتے تھے اور اس کی اثر انگیزی کے دل سے معترف تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی اس غیر معمولی فصیح و بلیغ زبان کو آج کس طرح سمجھا جائے؟ ملحوظ رہے کہ آج کل عرب ممالک میں جو عربی بولی اور سمجھی جاتی ہے اور عربی کے ادبی جرائد و رسائل میں لکھی جاتی ہے وہ قرآن کے الفاظ و اسالیب اور محاورات سے بالکل مختلف ہے۔

قرآن کی زبان کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ دورِ جاہلیت کے شعراء اور خطیبوں کے کلام کی مراجعت کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ قرآن کے غریب الفاظ کے معنی جاننے کے لیے شعراء عرب کے کلام کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نافع بن الازرق نے ان سے پوچھا کہ آیت "عن الیمین وعن الشمال عزین (سورۂ معارج۔ ۳۷) میں "عزین" کے کیا معنی ہیں؟ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ اس کے معنی حلق الرفاق کے ہیں اور یہ شعر پڑھا:

فجاؤا یھرعون الیه حتی　　　　یکونوا حق منبره عزینا

انھوں نے پھر پوچھا کہ آیت "ابتغوا الیه الوسیلة (سورۂ مائدہ۔ ۳۵) میں "وسیلة" کے کیا معنی ہیں؟ آپ نے فرمایا، حاجت، اور یہ شعر پڑھا:

ان الرجال لھم الیك وسیلة

ان یأخذوك تکحّلی و تخضّبی[۱]

ابوبکر بن الانباری راوی ہیں کہ ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "الشعر دیوان العرب، فاذا خفی علینا الحرف من القرآن الذی انزله الله بلغة

---

[۱] الاتقان فی علوم القرآن، ج۲، ص۲۶۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

العرب، رجعنا الی دیوانھا، فالتمسنا ذلک منہ[1] ”شاعری عربوں کا دیوان ہے۔ جب قرآن جسے اللہ نے لغت عرب میں نازل کیا ہے، کے کسی لفظ کے معنی ہم پر واضح نہیں ہوتے تو ہم اس کے دیوان کی مراجعت کرتے ہیں اور اس میں اس کو تلاش کرتے۔“

ابن الانباری نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ: اذا سألتم عن شئی من غریب القرآن فالتمسوہ فی الشعر، فان الشعر دیوان العرب[2] ”اگر تم قرآن کے کسی اجنبی لفظ کے معنی معلوم کرنا چاہو تو اس کو اشعار عرب میں تلاش کرو، اس لیے کہ شاعری عربوں کا دیوان ہے۔“

خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ قرآن کے غریب الفاظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے اشعار کی طرف مراجعت کی تاکید کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے سورۂ نحل کی آیت ’ اویا خذھم علی تخوف ‘ میں ’تخوف‘ کے معنی صحابہ سے پوچھے۔ قبیلہ ہذیل کے ایک آدمی نے کہا کہ یہ ہمارے لغت کے مطابق ہے اور اس کے معنی تنقص کے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم اشعارِ عرب سے کوئی دلیل پیش کرسکتے ہو۔ اس نے کہا، ہاں اور یہ شعر پڑھا :

تخوّف الرجلُ منھا تامعاً قردا

کما تخوف عُودَ النبعة السّفنُ

یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا: علیکم بدیوانکم لاتضلوا، قالوا، ما دیواننا ؟ قال : شعر الجاھلیة ،فان فیہ تفسیر کتابکم و معانی کلامکم[3]

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۶۱ [2] ایضاً

[3] الموافقات، علامہ شاطبی، ج ۲، ص ۸۸، مزید دیکھیں، انوار التنزیل ،بیضاوی، ج ۱، ص ۴۵۹

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

"تم اپنے دیوان کی مراجعت کرو، گم راہ نہیں ہوگے۔ لوگوں نے کہا، ہمارا دیوان کیا ہے؟ فرمایا جاہلیت کی شاعری، اس میں تمہاری کتاب کی تفسیر ہے اور تمہارے کلام کے معانی بھی۔"

یہ تو قرآن کے غریب الفاظ کے فہم کا معاملہ ہے۔ یہاں یہ بات فراموش نہ ہو کہ قرآن محض کوئی ادب کی کتاب نہیں ہے کہ اس کو عربی کے ادب عالیہ کی مدد سے پورے طور پر سمجھ لیا جائے۔ وہ ادب کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی علمی لٹریچر بھی ہے، ایسا لٹریچر جس کی کوئی نظیر عربوں میں موجود نہیں تھی۔ پھر اس لٹریچر کا دائرہ محض عقائد و عبادات اور چند اخلاقی نصائح تک محدود نہیں ہے۔ اس میں قدیم اقوام کی داستانِ عروج و زوال ہے تو قدیم آسمانی صحائف کی بنیادی تعلیمات کا ذکر اور بہت سے انبیاء کی دعوتوں کا تعارف بھی ہے، اس میں اگر ایک طرف خدائی شریعت کے اصول و کلیات کا حکیمانہ بیان ہے، تو دوسری طرف فطرت کے متنوع آثار و مظاہر پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، نیز انفس و آفاق سے متعلق بعض حقائق سے حیران کن حد تک پردہ اٹھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں بہت سے مابعد الطبیعیاتی مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ جس کتاب کی ترکیب اتنے مختلف الاشکال عناصر سے ہوئی ہو اس کی زبان کی تفہیم کے لیے ادب و لغت کے علاوہ بھی بہت کچھ درکار ہے۔ جو لوگ قرآن کی زبان سمجھنا چاہتے ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران درج ذیل امور کو دھیان میں رکھیں:

(۱) ہر زبان بالخصوص اس کے ادب میں اصلی الفاظ کے ساتھ مجازی الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں، جن سے ابلاغِ معنی میں آسانی ہوتی ہے اور کلام میں حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی مجازی الفاظ کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) واذاخلوا الی شیاطینهم قالوا انامعکم (سورۂ بقرہ۔۱۴)

(۲) وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا (سورۂ بقرہ۔۱۰۲)

(۳) ماھذا بشراً ط إن ھذا الّا ملک کریم (سورۂ یوسف۔۳۱)

(۴) وداعیاً الی اللّٰہ باذنہ وسراجاً منیراً (سورۂ احزاب۔۴۶)

(۵) قدجاء کم من اللّٰہ نورو کتاب مبین (سورۂ مائدہ۔۱۵)

ان آیات میں شیاطین، مَلک، سراج اور نور کے الفاظ مجازی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ گوکہ استعارہ اور تمثیل وتشبیہ میں باعتبارِ معنی ومفہوم فرق ہے، لیکن قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان سب میں لفظ کے اصلی معنی مراد نہیں ہوتے۔ اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) فی قلو بھم مرض فزادھم اللّٰہ مرضا (بقرہ۔۱۰)

(۲) ختم اللّٰہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ ابصارھم غشاوۃ (بقرہ۔۷)

(۳) اولٰئک کالانعام بل ھم اضلُ (اعراف۔۱۷۹)

(۴) مثل نورہ کمشکاۃ فیھا مصباح (سورۂ نور۔۳۵)

(۵) واشتعل الراسِ شیبا (سورۂ مریم۔۴)

ان آیات میں مرض، ختم، غشاوۃ، انعام، مشکوٰۃ، مصباح اور اشتعالِ راس کے الفاظ بطور استعارہ وتشبیہ استعمال ہوئے ہیں اور ان کے مجازی معنی مراد ہیں۔

دوسری مذہبی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی خدا کی ذات وصفات کے بیان میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ مجازی معنی میں ہیں، کیونکہ حقیقتِ مطلق کی تعبیر مجازی الفاظ کے بغیر ممکن نہیں ہے، بقول غالب:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

چنانچہ قرآن میں خدا کے لیے 'ید' (بل یداہ مبسوطتان: مائدہ۔۶۴)، 'وجہ' (فاینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ: بقرہ۔۱۱۵) اور 'عین واعین' (واصبر لحکم ربک فانک باعیننا: سورۂ طور۔۴۸) جیسے الفاظ مجازی معنی میں لائے گئے ہیں۔ اسی طرح لوحِ محفوظ (سورۂ بروج۔۲۲)، کرسی (سورۂ بقرہ۔۲۵۵)، اور عرش (اعراف۔۵۴) جیسے الفاظ بھی مجازی مفہوم رکھتے ہیں۔

لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ قرآن میں جہاں کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کیا گیا ہے وہاں کوئی قرینہ ایسا ضرور ہوگا جو اس کے مجازی مفہوم کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس بات کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے بہت سے علماء اور مفسرین نے مجازی الفاظ کو اصلی الفاظ سمجھ کر ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔

(۲) عربی کے بہت سے الفاظ مشترک المعنی ہیں، یعنی ان کے ایک سے زیادہ معنی ہیں۔ اس صورت میں سیاق کلام کی روشنی میں طے ہوگا کہ کون سے معنی مراد ہیں۔ مثلاً عربی میں ایک لفظ 'قسورہ' ہے، جس کے ایک معنی رامی اور دوسرے اسد یعنی شیر کے ہیں۔ قرآن میں ایک جگہ ہے: کانھم حمرٌ مستنفرۃ ٥ فرّت من قسورۃ (سورۂ مدثر۔۵۰،۵۱)۔ اس آیت میں 'قسورۃ' شیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کی دلیل 'حمرٌ مستنفرۃ' ہے۔ اسی طرح ایک لفظ 'عسعس' ہے، جس کے ایک معنی رات کے آنے (اقبالِ لیل) اور دوسرے معنی رات کے جانے (ادبارِ لیل) کے ہیں۔ سورۂ تکویر میں ہے: والیل اذا عسعس٥ والصبح اذا تنفّس٥ (آیت ۱۷،۱۸)۔ اس آیت میں 'عسعس' رات کے جانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کی دلیل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

'والصبح اذا تنفس' کا جملہ ہے۔

مشترک المعنی لفظ کی ایک اور مثال 'ایمان' ہے، جو اِفعال کے وزن پر مصدر ہے۔ یہ امن سے ماخوذ ہے۔ لغت میں اس کے ایک سے زیادہ معنی ہیں، مثلاً امن دینا، تصدیق کرنا، اعتماد کرنا اور یقین کرنا۔[1] قرآن میں یہ لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ کس جگہ کون سا معنی مراد ہے، اس کا فیصلہ سیاق کلام اور نظائر سے ہوگا۔ مثلاً سورۂ بقرہ کے بالکل شروع میں یہ لفظ بتکرار استعمال ہوا ہے۔ اگر نظم کلام پر نظر ہو تو بآسانی متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں ایمان بمعنی ایقان ہے، جیسا کہ سلسلۂ بیان کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے: وبالآخرۃ ھم یوقنون۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں 'یومنون' استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس مقام پر 'یومنون' کی جگہ 'یوقنون' لا کر واضح کر دیا گیا کہ ایمان کا مطلب یقین کرنا ہے۔

اس اسلوب کلام سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قرآن میں جہاں متعلقاتِ ایمان (اجزائے ایمان) کا ذکر ہوا ہے وہاں کسی استثناء کے بغیر ایمان کے معنی یقین کرنے کے ہیں۔ نظائر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر ایمان کے بالمقابل ریب کا لفظ آیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے معنی یقین کے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے:

اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّارَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايُؤْمِنُوْنَ ○ (سورۂ مومن۔ ۵۹)

''قیامت کی گھڑی آ کر رہے گی، اس میں کوئی شبہ نہیں، لیکن

---

[1] روح المعانی، علامہ آلوسی، ج ۱، ص ۱۱۱۔ مزید دیکھیں، تفسیر نظام القرآن (سورۂ والعصر)، مولانا حمید الدین فراہی، ص ۳۴۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بہت سے لوگ یقین نہیں کرتے۔"

دوسری جگہ ہے:

اِنَّمَا یَسْتَاذِنُکَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ
وَارْتَابَتْ قُلُوْبُھُمْ فَھُمْ فِیْ رَیْبِھِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ○

(سورۂ توبہ۔۴۵)

"وہی لوگ تم سے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت چاہتے
ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور ان کے دل
شک میں پڑے ہوئے ہیں، پس وہ اپنے شک ہی میں بھٹک
رہے ہیں۔"

ایک اور مثال لفظ کفر ہے۔اس کے اصل معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: کفر درعہ بثوبہ "اس نے اپنی زرہ کو کپڑے میں چھپایا۔" یہیں سے اس لفظ میں انکار اور ناشکری کے معنی پیدا ہوئے۔قرآن میں ایک سے زیادہ آیتوں میں یہ ناشکری کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً ایک جگہ ہے:

قَالَ ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْٓ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ط
وَمَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ (سورۂ نمل۔۴۰)

"اس نے کہا کہ یہ میرے پروردگار کا ایک فضل ہے تاکہ وہ
میری آزمائش کرے کہ میں اس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔
جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی (فائدے کے) لیے شکر
کرتا ہے۔"

لیکن بہت سے مفسرین نے اس معنی سے پہلوتہی کی ہے اور اکثر جگہوں پر کفر کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ترجمہ انکار ہی کیا ہے جو معروف معنی ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاقِ کلام کو نظر انداز کر دیا، یا اس معنی کو ترجیح دی جو پہلی نظر میں ان کے ذہن میں آگیا، یا جس سے ان کے کسی مخصوص خیال یا نظریہ کی تائید ہوتی ہو۔ سیاقِ کلام اور نظائر سے صرفِ نظر کر کے کسی مشترک المعنی لفظ کے مفہوم کو متعین کرنا ایک فاش غلطی ہے۔ اس سے ہر حال میں اجتناب لازمی ہے۔

(۳) ضروری ہے کہ لفظ کے معروف معنی مراد لیے جائیں، شاذ معنی سے احتراز کیا جائے۔ مثلاً ایک لفظ 'شویٰ' ہے (نزاعة للشوىٰ: معارج۔۱۶)۔ اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ مولانا فراہی نے اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کلام عرب میں اس کے معروف معنی لحم الساق (پنڈلی کا گوشت) ہیں۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے سورۂ معارج کی آیت "نزاعة للشوىٰ" کے ترجمہ میں "شویٰ" سے مراد کلیجہ لیا ہے۔ حالانکہ اگر سیاق کلام کو مد نظر رکھا جائے تو موقع منکرین کے دوزخ میں داخل ہونے کا نہیں بلکہ عذاب کے قرب کا تذکرہ ہے۔ فرمایا ہے: سال سائل ...... الخ (معارج ۱۔۱۶)۔ ...... اس روز ان کا کوئی دوست پرسان نہ ہوگا۔ دوزخ کفار کو اپنی طرف بلائے گی اور اپنی ایک لپٹ سے ان کی پنڈلی کا گوشت اڑا لے جائے گی۔ جہاں تک کلیجہ نکالنے کا تعلق ہے اس کے متعلق قرآن نے کہیں خبر نہیں دی ہے۔

جن لوگوں نے شویٰ کو سر کی کھال کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بھی غلطی کی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ بہت کم آیا ہے اور جہاں کہیں آیا ہے وہاں بھی معروف معنی ہی کا احتمال ہے۔ بالفرض اگر شویٰ کے یہ دونوں معنی برابر قرار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دیے جائیں جب بھی ان میں سے وہی معنی اختیار کیا جائے گا جو نظم سے زیادہ موافقت رکھتا ہو اور باقی قرآن سے بھی اس کے دلائل ملتے ہوں[۱]۔‘‘

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ قرآن میں کہیں کوئی لفظ شاذ معنی میں استعمال ہی نہیں ہوا ہے۔ کئی آیتوں میں اس کی نظیر ملتی ہے۔ مثلاً سورۂ رحمٰن کی آیت: و النجم والشجر یسجدان (آیت ۵) میں ’نجم‘ کا ترجمہ سارے ہی مفسرین نے ستارہ کیا ہے جو اس کے معروف معنی ہیں۔ لیکن یہاں یہ شاذ معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی وہ پودا جو زمین پر پڑا رہتا ہو۔ شجر کی رعایت سے اس کے یہی معنی مناسب ہیں نہ کہ ستارہ جو معنا بے جوڑ ہے۔

ایک دوسری مثال یہ آیت ہے: حتی یلج الجمل فی سمّ الخیاط (سورۂ اعراف ۔۴۰)۔ اس میں ’جمل‘ کا ترجمہ عام طور پر اونٹ کیا گیا ہے لیکن یہاں اس کے معنی موٹی رسی کے ہیں، جو شاذ معنی ہے۔ اردو میں تو بلاشبہ ’’سوئی کے ناکہ سے اونٹ کا گزر جانا‘‘ کا محاورہ مستعمل ہے، لیکن عربی میں ایسا نہیں ہے۔ اس محاورے میں بہت زیادہ مبالغہ ہے۔ اس کے برخلاف ’’سوئی کے ناکے سے موٹی رسّی کا گزرنا‘‘ بطور محاورہ زیادہ مناسب ہے۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ کسی لفظ کے شاذ معنی اسی وقت لیے جائیں گے جب آیت میں اس معنی کے لینے کا کوئی واضح قرینہ موجود ہو، جیسا کہ سورۂ رحمٰن کی مذکورہ آیت میں ’نجم‘ بمعنی پودا لینے کی اس لیے گنجائش ہے کہ شجر کے ساتھ اس معنی کی مناسبت بالکل واضح ہے۔

(۴) قرآن کی زبان بالکل وہی ہے جو اہل عرب بولتے اور سمجھتے تھے اور ان ہی لسانی اصول و قواعد پر مبنی ہے جو ان میں مروّج تھے۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو

---

[۱] تفسیر قرآن کے اصول، علامہ حمید الدین فراہیؒ، ص ۱۸۷۔۱۸۹

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

جائے گی۔ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں خیال کرتے تھے اور اس خیال کے تحت عربی میں ان کے لیے مونث کا لفظ 'ملائکۃ' مستعمل تھا۔ قرآن نے عربوں کے اس باطل خیال کی تردید تو کی لیکن لفظ کی تانیث کو برقرار رکھا، مثلاً سورۂ آل عمران (آیت ۴۲) میں ہے: واذ قالت الملٰئکۃ یا مریم ۔ اسی طرح پاگل شخص کے بارے میں اہل عرب کا خیال تھا کہ اس میں بدروح یا شیطان حلول کر جاتا ہے اور اس کو تکلیف دیتا ہے۔ ان کے ادب میں بھی یہ خیال راہ پا گیا تھا۔ چنانچہ کسی مخبوط الحواس کی ذہنی کیفیات کو دکھانے کے لیے مسِ شیطان کی تعبیر اختیار کی جاتی تھی۔ عربوں کا یہ خیال فی نفسہٖ حقیقتِ واقعہ کے خلاف تھا لیکن قرآن نے اس طرزِ تعبیر کو قائم رکھا۔ چنانچہ سود خوروں کی منفی ذہنی حالت کی تصویر کشی کے لیے یہی تمثیلی اسلوب اختیار کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْنَ یَاْ کُلُوْنَ الرِّبٰو لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ
یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۔ (سورۂ بقرہ۔۲۷۵)

"جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (روز قیامت) بالکل اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر باولا کر دیا ہو۔"

یہی معاملہ دوسرے امورِ بلاغت کا ہے۔ قرآن میں تشبیہ و تمثیل، استعارہ، مجاز و کنایہ میں بھی ان ہی اصولوں کی پابندی کی گئی ہے جو عربی زبان میں مستعمل تھے۔ اس لیے ان سے وہی معنی و مفہوم مراد لیے جائیں گے جن کو اہل عرب سمجھتے تھے۔ اس کا اطلاق استقرائی و الزامی اور خطابی دلائل پر بھی ہوگا۔

(۵) قرآن کی متعدد آیات میں توحید و رسالت اور آخرت کے مضامین کے اثبات میں انفس و آفاق کے بعض اہم حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت بلاشبہ ان میں سے بہت سے حقائق کی صحیح تفہیم ممکن نہ تھی۔ لیکن یہ بھی قرآن کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اعجاز ہے کہ اس نے ان حقائق کو ایسے جامع الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہے کہ وہ ہر دور میں عالم و جاہل دونوں کے لیے حسبِ استعداد قابل فہم اور اطمینان بخش ہے۔ موجودہ عہد میں سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے ان حقائق کی تفہیم اب زیادہ آسان ہوگئی ہے اور حقیقت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر قرآن میں رحم مادر کے اندر جنین (Foetus) کی تخلیق کے مختلف مدارج کا ذکر ہوا ہے (سورۂ مومنون۔۱۳،۱۴)، اس میں ایک تخلیقی درجہ 'علقۃ' ہے (ثم خلقنا النطفة علقة)۔ مفسرین نے علقہ کا ترجمہ مختلف طور پر کیا ہے، کسی نے خون کا لوتھڑا (اشرف علی تھانویؒ)، کسی نے جما ہوا خون (شیخ الہند)، کسی نے لوتھڑا (مولانا مودودیؒ)، اور کسی نے جنین (صاحب تدبر)۔ عربی تفسیروں میں بھی علقہ کے یہی معنی بیان کیے گئے ہیں۔ بظاہر ان میں سے ہر معنی اس وقت تک صحیح معلوم ہوتا ہے جب تک جنین کے اس تخلیقی مرتبہ کی اصل حقیقت معلوم نہ ہو۔ اب جدید علمِ تشریح (اناٹمی) سے اصل حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ اس لحاظ سے 'علقہ' کے اب تک جو معنی بیان کیے گئے ہیں وہ اصل حقیقت کی تعبیر کے لیے ناکافی ہیں۔ لغت میں 'علقہ' کے معنی لٹکی ہوئی چیز اور جونک کے بھی ہیں۔ ان معنوں کی طرف علماء اور اہلِ تفسیر کی نظر اس لیے نہیں جاسکی کہ وہ اس کی تشریحی حقیقت سے ناواقف تھے۔ 'علقہ' تخلیق کا وہ مرحلہ ہے جب جنین ایک مستطیل شکل اختیار کر لیتا ہے اور بالکل جونک کی طرح خون کا ایک لبوترا دکھائی دیتا ہے۔ یہ جونک ہی کی طرح رحم مادر کی پچھلی دیوار سے چپک کر خون چوستا ہے اور ترقی کرتا ہے۔ اب اگر علقہ کا ترجمہ جونک کیا جائے تو وہ حقیقت واقعہ کے زیادہ مطابق ہوگا، کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ تشریحی حقیقت (Anatomical Fact) ہے۔

اسی طرح ایک آیت میں تخلیقِ کائنات کے تذکرہ میں دخان کا لفظ آیا ہے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

(حٰمٓ سجدہ۔۱۱)۔ اس لفظ کے لغوی معنی معلوم ہیں یعنی دھواں، لیکن اس لفظ کی اصل معنوی حقیقت اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک جدید سائنس (علم طبیعیات) کی مدد سے ہم کو یہ نہ معلوم ہو کہ تخلیقِ کائنات کا آغاز کس طرح ہوا اور ابتدا میں اس کا مادۂ تخلیق کس نوعیت کا تھا۔ اب معلوم ہو چکا ہے کہ آغازِ تخلیق میں فضائے بسیط کے اندر صرف دھواں یعنی بخارات (گیسوں) کا ایک بے کراں متحرک ڈھیر موجود تھا۔ اس سائنسی تحقیق سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ میں دخان کے معنی دراصل گیس کے ہیں۔ اور یہ تخلیقِ کائنات کا ابتدائی مادہ ہے۔

ان مثالوں سے ہمارا مقصود یہ بتانا ہے کہ قرآن کی زبان جس طرح غیر معمولی ادبی حسن و جمال رکھتی ہے، اسی طرح اس میں یہ صلاحیت بھی موجود ہے کہ وہ حیات و کائنات کے حقائق کا انکشاف ایسے معجزانہ الفاظ و اسلوب میں کرے جو ہر دور کے لوگوں کی ذہنی استعداد کے مطابق ہو اور اس کے بیان کی صداقت ابدالآباد تک قائم رہے۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ حیات و کائنات کے حقائق سے متعلق قرآن کے کسی لفظ کی وہی علمی تشریح قبول کی جائے گی جو سیاقِ کلام اور قرآن کے نظائر سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔

(۶) معلوم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا تھا جو تمام قبائلِ عرب میں فصیح تر سمجھی جاتی تھی۔ عرب اپنی زبان کی خصوصیات اور اس کی نزاکتوں کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے:

انّ القرآن نزل بلغة العرب وعلیٰ اسالیب بلاغتهم، فکانوا کلهم یفهمونه ویعلمون معانیه فی مفرداته و تراکیبه [1]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۸۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''قرآن عربوں کی زبان میں ان ہی کے اسالیب بلاغت کے مطابق نازل ہوا۔ اس لیے وہ اس کو خوب اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کے معانی کو جانتے تھے، خواہ ان کا تعلق مفرد الفاظ سے ہو یا مرکب۔''

لیکن آگے چل کر یہ حالت باقی نہیں رہی۔ قرآن کے بہت سے الفاظ و تراکیب اور اس کے اسالیب کے فہم میں لوگ دقتیں محسوس کرنے لگے، بالخصوص وہ لوگ جو عجمی تھے اور مسلمان ہوگئے تھے۔ چنانچہ ان مشکلات کے ازالہ کے لیے عربی زبان کی نحو مرتب کی گئی۔ اس میں خلیل، سیبویہ اور فراء پیش پیش رہے۔ لیکن یہ سب عجمی لوگ تھے اور عربی ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ اس لیے عرب بادیہ کی زبان اور اس کے اسالیب سے یہ لوگ بخوبی واقف نہ تھے۔ انھوں نے قرآن کے نحوی مسائل کو شعرائے جاہلیت کے کلام اور خود قرآن کی مدد سے حل کرنے کے بجائے اپنے عہد کی مروّجہ عربی کو زیادہ تر پیش نظر رکھا اور عجمی زبانوں کے اصول و قواعد اور ان کے اسالیبِ ادب کی روشنی میں عربی کے لسانی اصول و قواعد مرتب کردیے۔ جہاں قرآن کا کوئی بیان ان کے اصول نحو سے متصادم نظر آیا وہاں انھوں نے اپنے اصولوں کو باقی رکھا ہے اور قرآن کے بیان کی تاویل کی ہے، جو دراصل تاویلِ بعید ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج قرآن کے بہت سے الفاظ و تراکیب اور اسالیب کے فہم میں ایک مفسر کو دقت پیش آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں بہت سے مقامات پر مذکر کے بجائے مونث اور مونث کی جگہ مذکر، ضمیر واحد کی جگہ ضمیر جمع اور اس کے برعکس، اور تثنیہ کی جگہ واحد کا استعمال ہوا ہے۔

اس کی چند مثالیں ہم یہاں پیش کرتے ہیں: (۱) فلما رأ الشمس بازغة قال هذا ربي هذا اكبر (انعام۔ ۷۸)۔ یہاں اسم اشارہ مذکر ہے حالانکہ اس کو مؤنث ہونا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہیے تھا، کیونکہ مشار الیہ 'الشمس' مؤنث ہے۔ (۲) وما نقموا الا أن اغناھم اللّٰہ ورسولہ من فضلہ (توبہ۔۷۴)۔ 'من فضلہ' میں ضمیر تثنیہ کے بجائے مفرد ہے۔ اس کو 'من فضلھما' ہونا چاہیے تھا۔ (۳) ان کنتُ علی بینة من ربی وآتنِیْ رحمة من عندہ فعمّیت علیکم (ہود۔۲۸)۔ اس میں فعل تثنیہ کے بجائے واحد مونث استعمال کیا گیا ہے۔ اس کو 'فعمّیتا' ہونا چاہیے تھا[1]۔

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں ان میں نحو کے عام قاعدہ سے انحراف کی وجہ کہیں معنی اور کہیں وزن کی رعایت ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں کوئی ایسا قرینہ ضرور رکھا گیا ہے جس سے اصل کی طرف بآسانی رجعت ہوسکے۔ سورۂ انعام کی مذکورہ آیت میں اگر 'ھذا' کی جگہ 'ھذہ' ہوتا تو کلام کی روانی میں فرق آجاتا۔ لیکن اس سے پہلے 'الشمس' کی صفت 'بازغة' موجود ہے جو قرینہ ہے کہ 'الشمس' مونث ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت میں 'من فضلہ' کی ضمیر مجرور واحد اس لیے لائی گئی ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ جو رسول کا فضل ہے وہ دراصل اللہ کا فضل ہے۔ یہی معاملہ سورۂ ہود کی آیت کا ہے۔ یہاں فعل واحد لانے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی حقیقت شے واحد کی سی ہے۔

اوپر قرآن میں نحوی تصرفات کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ عربوں کے اسالیب کلام کے مطابق ہیں۔ ان کے کلام میں اس نوع کے تصرفات جائز تھے۔ جو چیز شرط تھی وہ قرینہ تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی نے 'الفوز الکبیر' (ص ۵۲) میں ان کے علاوہ کئی اور مثالیں دی ہیں۔ ایک مثال ہے: مثلھم کمثل الذی استوقد نارا فلما اضاءت ماحولہ ذھب اللّٰہ بنورھم۔ (بقرہ۔۱۷) انھوں نے لکھا ہے کہ یہاں بجائے ضمیر مفرد کے ضمیر جمع (ھم) لائی گئی ہے۔ یہاں شاہ صاحب سے تسامح ہوا ہے۔ انھوں نے ضمیر 'ھم' کا مرجع 'کمثل الذی' کو قرار دیا ہے جب کہ یہ منافقین کی طرف راجع ہے، اور 'الذی استوقد' کی ضمیر فاعل کا مرجع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"فقیر کے نزدیک کلمہ ہذا (المقیمین الصلوٰۃ والموتون الزکوٰۃ[1]) کی تحقیق یہ ہے کہ مشہور محاورہ کے خلاف محاورہ بھی محاورہ ہی ہوتا ہے اور عرب اوّل اپنے خطبات میں بکثرت ایسے محاورات استعمال کرتے تھے جو کہ مشہور قواعد کے خلاف ہوتے تھے۔ اور چونکہ کلام اللہ عربِ اوّل کی زبان میں نازل ہوا اس لیے اگر کسی جگہ واؤ کی جگہ یا اور تثنیہ کی جگہ مفرد اور مذکر کی جگہ مؤنث آجائے تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے[2]۔"

قرآن میں لفظی تصرفات کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ تین میں 'وطور سینا' کی جگہ 'وطور سینین' ہے۔ محض وزن کی وجہ سے یہ تصرف کیا گیا ہے۔ اوّل الذکر صورت میں آیت وزن سے گر جاتی[3]۔ اس طرح کے تصرفات ہر زبان کے ادب میں جائز خیال کیے جاتے ہیں۔

قرآن میں الفاظ وتراکیب کی طرح اسالیب میں بھی تصرف کیا گیا ہے، مثلاً: حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبۃ (یونس-۲۲) اس آیت میں 'بکم' کے بجائے 'بھم' لایا گیا ہے۔

ایک عجمی ان تصرفات کو دیکھتا ہے تو حیرت کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ عرب اوّل کی زبان اور ان کے اسالیب کلام سے ناواقف ہوتا ہے۔ اسلام کے مخالفین ان چیزوں کو قرآن پر اعتراض کا بہانہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ پہلے گروہ سے زیادہ معذور ہیں۔

۱۔ النسآء-۱۶۲

۲۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص۸۴

۳۔ اس کی ایک مثال 'انّ ھذا لھو حق الیقین' (سورۂ واقعہ-۹۵) بھی ہے۔ اصل میں 'حق یقین' تھا، محض وزن کی رعایت سے اضافت لائی گئی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن کی زبان سے صحیح آشنائی کے لیے جہاں مذکورہ بالا امور کا لحاظ ضروری ہے، وہاں یہ بھی مطلوب ہے کہ قرآن کی کثرت سے تلاوت کی جائے، ایک ایک آیت پر خوب ٹھہر کر غور کیا جائے، اس کے الفاظ واسالیب اور محاورات وغیرہ کو خود اس کے نظائر کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اس طرح مسلسل غور وتلاوت سے انشاء اللہ قرآن کی زبان اور اس کے اسالیب سے یک گونہ آشنائی ہو جائے گی، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ عربی کے کلاسیکی ادب پر نظر ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہوا۔ اس معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے خود قرآن کی مراجعت ہو، ضرورت پڑنے پر ادب جاہلی اور عربی کے مستند لغات کی طرف رجوع کیا جائے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم چیز توفیقِ الٰہی ہے کہ اگر وہ دست گیری نہ کرے تو پھر کلاسیکی ادب اور عربی لغات کی ورق گردانی بھی چنداں مفید نہیں ہے۔

اسالیبِ قرآن

اسلوب کا تعلق دراصل طرزِ ادا سے ہے، یعنی کسی بات کو کن الفاظ وتراکیب اور فقروں کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے۔ ہر زبان میں اظہارِ معنی کے الگ الگ طریقے ہیں اور اس کے حسن وقبح کی تعیین کے لیے جداگانہ معیار ہیں۔ لیکن ہر زبان کے اہلِ علم و ادب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا جائے کہ وہ نہ صرف مکمل طور پر سامع یا قاری تک پہنچ جائے اور اس کی تفہیم میں کوئی دشواری نہ ہو بلکہ اس کے قلب و دماغ پر وہ اثر مرتب کرے جو قائل کو مطلوب ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اظہار کا طریقہ ہر پہلو سے مکمل ہو۔

علماء ادب نے لکھا ہے کہ سب سے اچھا اسلوب بیان وہ ہے جس میں الفاظ وتراکیب اور فقروں کے انتخاب میں معنیٰ کا لحاظ کیا گیا ہو، یعنی جیسا معنیٰ ہو اسی کے لحاظ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے الفاظ اور فقرے بھی ہوں اور ان کی ترکیب سادہ، فطری اور بے تکلف ہو، اس میں ذرّہ برابر تصنّع نہ ہو۔ اس نوع کے اسلوب پر قدرت اسی وقت ممکن ہے جب قلم کار میں اس کا فطری ملکہ ہو، مجرّد مشق و مزاولت سے یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے اصحابِ علم و ادب کی تحریروں میں فرقِ مراتب پایا جاتا ہے اور اسلوب بیان کی خوبی کے لحاظ سے ہی ان کا علمی و ادبی مرتبہ متعیّن ہوتا ہے۔ معنی و مضمون اپنی جگہ بے حد اہم ہیں، لیکن اگر ان کو سلیقہ سے پیش نہ کیا گیا ہو تو ان کی خوبی اور اثر آفرینی میں فرق آجاتا ہے۔ اردو کے عظیم المرتبت شاعر غالبؔ نے اپنے کلام کی خوبی کو اسلوب بیان کی ندرت قرار دیا ہے:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اس لسانی اور ادبی اصول کی روشنی میں جب ہم قرآن حکیم کو پڑھتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک نادر کلام ہے اور اس میں ہر بات کو موزوں ترین اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ الفاظ و تراکیب اور فقروں کو اس عمدگی سے جملوں (آیات) میں پرو دیا گیا ہے کہ اس سے عمدہ ترکیب و ترتیب کا تصور محال ہے۔ ہر آیت لطیف و شیریں الفاظ و تراکیب کا ایک چمنِ زرنگار معلوم ہوتی ہے۔ موزوں الفاظ و تراکیب کی غیر معمولی بندش سے کلام میں بلا کی سلاست اور جوئے کہستاں کی سی خوش خرامی اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ اس کلام کو پڑھ کر ذہن مبہوت اور روح وجد کرنے لگتی ہے۔ قرآن کے طرزِ بیان کی اسی حلاوت اور اثر انگیزی کی وجہ سے کفار عرب اس کو جادو کہتے تھے (سورۂ مدثر۔۲۴)۔

یوں تو قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے لیکن اس کے مخاطب اہل عرب کے علاوہ ساری دنیا کے لوگ ہیں، کیونکہ یہ خدا کی آخری کتاب ہے۔ اس لیے ضروری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوا کہ اس کا طرزِ بیان اور اس کے موضوعات و مضامین جامع اور متنوع ہوں۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں نہ صرف مختلف قبائلِ عرب کی لسانی خصوصیات کا لحاظ رکھا گیا ہے بلکہ اس میں غیر عرب اقوام کی زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں، بالخصوص ان زبانوں کے الفاظ جو لسانی اعتبار سے عربی سے قریبی رشتہ رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ قرآن میں پچھلی مذہبی کتابوں کے بعض اسالیب بیان بھی ملتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ تمام مذہبی کتابوں کا مصدر ایک ہی تھا، یعنی خدائے علیم و خبیر۔ تورات اور انجیل گو کہ اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہیں ہیں لیکن ان کا جتنا حصہ محفوظ ہے اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

انجیل کا اسلوب اکثر مقامات پر تمثیلی ہے۔ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے شاگردوں نے پاس آکر کہا کہ ”تو ان سے تمثیلوں میں کیوں باتیں کرتا ہے۔ انھوں نے جواب میں کہا، اس لیے کہ تم کو آسمان کی بادشاہی کے بھیدوں کی سمجھ دی گئی ہے مگر ان کو نہیں...... اور اس لیے بھی کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔“[۱]

اناجیل میں کہیں کہیں مجازی اسلوب بھی ملتا ہے۔ خاص طور پر ان مقامات پر جہاں باپ اور بیٹا کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ عیسائی اس مجازی اسلوب کو نہ سمجھ سکے اور گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے اس اسلوب پر غور نہیں کیا کہ یہ محض خدا سے اظہارِ قرب کا ایک استعارہ ہے، ان سے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ اور یہ اسلوب ہر زبان میں ملتا ہے۔ خود تورات کے قدیم صحائف میں اس اسلوب کی نظیریں موجود ہیں، مثلاً:

”اور جب تیرے دن پورے ہو جائیں گے اور تو اپنے باپ دادا کے

---

[۱] انجیل متی، باب ۱۳: ۱۰-۱۳

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

ساتھ سو جائے گا تو میں تیرے بعد تیری نسل کو جو تیرے صلب سے ہوگی، کھڑا کر کے اس کی سلطنت قائم کروں گا۔ وہی میرے نام کا گھر بنائے گا اور میں اس کی سلطنت کا تخت ہمیشہ کے لیے قائم کروں گا، اور میں اس کا باپ ہوں گا اور وہ میرا بیٹا ہوگا۔[1]''

تورات کا اسلوب انجیل سے بالکل مختلف ہے۔ اس وقت تورات سے صرف وہ کتاب مراد نہیں ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی بلکہ اس میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد مختلف انبیاء بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔ موجودہ تورات ۳۶ کتابوں پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوبِ بیان جدا جدا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے متعلق پانچ کتابیں ہیں، پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثناء۔ ان میں سے 'پیدائش' کو مستثنیٰ کر کے بقیہ چار کتابوں کا اسلوب ایک سا ہے یعنی فرمانِ شاہی کا اسلوب۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں مندرج تاریخی واقعات پر جو بعد میں بڑھا دیے گئے ہیں، اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس مخصوص اسلوب کی ایک مثال کتابُ استثناء سے پیش ہے:

''تب اس نے کہا، خداوند تیرا خدا جو تجھ کو ملک مصر یعنی غلامی کے گھر سے نکال لایا، میں ہوں۔ میرے آگے تو اور معبودوں کو نہ ماننا...... تو خداوند اپنے خدا کا نام بے فائدہ مت لینا...... تو خداوند اپنے خدا کے حکم کے مطابق سبت کے دن کو یاد کر کے پاک جاننا...... اپنے باپ اور ماں کی عزت کرنا...... تو خون نہ کرنا، تو زنا نہ کرنا، تو چوری نہ کرنا، تو اپنے پڑوسی کے

---

[1] کتاب سموئیل۔۲: ۱۲ تا ۱۴، مزید دیکھیں، انجیل متی، باب ۵: ۵، ۴۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا، تو اپنے پڑوسی کی بیوی کا لالچ نہ کرنا۔[1]"

اس کے برخلاف زبور کا اسلوبِ بیان دعائیہ ہے اور تقریباً پوری کتاب اسی اسلوب میں ہے۔ مثلاً یہ عبارت دیکھیں:

"اے خداوند، اپنی راہیں مجھے دکھا
اپنے راستے مجھے بتا دے
مجھے اپنی سچائی پر چلا اور تعلیم دے
کیونکہ تو میرا نجات دینے والا خدا ہے
میں دن بھر تیرا ہی منتظر رہتا ہوں
اے خداوند، اپنی رحمتوں اور شفقتوں کو یاد فرما
کیونکہ وہ ازل سے ہیں
میری جوانی کی خطاؤں اور میرے گناہوں کو یاد نہ کر
اے خداوند، اپنی نیکی کی خاطر
اپنی شفقت کے مطابق مجھے یاد فرما
خداوند نیک اور راست ہے"۔[2]

قرآن کا آغاز اسی دعائیہ اسلوب میں ہوا ہے، فرق ایجاز واطناب کا ہے۔ سورۂ فاتحہ کا اسلوب ایجاز کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

دوسری مذہبی کتابوں کے مقابلے میں قرآن میں اسلوب کی نیرنگیاں زیادہ ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنی زبان دانی پر ناز کرتے

---

[1] کتاب استثناء، باب ۵: ۶۔۲۱

[2] زبور، باب ۲۵: ۴۔۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھے، لیکن قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کا اسلوبِ بدیع دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

اسلام سے پہلے عربوں میں جو اسالیب مروّج و مقبول تھے وہ تعداد میں چار تھے، خطبہ، قصیدہ، کہانت اور رسائل (مکتوب)۔ خطبہ اور کہانت میں وہ سجع کو مرغوب رکھتے تھے، یعنی کلام مقفّٰی و مسجّع ہوتا تھا۔ قصیدہ میں قافیہ و ردیف کی پابندی ضروری خیال کی جاتی تھی۔ خطبہ، قصیدہ اور کہانت کے اسالیب باعتبار مضمون الگ الگ تھے لیکن ان میں قوانی کا اہتمام قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا تھا۔ خطبہ کے مضامین میں قومی افتخار، آباو اجداد کی مدح وستائش، قبیلے کے لوگوں کی شجاعت و بسالت پر لاف زنی وغیرہ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ خطبہ کا آغاز بالعموم مخفف الفاظ سے ہوتا تھا، مثلاً اما بعد۔

قصیدہ عربوں کی زباں دانی کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اس میں تشبیب، گریز اور خاتمہ تین ارکان ہوتے تھے۔ تشبیب کا آغاز وہ بسا اوقات عجیب و غریب مقامات اور ہولناک واقعات سے کرتے تھے۔ کبھی مناظرِ فطرت سے بھی تشبیب کرتے تھے۔ قصیدہ میں ہر طرح کے مضامین بیان کیے جاتے تھے۔ قومی و شخصی امتیاز اور قبائلی افتخار سے لے کر عورت کے حسن و ادا اور جام شراب سب کا ذکر ہوتا تھا۔

ہر قوم کی طرح ایامِ جاہلیت میں عربوں میں بھی کچھ لوگ مذہبی آئین و رسوم کے عالم سمجھے جاتے تھے اور یہ کاہن کہلاتے تھے۔ ایک دوسرا نام عرّاف بھی تھا۔ بعض اہل علم ان میں فرق کرتے ہیں۔ کاہن گزشتہ اور عرّاف آیندہ کی باتیں بتاتا تھا۔ یہ لوگ فال بینی، طبابت اور ساحری میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ دوسرے ذرائع کے علاوہ تسخیرِ جن ان کی پیشین گوئی کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ لوگ ان کے پاس جاتے اور ہدیہ جو 'حلوان الکاہن' کے نام سے مشہور تھا، پیش کرتے تھے۔ اس کے عوض میں وہ ان کو غیب کی خبریں بتاتے، یعنی یہ اور یہ واقعات ان کی آیندہ زندگی میں پیش آئیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس مقصد کے لیے وہ بعض ایسے فقرے استعمال کرتے تھے جن میں سجع اور قافیہ ہوتا تھا، لیکن ذومعنی تاکہ اگر پیشین گوئی غلط ہو جائے تو وہ اس کی تاویل کرسکیں۔ یہ کلام 'سجع الکھان' کے نام سے معروف تھا۔

قرآن میں عربوں کے مذکورہ بالا اسالیب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان ہی اسالیب کو دیکھ کر وہ کبھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر (سورۂ انبیاء۔۵)، کبھی مجنوں (ذاریات۔۳۹)، کبھی کاہن (سورۂ حاقہ۔۴۲)، اور کبھی ساحر (زخرف۔۴۹) کہتے تھے۔ کفار عرب کو قرآن کی جو خوبی سب سے زیادہ متحیر کر رہی تھی وہ اس کا غیر معمولی اسلوب بیان ہے۔

قرآن کے چند اہم اسالیب

قرآن میں اگر ایک طرف عربوں کے اسالیب کی رعایت کی گئی ہے تو دوسری طرف نئے اسالیب کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ہر سورہ میں اس کے مضمون کے لحاظ سے اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک ہی مضمون مختلف سورتوں میں جداگانہ اسلوب میں بیان ہوا ہے، تاکہ مضمون کی یکسانی سے مخاطب کی طبیعت اکتاہٹ اور بدمزگی محسوس نہ کرے۔ آگے چند اہم اسالیب بیان کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔

مکتوب کا اسلوب

قرآن کے فواتح پر غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ کس سورہ میں کون سا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن کی جن سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوا ہے، ان میں مکتوب کا اسلوب نمایاں ہے۔ مکتوب کے اجزائے ترکیبی تین ہیں، مکتوب نگار، مکتوب الیہ اور مضمونِ مکتوب۔ معلوم ہے کہ وحیِ قرآن کا بڑا حصہ بالواسطہ نازل ہوا ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور یہ واسطہ جبریل علیہ السلام تھے۔ دوسرے لفظوں میں خدا اور اس کے رسول کے درمیان مراسلت یعنی پیغام رسانی جبریلِ امین کے توسّط سے ہوئی تھی، جیسا کہ دنیوی مکتوبات کی ترسیل کسی وسیلہ سے ہوتی ہے۔

چنانچہ حروفِ مقطعات کی حامل اکثر سورتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان حروف کے بعد سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ یہ مکتوب (سورہ) خدا کی طرف سے ہے اور مرسل الیہ محمدؐ ہیں جو اس کے رسول ہیں۔ اس کے بعد مضمون کو کبھی اختصار اور کبھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس نوع کی چند سورتوں کا آغاز ملاحظہ ہو:

(۱) آلٓمٓ ۝ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ (سورۂ بقرہ)

(۲) آلٓمٓ ۝ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ الخ (سورۂ آلِ عمران)

(۳) الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ (سورۂ ابراہیم)

(۴) آلٓمٓصٓ ۝ کِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (سورۂ اعراف)

(۵) یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (سورۂ یٰسٓ)

(۶) حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ (سورۂ مومنون)

ان سورتوں کا بنیادی موضوع بندوں کی ہدایت ہے (سورۂ بقرہ۔ ۱۸۵)۔ اور یہ ہدایت یا پیغامِ ربّانی تین اجزاء پر مشتمل ہے، توحید، رسالت، آخرت۔ چنانچہ اس نوع کی تمام سورتوں میں یہی تین مضامین نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ کسی سورہ میں ایک مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے اور باقی مضامین جزوی حیثیت سے تو دوسری سورہ میں کسی اور مضمون کا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ بعض سورتوں میں تینوں مضامین تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اکثر بڑی سورتوں میں ان مضامینِ ثلاثہ کی تکرار ہوئی ہے تاکہ یہ خوب اچھی طرح واضح ہو جائیں۔ لیکن یہ تکرار اس خوبی سے ہوئی ہے کہ کہیں کلام میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوا ہے اور قاری کسی قسم کی گرانی اور بے لطفی محسوس نہیں کرتا بلکہ اس سے مکرر لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کو ادبی زبان میں یوں کہہ لیں کہ ایک ہی مضمون کو سو بار باندھا گیا ہے لیکن ہر بار ایک نئے اسلوب میں۔ یہ حسنِ بلاغت کا منتہائے کمال ہے۔

مکتوبی نوعیت کی یہ سورتیں طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ قرآن کی ابتدائی چند سورتیں طویل مکتوب کی مثال ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس طرح کی سورتوں کا اختتام یکساں نہیں ہے، اس میں غیر معمولی تنوع ہے۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱)	فانصرنا على القوم الكافرين	(سورۂ بقرہ)
(۲)	واصبروا وصابروا ورابطوا	(آل عمران)
(۳)	واللّٰه بكل شئى عليم	(النساء)
(۴)	وهو على كل شئى قدير	(مائدہ)
(۵)	وانّه لغفور الرحيم	(انعام)
(۶)	وله يسجدون	(اعراف)
(۷)	انّ اللّٰه بكل شئى عليم	(انفال)
(۸)	وهو ربّ العرش العظيم	(توبہ)
(۹)	وهو خير الحاكمين	(یونس)
(۱۰)	وماربك بغافل عما تعملون	(ہود)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرمانِ شاہی کا اسلوب

قرآن کا دوسرا معروف اسلوب فرمانِ شاہی کی مانند ہے۔ چنانچہ جن سورتوں میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے ان میں شوکت وقوت، زجر و توبیخ، تاکید و تحکّم اور پند وموعظت میں سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور موجود ہے۔ لیکن زور وقوت سب میں یکساں ہے بلکہ تحکمانہ لہجہ غالب ہے۔ جن سورتوں کا آغاز کسی تمہید کے بغیر ہوا ہے، ان میں سے زیادہ تر کا تعلق اسی قسم کے اسلوب سے ہے، مثلاً:

(۱) اقرا باسم ربک الذی خلق (سورۂ علق۔۱)

(۲) براءۃ من اللہ ورسولہ (سورۂ توبہ)

(۳) سورۃ انزلنٰھا وفرضنٰھا (سورۂ نور)

(۴) انّ الذین کفروا وصدّوا عن سبیل اللّٰہ (سورۂ محمد)

(۵) اذا جاءک المنفقون (سورۂ منافقون)

(۶) عبس وتولّیٰ ان جاءہ الاعمیٰ (سورۂ عبس)

(۷) لااقسم بھٰذاالبلدo وانت حل بھٰذا البلد (سورۂ بلد)

خطبہ کا اسلوب

متعدد سورتوں میں خطبہ کا اسلوب ملتا ہے۔ اس طرح کی سورتوں کا آغاز 'یاایّھا الّذین' یا حمد وتسبیح کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اوّل الذکر کی مثال سورۂ نساء، سورۂ مائدہ، سورۂ حج، سورۂ احزاب، سورۂ حجرات، سورۂ ممتحنہ، سورۂ طلاق، سورۂ مریم، سورۂ مزمّل، اور سورۂ مدثر ہیں۔ ان سورتوں میں احکام وموعظت کا عنصر نمایاں ہے۔ دوسری قسم کی مثال سورۂ انعام، سورۂ کہف، سورۂ سبا، سورۂ فاطر، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ فرقان، سورۂ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حدید، سورۂ حشر، سورۂ صف، سورۂ جمعہ، سورۂ تغابن، سورۂ ملک اور سورۂ اعلیٰ ہیں۔ سورۂ جمعہ میں دونوں شکلیں جمع ہیں۔ آغاز تسبیح سے ہوا ہے: یُسبِّح له ما فی السمٰوٰت الخ اور اختتام 'یاایّھا الذین' سے ہوا ہے (یاایھا الذین امنو ا الخ)۔

قصیدہ کا اسلوب

یہ اسلوب ان سورتوں میں ملتا ہے جن میں آخرت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہی اسلوب موزوں تھا کیونکہ قیامت کی ہولناکی، میدانِ حشر میں لوگوں کا اجتماع، حساب کتاب اور جنت و دوزخ کے احوال وکوائف کی تصویر کشی اس اسلوب کے بغیر ممکن نہ تھی۔ قصیدے میں شوکتِ الفاظ، بندش کی چستی اور جزالتِ بیان کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ قرآن میں نہ صرف اس کا غیر معمولی اہتمام ملتا ہے بلکہ اس پہلو سے یہ اسلوب اپنے حدِ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اس اسلوب کی نمائندہ مثالوں میں سورۂ ذاریات، سورۂ طور، سورۂ نجم، سورۂ واقعہ، سورۂ قیامہ، سورۂ مرسلات، سورۂ نبا، سورۂ نازعات، سورۂ تکویر، سورۂ انفطار، سورۂ انشقاق، سورۂ بروج، سورۂ طارق، سورۂ فجر، سورۂ بلد، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اہل عرب اپنے قصیدوں کی تشبیب میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، عجیب وغریب مقامات اور خوفناک واقعات کا ذکر کرتے تھے۔ قرآن کی بعض سورتوں میں یہ طرزِ بیان موجود ہے۔ اس کی ایک مثال سورۂ نازعات ہے: والنّٰزعٰت غرقاً ٥ والنّٰشطٰت نشطاً الخ ٥

قرآن میں احوالِ آخرت کے بیان میں ایک ہی اسلوب پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ مضمون کے لحاظ سے اسلوب بدلتا گیا ہے۔ بعض سورتوں میں قسمیہ اسلوب میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مضمون کا آغاز ہوا ہے، مثلاً:

(۱) والطورo وکتب مسطورo (سورۂ طور)

(۲) والنجم اذاھویٰ o ماصاحبکم وماغویٰ (سورۂ نجم)

(۳) لااقسم بیوم القیامۃ (سورۂ قیامہ)

(۴) والسماء ذات البروج (سورۂ بروج)

اس کے برخلاف بعض سورتوں میں سوالیہ اسلوب سے مضمون شروع ہوا ہے:

(۱) الحاقۃ ماالحاقۃo وماادرٰک ماالحاقۃ (سورۂ حاقہ)

(۲) سال سائل بعذاب واقع (سورۂ معارج)

(۳) ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکورا (سورۂ دہر)

(۴) عمّ یتسآلون عن النّبإ العظیم (سورۂ نبا)

(۵) ھل اتٰک حدیث الغاشیۃ (سورۂ غاشیہ)

کہیں مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا بیان ماضی کے صیغہ سے ہوا ہے، مثلاً:

(۱) غلبت الروم فی ادنیٰ الارض (سورۂ روم)

(۲) اذا الشمس کوّرت (سورۂ تکویر)

(۳) اذا السمآء انفطرت (سورۂ انفطار)

(۴) اذا زلزلت الارض زلزالھا (سورۂ زلزال)

(۵) اقتربت الساعۃ وانشق القمر (سورۂ قمر)

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ عربی میں اذا جب فعلِ ماضی پر آتا ہے تو وہ مستقبل کے معنی دیتا ہے اور اس میں یقین کا پہلو غالب ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر کی بعض آیات میں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآنی اسالیب کی چند نمایاں خصوصیات

قرآن کے جملہ اسالیب کی ایک مشترک اور مابہ الامتیاز خصوصیت ان میں وزن اور قافیہ کی پابندی ہے۔ لیکن یہ وزن اور قوافی شعر کے وزن اور قوافی سے مختلف مگر حلاوت میں ان سے فائق ہیں۔

اکثر اہلِ علم وادب کا خیال ہے کہ جو چیز نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہے وہ وزن اور قافیہ ہے۔ لیکن نثر بھی مقفّی ہوتی ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ نظم کو نثر سے جدا اور نمایاں کرنے والی شے وزن ہے۔ ہر زبان کی شاعری میں عروض، مضمون اور طرزِ ادا کا فرق ملتا ہے لیکن ان میں جو وصف مشترک ہے وہ وزن ہے، جس سے نغمہ پیدا ہوتا ہے اور کلام لطیف اور شیریں بنتا ہے۔ انسان بالطبع لطیف اور نرم آوازوں کو پسند کرتا ہے اور ان کی طرف اس کی طبیعت بہت آسانی سے مائل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روح جو ہر لطیف ہے، وہ نرم اور شیریں آواز سے لذت گیر ہوتی ہے۔

قرآن میں انسانی فطرت کے اس پہلو کی رعایت بدرجۂ اتم کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کی آیتوں کو ٹھیک اس طرح تقسیم کیا گیا ہے جس طرح نظم (نشید) ابیات میں منقسم ہوتی ہے۔ لیکن تقسیم میں اس مشابہت کے باوجود دونوں میں فرق ہے۔ عربی شاعری میں بحر اور قافیہ کی پابندی ضروری تھی، لیکن آیات میں نہ تو بحر کا لحاظ رکھا گیا ہے اور نہ قوافی کی پابندی کا التزام ہے۔ آیات میں قوافی آتے ہیں لیکن شعر کی طرح جزوِ لازم کی حیثیت سے نہیں۔ اگر کوئی اچھا قافیہ مل گیا تو آیت اس پر ختم ہوگئی، ورنہ کسی دوسرے لفظ پر جو متصل آیت سے صوتی ہم آہنگی رکھتا ہو، اس کو ختم کیا گیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات کو لیں۔ ان میں پہلا قافیہ 'متقین' ہے (هدیً للمتقین)، لیکن اس کے بعد اس سے مختلف قافیے آئے ہیں، یعنی 'یومنون' (الذین یومنون بالغیب)، 'یقیمون' (الذین یقیمون الصلٰوۃ)، 'ینفقون' (ومما رزقنٰھم ینفقون)، 'یومنون' (والذین یومنون بما انزل الیک)، 'یوقنون' (وبالآخرۃ ھم یوقنون)، 'مفلحون' (واولٰئک ھم المفلحون)، 'لا یومنون' (ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون)۔ اس کے بعد یعنی ساتویں آیت میں قافیہ بدل کر 'عظیم' ہو گیا ہے (ولھم عذاب عظیم)۔ اس تبدیلی کے بعد 'مومنین' قافیہ آیا ہے جو اوّلین قافیہ 'متقین' کے مشابہ ہے۔ اور بعد ازاں پھر ابتدائی چھ قافیوں کے وزن پر قوافی آئے ہیں، مثلاً 'یشعرون' اور 'یکذبون' وغیرہ۔

کئی سورتوں میں قوافی کا التزام بھی ہے، مثلاً سورۂ مریم۔ اس کے ابتدائی قوافی ہیں: زکریا، خفیاً، شقیا، ولیاً، رضیا، سمیاً وغیرہ۔ لیکن آیتوں کا طول یکساں نہیں ہے۔ تیسری آیت 'اذ نادیٰ ربہ نداء خفیا' مختصر ہے لیکن چوتھی آیت اس سے طویل ہے:
قال ربّ انی وھن العظم منّی واشتعل الراس شیبا ولم اکن بدعائک ربّ شقیا۔

اشعار میں مصرعے برابر ہوتے ہیں کیونکہ وہ بحر کے تابع ہوتے ہیں۔ قرآن میں منفرد وزن اور قوافی کے اہتمام کے باوجود بحر کی پابندی نہیں کی گئی ہے اور اسی لیے اس کی آیتیں طول میں کم و بیش ہیں۔ بعض سورتوں میں چھوٹے چھوٹے جملے (آیات) ہیں لیکن اچانک ایک آیت کافی طویل آجاتی ہے۔ مثلاً سورۂ نجم میں ۲۲ آیتیں مختصر اور طول میں تقریباً مساوی ہیں: والنجم اذا ھویٰ ○ ماضل صاحبکم وما غویٰ ○، لیکن تیسویں آیت کا طول کافی بڑھ گیا ہے: ان ھی الا اسمآء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطٰن ط ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس ج ولقد جاء ھم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

من ربھم الھدی ۔ اس طویل آیت کے بعد پھر ایک مختصر سی آیت ہے: ام لِلْاِ نسان ماتمنّٰی (آیت ۲۴)۔

بعض سورتوں میں آیات کے درمیان کا فصل تقریباً مساوی ہے، مثلاً سورۂ مرسلات، سورۂ نبا، سورۂ نازعات، سورۂ عبس، سورۂ تکویر، سورۂ انفطار وغیرہ۔ ان سورتوں میں بھی ایک دو آیات اس تساوی سے الگ ہیں۔ بہر حال آیات خواہ فصل کے لحاظ سے مساوی ہوں یا کم و بیش، جس چیز کا ہر جگہ غیر معمولی اہتمام ملتا ہے وہ وزن کی پابندی ہے، اس میں کہیں کوئی استثناء نہیں ہے۔ اس اہتمام و التزام کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ بعض سورتوں میں اس مقصد کے لیے لفظوں کے املاء تک میں تصرّف کیا گیا ہے۔ سورۂ تین میں 'طور سینا' کے بجائے صرف وزن کی رعایت سے 'وطور سینین' لایا گیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

قرآن کے طرز بیان کی دوسری غالب اور مہتم بالشان خصوصیت ایجاز ہے، یعنی کم سے کم الفاظ میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین نہایت حسن و خوبی سے بیان کیے گئے ہیں۔ چونکہ اہل عرب کلام میں ایجاز کو بے حد پسند کرتے تھے اور اس کو بلیغ کلام کی ایک ضروری شرط قرار دیتے تھے، اس لیے قرآن میں اس اسلوب کو ترجیح دی گئی ہے اور اس فن کو درجۂ اعجاز تک پہنچا دیا گیا ہے۔ چھوٹی سورتوں میں اس کی بہترین مثال سورۂ والعصر اور سورۂ اخلاص ہیں۔ یہ چند آیات پر مشتمل ہیں لیکن بصائر و معارف کا گنجینہ ہیں۔

اس ایجاز کی وجہ سے قرآن میں محذوفات کی کثرت ہے اور بسا اوقات ان لوگوں کے لیے فہم معنی میں دشواری کا باعث بنتے ہیں جو تدبّر کے عادی نہیں ہیں۔ محذوفات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ (بنی اسرائیل۔۵۹) ای آیۃ مبصرۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۲) واشربوا فی قلوبهم العجل (بقرہ۔۹۳) ای حبّ العجل

(۳) علی ملک سلیمان (بقرہ۔۱۰۲) ای عهد ملک سلیمان

(۴) ماوعدتّنا علیٰ رسلک (آل عمران۔۱۹۴) ای سنّة رسلک ('سنّة' جو مضاف ہے، محذوف ہے)

(۵) حتی توارت بالحجاب (سورۂ صٓ۔۳۲) ای توارت الشمس

(٦) مانعبدهم الّاليقربونا الی اللّٰه زلفیٰ (سورۂ زمرہ۔۳) ای یقولون ما نعبدهم الّا الخ

(۷) انّ الذین اتّخذوا العجل (اعراف۔۱۵۲) ای انّ الذین اتّخذوا العجل الٰهاً

(۸) تاتوننا عن الیمین (صٰفّٰت۔۲۸) ای وعن الشمال (عن الشمال جو معطوف ہے، محذوف ہے)۔

مذکورہ بالا مثالیں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر[1]' سے ماخوذ ہیں[2]۔ اب کچھ مثالیں میں اپنی طرف سے پیش کرتا ہوں تاکہ بات مزید واضح ہو جائے۔

(۱) وقد کان لکم آیة فی فئتین التقتا ء فئة تقاتل فی سبیل اللّٰه واخریٰ کافرة ... (سورۂ آل عمران۔۱۳)۔ تقدیر کلام یوں ہے: فئة مومنة تقاتل فی سبیل اللّٰه واُخریٰ کافرة تقاتل فی سبیل الطاغوت۔ پہلے فقرہ میں 'مومنة' کا لفظ اس لیے نہیں لایا گیا کہ 'کافرة' کا لفظ اس حذف کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اسی طرح تقاتل

---

[1] دیکھیں، کتاب مذکور، فصل سوم، ص ۴۵ تا ۴۷

[2] آیات کے حوالے راقم نے دیے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فی سبیل الطاغوت' کا جملہ اس لیے حذف کر دیا گیا کہ 'تقاتل فی سبیل اللّٰہ' کا جملہ موجود ہے جو اس حذف کو کھول دیتا ہے۔

(۲) فاما الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت فیدخلھم ربھم فی رحمتہ ذٰلک ھو الفوز المبین ٥ واما الذین کفروا افلم (سورۂ جاثیہ: ۳۰،۳۱)۔ آگے یہ جملہ محذوف ہے: لا یدخلھم فی رحمتہ ای یدخلون فی نار جھنم۔

(۳) ویقول الذین امنوا لو لا نزلت سورۃ (سورۂ محمد: ۲۰)۔ آگے یہ جملہ محذوف ہے: کتب فیھا القتال۔ مابعد کا فقرہ 'فاذا انزلت سورۃ محکمۃ وذکر فیھا القتال' اس حذف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۴) ءاذا متنا وکنا ترابا ذٰلک رجع بعید (سورۂ قٓ۔۳)۔ 'کنّا ترابا' کے بعد یہ جملہ محذوف ہے: ائنا لمبعوثون

(۵) کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللّٰہ النبیّن (سورۂ بقرہ۔۲۱۳)۔ اس آیت میں 'امۃ واحدۃ' کے بعد یہ جملہ محذوف ہے 'ولکن اختلفوا بعد حین وکانوا شیعا'۔

(۶) یٰعبادی الذین آمنوا انّ ارضی واسعۃ فایّای فاعبدون ٥ کل نفس ذائقۃ الموت ثم الینا ترجعون ٥ (سورۂ عنکبوت۔۵۶۔۵۷) کا اس آیت میں 'ان ارضی واسعۃ' کے بعد 'فاھجروا' محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی زمین بڑی کشادہ ہے، اس میں ہجرت کرو اور پھر اطمینان سے میری عبادت کرو (فایّای فاعبدون)۔ اس کے بعد پھر حذف ہے یعنی: لم تخافون من الھجرۃ، الا تعلمون: کل نفس ذائقۃ الموت۔ مطلب یہ ہے کہ تم لوگ ہجرت سے کیوں خائف ہو، کیا تم نہیں جانتے کہ ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اگر آج ہجرت نہیں کرتے تو موت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے بعد تو بہر حال تمھیں دنیا سے رختِ سفر باندھنا ہے۔

سورۂ عنکبوت ہی کی ایک دوسری آیت ہے: فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللّٰہ مخلصین لہ الدین ج فلما نجّٰھم الی البر اذا ھم یشرکون ○ (آیت ۶۵) اس آیت میں 'فاذا رکبوا فی الفلک' کے بعد یہ جملہ محذوف ہے: وظنّوا انّھم احیط بھم، یعنی جس وقت انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ مصیبت میں گھر گئے ہیں تو وہ اللہ ہی کو پکارتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر اس مصیبت سے انھیں نجات مل گئی تو آگے اسی کی خالص بندگی کریں گے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ لیکن مصیبت سے نجات مل جانے کے بعد وہ عہد شکنی کرتے ہیں اور دوبارہ شرک کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

(۷) کہیں سوال ہے تو جواب محذوف ہے، مثلاً افمن اتبع رضوان اللّٰہ کمن بآء بسخط من اللّٰہ ج (سورۂ آل عمران۔۱۶۲)۔ محذوف جواب یہ ہے: بلیٰ لایستویان۔

(۸) اکثر جگہ جواب شرط محذوف ہے، مثلاً: فان اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانّما علیک البلاغ (آل عمران۔۲۰)۔ اس آیت میں 'وان تولوا' کا محذوف جواب ہے: فلم یھتدوا۔ اس نوع کے محذوف کی ایک دوسری مثال سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۷ ہے: وان عزموا الطلاق فان اللّٰہ سمیع علیم۔ تقدیر آیت اس طرح ہے: وان عزموا الطلاق فعلیھم ان یطلقو ھن فی اربعۃ اشھر۔ یہ جملہ اس لیے حذف کر دیا گیا کہ ماقبل کی آیت 'للذین یؤلون من نساء ھم تربص اربعۃ اشھر' اس مفہوم کو واضح کر رہی ہے۔

قرآن میں بعض مقامات پر طویل حذف کی مثالیں بھی ملتی ہیں، مثلاً: وانظر الی حمارک ولنجعلک آیۃ للناس ج (سورۂ بقرہ:۲۵۹)۔ اگر اس کے محذوفات کو کھولا جائے تو مفہوم یہ ہوگا "تم اپنے گدھے کو دیکھو (جو کب کا مرکھپ چکا، صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی ہے۔ اور تم خود اپنے وجود کو دیکھو جو فنا ہونے سے محفوظ ہے)۔
اور یہ ہم نے اس لیے کیا تاکہ تمھیں لوگوں کے لیے (اپنی قدرت کی) ایک نشانی بنائیں
(کہ اللہ نے کس طرح ایک وجود کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور اسی ماحول میں ایک
دوسرے وجود کو فنا ہونے سے بچالیا)''۔

محذوفات کی مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوگیا کہ قرآن کے اسلوب میں غیر معمولی ایجاز ہے اور یہی ایجاز اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے، کیونکہ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اس اسلوب کو اس درجہ حسن وکمال کے ساتھ نباہ سکے۔

قرآن کے طرزِ اظہار کی تیسری نمایاں خصوصیت تقابل ہے۔ اس طرزِ بیان سے آیات کے فہم میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نوع کے اسلوب سے دوسرے مذاہب کی کتابیں خالی ہیں۔ یہ قرآن کا ایک امتیازی اسلوب بیان ہے۔ اس اسلوب کی ایک دو مثالیں پیش ہیں۔ ایک جگہ پہلے منافقوں کے اعمال وخصائل کا ذکر ہوا ہے:

المنافقون والمنافقات بعضهم من بعض يامرون
بالمنكر وينهون عن المعروف ويقبضون ايديهم ط
نسوا الله فنسيهم ط انّ المنافقين هم الفاسقون٥
وَعَدَ اللّٰه المنافقين والمنافقات والكفار نار جهنم
خلدين فيها ط هى حسبهم ولعنهم الله ولهم عذاب
مقيم٥ (سورۂ توبہ۔۶۷۔۶۸)

''منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں۔ بری
باتوں کا حکم دیتے ہیں اور اچھی باتوں سے روکتے ہیں۔ اور
اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں (یعنی بخل کرتے ہیں)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے خدا کو بھلا دیا تو اس نے بھی ان کو بھلا دیا۔ بلاشبہ منافق ہی فاسق لوگ ہیں۔ اللہ نے عہد کر رکھا ہے کہ وہ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کافروں کو جہنم میں داخل کرے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ (سزا) ان کے لیے کافی ہے۔ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے"۔

پھر اہلِ ایمان کے اوصاف اور امتیازات بیان کیے گئے ہیں:

والمومنون والمومنات بعضهم اولیاء بعض؛ یامرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقیمون الصلوٰة ویوتون الزکوٰة ویطیعون اللّٰه ورسوله اولٰئک سیرحمهم اللّٰه ؕ ان اللّٰه عزیز حکیم ○ وعد اللّٰه المومنین والمومنات جنت تجری من تحتها الانهار خٰلدین فیها ومساکن طیبة فی جنّٰت عدن ؕ ورضوان من اللّٰه اکبر ؕ ذٰلک هو الفوز العظیم

(توبہ۔ ۷۱، ۷۲)

"مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں، اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ رحم کرے گا۔ بے شک اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔ اللہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے،
جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے،
نفیس مکانوں کے اندر جو دائمی باغوں میں ہوں گے، اور (ان
نعمتوں کے علاوہ) انھیں خدا کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی، جو
ایک بڑی چیز ہے۔ یہ ہے ایک بڑی کامیابی (جو انھیں روز
آخرت حاصل ہوگی)"۔

تقابلی اسلوب کی دوسری مثال آیاتِ ذیل ہیں:

فاَمّا من اعطٰی واتّقٰی ○ وصدّق بالحسنٰی ○ فَسَنُيَسِّرہ
للیسرٰی ○ واَمّا مَنْ بخل واستغنٰی ○ وکذّب
بالحسنٰی ○ فَسَنُيَسِّرُہٗ للعسرٰی (سورۂ لیل۔۵تا۱۰)

"جس نے دیا (یعنی راہ خدا میں مال خرچ کیا) اور اللہ سے ڈرا
(یعنی اس کی نافرمانی نہیں کی)، اور اچھے انجام کو سچ جانا تو اس کو
آسان چیز (یعنی جنت) تک پہنچنے کے لیے آسانی فراہم کریں
گے۔ اور جس نے بخل کیا اور (خدا سے ڈرنے کے بجائے اس
سے) بے پروا ہوا اور اچھے انجام (یعنی جنت) کو جھٹلایا تو اس کو
سخت چیز (یعنی جہنم) تک پہنچنے کے لیے ڈھیل دیں گے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اسالیب قرآن کے تنوع اور ان کی خوبیوں کا احاطہ مشکل ہے۔ اس کے اسالیب کی ندرتوں کو دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے، کیونکہ کسی انسان اور وہ بھی ایک امّی کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ بیک وقت متعدد اسالیب میں اس طرح کلام کرے کہ ہر اسلوب اپنی جگہ احسن اور کامل ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مصطلحاتِ قرآن

قرآن میں بہت سے الفاظ لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ تدبّر اور قرائن سے متعین ہو جاتا ہے کہ کہاں لغوی معنی مراد ہیں اور کہاں اصطلاحی۔ بہت سے علماء اور مفسرین نے ان دونوں مفہومات میں فرق نہیں کیا ہے اور تقریباً ہر جگہ لغوی معنی کو بنیاد بنا کر آیات کی تشریح کی ہے، جس سے ان کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہو سکا ہے۔ اس وجہ سے ضروری معلوم ہوا کہ چند اہم اصطلاحی الفاظ کی وضاحت کر دی جائے تاکہ تفہیمِ قرآن میں آسانی ہو۔

ایمان

ایمان کے لغوی معنی کی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اس کا اصطلاحی مفہوم چند بنیادی امور پر دل سے یقین رکھنا ہے اور یہ امور تین ہیں، ایمان باللہ، ایمان بالرّسل اور ایمان بالآخرت۔ ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات اور اس کے حقوق میں کسی مخلوق ہستی کو شریک نہ کیا جائے[۱] اور اسی کی خالص اطاعت وبندگی کی جائے[۲]۔ اس کے حقوق میں شرکت یہ ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کے آگے سرِ نیاز جھکایا جائے اور اس کو کارساز سمجھا جائے[۳]۔

۱۔ أیشرکون مالا یخلق شیئا وهم یخلقون (سورۂ اعراف۔۱۹۱) ''کیا وہ ان کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں۔''

۲۔ فاعبداللّٰه مخلصاً له الدین (سورۂ زمر۔۲) ''اللہ کی بندگی کرو اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

۳۔ ومالکم من دون اللّٰه من ولی ولا نصیر (بقرہ۔۱۰۷) ''اللہ کے سوا نہ تو تمہارا کوئی کارساز ہے اور نہ مددگار۔''

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح ایمان بالرسل میں خدا کے تمام رسولوں کی رسالت کو کسی تفریق کے بغیر تسلیم کرنا (لانفرّق بین احد من رسله: بقرہ۔۲۸۵) اور یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ خدا کے رسول ہونے کے باوجود بشر تھے، ان میں کسی معنی میں کوئی خدائی وصف نہیں تھا (قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلکم: سورۂ ابراہیم۔۱۱)۔ ایمان بالآخرت کا تعلق خدا کے یومِ عدل سے ہے۔ یہ وہ دن ہے جب کسی کے لیے کوئی سعی وسفارش نہیں ہوگی اور ہر شخص کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے گا[1]۔

ایمان کے اصطلاحی مفہوم میں عمل بھی داخل ہے۔ خدا کے یہاں وہی ایمان معتبر ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔ عمل صالح کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ دل میں تصدیق نہیں ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ اعمالِ صالحہ میں مقداری کمی ہو لیکن اس کا سرے سے معدوم ہونا ایمان کے معدوم ہونے کی علامت ہے۔ یہ بات کہ ایمان میں اعمال شامل ہیں، قرآن کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

انّما ولیکم اللّٰه ورسوله والذین اٰمنوا الذین یقیمون
الصلوٰة ویؤتون الزکوٰة وهم راکعون٥ (مائدہ۔۵۵)

”بے شک تمہارا حامی وناصر تو بس اللہ اور اس کا رسول ہے،
اور وہ مومنین ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور
تواضع اختیار کرنے والے ہیں“۔

---

[1] ومـا ادرٰك مايوم الدين ثم ما ادرٰك مايوم الدين٥ يوم لا تملك نفس لنفس شيئًا والامر يومئذ لله (سورۂ انفطار:۱۷۔۱۹) ”تم کیا جانو کہ روز جزا کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کہ روز جزا کیا ہے، وہ دن ہے جب کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا اور فیصلہ اس دن صرف اللہ کے اختیار میں ہوگا“۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

دوسری جگہ ہے:

طٰسٓ O تلک آیات القران و کتاب مبین O ھدی وبشریٰ للمومنین O الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم بالآخرۃ ھم یوقنون O (سورۂ نمل: ۱-۳)

"طٰس، یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں، یہ ہدایت اور بشارت ہیں ان مومنوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"

ایک اور جگہ ہے:

فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا ط ذلکم خیر لکم ان کنتم مومنین (سورۂ اعراف-۸۵)

"تم پورا پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد برپا نہ کرو، اس میں تمہارے لیے بھلائی ہے، اگر تم واقعی مومن ہو"۔

مذکورہ ابتدائی دو آیات میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو ایک مومن کی پہچان بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعمالِ حسنہ کے یہ دو بڑے سرچشمے ہیں۔ سورۂ بقرہ کے بالکل شروع میں 'یومنون بالغیب' کے بعد سلسلۂ کلام روک کر ان دو بڑے اعمالِ صالحہ کا ذکر ہوا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ایمان باللہ میں داخل ہیں اور ان کے دو اہم تقاضوں کی حیثیت رکھتے ہیں[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں، راقم کی کتاب 'ایمان و عمل کا قرآنی تصور' ص ۲۰۶ تا ۲۲۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کفر

ایمان اور مومن ہی کی طرح کفر اور کافر کے الفاظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے لغوی معنی کا ذکر ہو چکا ہے۔ کفر کا اصطلاحی مفہوم ان تمام باتوں کا انکار ہے جن کا ذکر ایمان کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ ان اجزائے ایمان میں سے کسی بات کا انکار کفر اور منکر کافر ہوگا۔

دیکھیں، اہل عرب خدا کے وجود کا انکار تو کجا وہ اسی کو اپنا خالق ورازق مانتے تھے (سورۂ یونس۔۳۱، عنکبوت۔۶۱) لیکن اسی کے ساتھ ان کا خیال تھا کہ بعض مخلوق ہستیاں نظام عالم کے چلانے میں خدا کی شریک ومددگار ہیں۔ ان کو وہ اپنا شفیع ٹھہرا کر ان کی عبادت کرتے تھے (سورۂ یونس۔۱۸) ۔ اس طرز عمل کی وجہ سے وہ مشرک قرار دیے گئے۔ یہاں سوال ہوسکتا ہے کہ وہ کافر کیوں کہے گئے جب کہ وہ خدا کے قائل تھے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ان کا کفر یہ تھا کہ اقرار خدا کے باوجود وہ ایمان کے باقی دو جز یعنی رسالت اور آخرت کے منکر تھے (انبیاء۔۳، جاثیہ۔۲۴)۔ اس لیے وہ مشرک کے ساتھ کافر قرار دیے گئے، دوسرے لفظوں میں ان کا دو جرم تھا، ایک شرک اور دوسرا کفر۔

اس ضمن میں ایک دوسرا سوال بھی ہوسکتا ہے کہ کیا آج جو مختلف مذہبی گروہ دنیا میں پائے جاتے ہیں ان کو کافر کہا جائے گا؟ جو شخص یا مذہبی گروہ خدا اور آخرت کا منکر ہوگا وہ بلاشبہ کافر ہے۔ اگر وہ خدا اور آخرت کو مانتا ہے لیکن کسی رسول کو نہیں مانتا ہے تو وہ کافر نہیں کہلائے گا، کیونکہ رسول کے کفر کا تعلق ان لوگوں سے ہے جن میں وہ مبعوث ہوتا ہے اور وہ اس کی عمدہ تعلیمات اور روشن نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود اس کو خدا کا پیغمبر نہیں مانتے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کوئی شخص حقیقی معنی میں خدا اور اپنے مذہب کے پیغمبر پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی بھی رسول کا منکر ہو۔ اس لیے کہ تمام رسولوں کی بنیادی تعلیمات یکساں ہیں اور ان کا مصدر ایک ہے۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر کے نور کو تو دیکھے اور اس کو مانے لیکن اسی نور کو دوسروں کے پاس دیکھ کر اس کا انکار کر بیٹھے۔ عام حالات میں یہ ممکن نہیں ہے۔

اسلام

ایمان اور کفر کے بعد یہ قرآن کی تیسری بڑی اصطلاح ہے۔ اسلام کے لغوی معنی خود کو حوالے کر دینے اور سر اطاعت جھکا دینے کے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعا وّ کرھا
وّالیہ یُرجعون ٥ (سورۂ آل عمران۔۸۳)

''زمین اور آسمانوں میں جو وجود بھی ہے وہ خوشی یا ناخوشی
سے خدا ہی کے آگے سرافگندہ ہے اور سب کو اسی کی طرف
پلٹ کر جانا ہے''۔

دوسری جگہ ہے:

الاّ تعلوا علیّ واتونی مسلمین ٥ (سورۂ نمل۔۳۱)

''میرے مقابلہ میں بڑائی نہ جتاؤ اور (سیدھے طور پر
میرے پاس مطیع ومنقاد بن کر حاضر ہو جاؤ''۔

اسلام کا اصطلاحی مفہوم وہی ہے جس کا ذکر ایمان کی بحث میں ہو چکا ہے، یعنی جن باتوں پر یقین کر لیا گیا ہے ان کے مطابق عمل کرنا۔ گویا اسلام نام ہے عملی اطاعت

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

کا۔ایک حدیث میں جو عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے، اسلام کے اجزائے ترکیبی کو بیان کیا گیا ہے۔حضورؐ نے فرمایا:

"اسلام پانچ چیزوں پر مبنی ہے: (۱) اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، (۲) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں، (۳) نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا، (۴) زکوٰۃ دینا، (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔"

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اور اسلام میں تلازم ہے۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ کا تعلق قلب کے یقین سے ہے اور وہ ایمان ہے اور دوسرے رخ کا تعلق اعضاء و جوارح کے اعمالِ ظاہری سے ہے اور یہ اسلام ہے۔ اس کی مثال تخم اور درخت کی سی ہے۔ تخم ایمان ہے اور درخت اور اس کی شاخیں اسلام۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ موزوں زمین میں تخم ڈالا جائے اور وہ سطحِ زمین پر ظاہر نہ ہو، اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں حقیقی معنی میں ایمان ہو اور وہ اعمال (اسلام) کی صورت میں نمایاں نہ ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ قلب میں یقین نہ ہو اور مقرِ ایمان ظاہری اعمال سے دھوکا دے رہا ہو، یعنی یہ کہ وہ مومن ہے، جیسا کہ عہد نبوت کے منافقین کا رویہ تھا۔ وہ ظاہری اطاعت کے باوجود مومن نہیں تھے۔ لیکن منافق اور سچے مومن کے اعمالِ ظاہری میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کام دل سے کیا جائے اور دوسرا بے دلی سے اور دونوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ منافق بھی نمازیں پڑھتے تھے لیکن دکھاوے کے لیے، وقت کی پابندی اور خشوع کے بغیر، جب کہ مومن پابندیِ وقت کے ساتھ دل لگا کر نماز ادا کرتے تھے اور اس میں خشوع اور انہماک غالب ہوتا تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تقویٰ

تقویٰ، وَقَی یقی، وقی سے ہے۔ یہ دراصل وقویٰ ہے جو وقی کا اسم ہے۔ اس کے لغوی معنی کسی شر یا کسی چیز کے ضرر سے بچانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے: یا ایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا الخ (سورۂ تحریم۔ ۶) ''اے ایمان والو، اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔''

اسی مادہ سے 'اتقاء' ہے جس کے معنی بچنے اور پرہیز کرنے کے ہیں۔ علماءِ لغت نے لکھا ہے کہ ''اصل الا تقاء الحجز بین الشیئین، یقال اتقاہ بالترس ای جعلہ حاجزا بینہ و بینہ'' ''اتقاء کی اصل دو چیزوں کے درمیان اوٹ کرنا ہے۔ کہا جاتا ہے، اس نے ڈھال کے ذریعے سے بچاؤ کیا، یعنی ڈھال کو اپنے اور دشمن کے درمیان اوٹ بنالیا۔'' 'رجل تقی' کا مطلب ہے: انہ موق نفسہ من العذاب و المعاصی بالعمل الصالح ''متقی وہ شخص ہے جو اپنے کو عمل صالح کے ذریعہ سے عذاب اور گناہوں سے بچائے رکھے[1]۔''

قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ (بقرہ۔ ۲۴) ''اس آگ سے بچو جس کے ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔'' دوسری جگہ ہے: واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم (سورۂ انفال۔ ۲۵) ''اور تم اس فتنہ (یعنی مصیبت) سے بچو جس میں صرف وہی لوگ مبتلا نہیں ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہے۔'' ایک اور مقام پر ہے: واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا (بقرہ۔ ۴۸) ''اس دن (کی ہولناکی) سے بچو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔''

---

[1] دیکھیں لسان العرب، مادہ 'وقی'

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

حدیث ہے: اتق المحارم، تکن اعبد الناس [۱] ''محارم سے بچو، لوگوں میں سب سے بڑے عابد ہو جاؤ گے۔'' دوسری حدیث ہے: اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامۃ واتقوا الشح الخ [۲] ''ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا باعث ہے، اور حرص سے بچو۔''

قرآن کی جن آیتوں میں اتقاء کا مفعول اللہ ہے، وہاں اس سے مراد اللہ کی نافرمانی سے بچنا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے: فاتقوا اللّٰہ ما استطعتم (سورۃ تغابن۔۱۶) ''حتی المقدور اللہ کی نافرمانی سے بچو۔'' دوسری جگہ ہے: یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ حق تقاتہٖ ولا تموتن الا وانتم مسلمون (سورۃ آل عمران۔۱۰۲) ''اے ایمان والو، اللہ کی نافرمانی سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے اور اس حال میں تمہیں موت آئے کہ تم (اس کے) فرماں بردار ہو۔'' آیت میں 'الا وانتم مسلمون' کے فقرہ نے اتقاء کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ یہ مفہوم ان مقامات پر اور واضح ہو گیا ہے جہاں احکام (حدود اللہ) کے ذکر کے بعد بالعموم 'اتقوا اللّٰہ' کا جملہ آیا ہے، مثلاً عورتوں کو طلاق دینے سے متعلق حکم کے بعد فرمایا ہے: واتقوا اللّٰہ (بقرہ۔۲۳۱)۔ اسی طرح مسائلِ رضاعت کے ذکر کے بعد فرمایا: واتقوا اللّٰہ واعلموا انّ اللّٰہ بما تعملون بصیر (بقرہ۔۲۳۳) ''اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جان لو کہ اللہ تمہارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہا ہے۔''

قرآن میں جہاں مفعول کے بغیر 'اتقاء' استعمال ہوا ہے وہاں عمومی مفہوم مراد ہے، یعنی غلط روی یا برے افعال کے ارتکاب سے بچنا۔ مثلاً صوم کے ذکر میں ہے:

۱۔ ترمذی، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الرقاق۔

۲۔ مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین، باب: تحریم الظلم

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

یا ایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب
علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ۔۱۸۳)
''اے ایمان والو،تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس
طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم غلط
روی سے بچو۔''

اتقاء اور اطاعت میں فرق ہے ۔ اتقاء میں باز رہنے کا سلبی مفہوم نمایاں ہے اور اطاعت اس کے برعکس ایجابی مفہوم رکھتا ہے ۔ اکثر علماء و مفسرین نے کسی قید کے بغیر تقریباً ہر جگہ 'اتقوا اللہ' کا ترجمہ ''اللہ سے ڈرو'' کیا ہے ۔ یہ مفہوم غلط تو نہیں ہے کیونکہ اتقاء میں خوف کا عنصر بھی شامل ہے، لیکن یہ اس کے اصل معنی نہیں ہیں ۔ اللہ سے ڈرنے کے لیے قرآن میں 'خشیۃ' کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔ اطاعت، خشیت اور اتقاء کے معنوی فرق کو درج ذیل آیت میں بالکل کھول دیا گیا ہے:

ومن یطیع اللہ ورسولہ ویخش اللہ ویتقہ فاولئک
ھم الفائزون (سورۂ نور۔۵۲)
''جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ
سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے بچتا ہے تو ایسے ہی لوگ
کامیاب و بامراد ہیں۔''

مذکورہ آیت میں 'ویتقہ' کا فقرہ دراصل 'ویخشی اللہ' کی وضاحت کے لیے لایا گیا ہے، یعنی خدا کی نافرمانی سے بچنا۔

میں نے اوپر تقویٰ اور اتقاء کے لغوی معنی کی تفصیل اس لیے کی ہے کہ ان کی تشریح میں بہت سے اہل علم نے غلطیاں کی ہیں۔ اس کے علاوہ اس تفصیل سے یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقصود بھی ہے کہ تقویٰ کے اصطلاحی مفہوم کے فہم میں آسانی ہو، جس کا ذکر میں آگے کرنے جا رہا ہوں۔

لفظ 'اسلام' کے اصطلاحی معنی کی وضاحت میں لکھا گیا ہے کہ اس کا مطلب خدا کی فرماں برداری ہے اور اس کا تعلق ظاہری اطاعت سے ہے جس میں اعضاء و جوارح شریک ہوتے ہیں۔ مثلاً اللہ نے کہا کہ نماز پڑھو اور آپ نے نماز اس طرح ادا کی جس طرح بتائی گئی ہے تو نماز ادا ہو گئی اور یہ اسلام ہے۔ لیکن اس عملِ اطاعت میں ضروری نہیں ہے کہ نمازی کا دل بھی شامل ہو، یعنی اس نے دل کی رضا و رغبت کے ساتھ نماز ادا کی ہو۔ اب اگر خدا کی اس فرماں برداری میں دل بھی شریک ہو گیا اور جذب و خشوع سے عبادت کا فرض ادا کیا گیا تو یہ تقویٰ ہے۔ گویا تقویٰ کا اطلاق ایسی فرماں برداری پر ہوتا ہے جو دل کی کامل رضامندی سے کی جائے۔

قرآن میں تقویٰ کے اس اصطلاحی مفہوم کو کئی آیتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے: لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم (سورۂ حج: ۳۷) ''اللہ تک جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔'' اسی سورہ میں تھوڑا پہلے ذکر ہوا ہے: ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب (آیت ۳۲) ''جو شخص اللہ کے شعائر کی تعظیم کرتا ہے (یعنی ان کی بے حرمتی سے احتراز کرتا ہے) تو یہ دراصل قلب کی پرہیزگاری ہے۔''

اس آخری آیت سے معلوم ہوا کہ تقویٰ کا تعلق دل سے ہے۔ اگر کسی حکم کی اطاعت میں دل کی رضامندی شامل نہ ہو تو اس پر تقویٰ کا اطلاق نہ ہو گا بلکہ اس کو ظاہری اطاعت پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ اعرابیوں کے ذکر میں فرمایا گیا ہے:

قالت الاعراب امنا ط قل لم تومنوا ولکن قولوا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ط

(سورۂ حجرات:۱۴)

''بدویوں (یعنی دیہاتی لوگوں) نے کہا کہ ہم ایمان لائے، کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ (ظاہری طور پر) مطیع ہوگئے ہو اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔''

قرآن میں ایک جگہ تقویٰ کے بالمقابل عدوان کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے تقویٰ کے اس مفہوم پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا ہے:

تعاونوا علی البرّ و التقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (سورۂ مائدہ۔۲)

''نیکی اور تقویٰ (کے کاموں) میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، مگر گناہ اور ظلم و زیادتی میں تعاون نہ کرو۔''

نیکی اور تقویٰ کے افعال کا دائرہ کافی وسیع ہے، لیکن اس کا تعلق ان اعمال سے بالخصوص ہے جن میں بندوں کے ساتھ ظلم و زیادتی اور ان کی حق تلفی ہو جیسا کہ اوپر کی آیت میں 'عدوان' کے لفظ سے بالکل واضح ہے۔ اس سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث قابل ذکر ہے۔ آپ نے فرمایا:

لا تحاسدوا ولا تناجشوا ولاتباغضوا ولا تدابروا ولا یبیع بعضکم علی بیع بعض، وکونوا عباداللّٰہ اخوانا، المسلم اخوالمسلم لایظلمہ ولا یحقرہ ولا یخذلہ، التقویٰ ھھنا و یشیر الی صدرہ ثلث

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرات، بحسب امرء من الشر ان یحقر اخاہ المسلم، کل المسلم علی المسلم حرام، دمه وماله وعرضه [۱]

"آپس میں حسد نہ کرو، عیب چینی نہ کرو، بغض مت رکھو، قطع تعلق نہ کرو۔ خرید و فروخت میں ایک دوسرے پر بڑھا چڑھا کر معاملہ نہ کرو، خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اس کی تحقیر کرتا ہے اور نہ اس کو مشکل گھڑی میں بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے تین بار اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا کہ آدمی کے لیے یہ کم گناہ نہیں ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔"

تقویٰ کا آخری درجہ یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بھی پرہیز کرے جن کے بارے میں اس کے دل میں تردّد پیدا ہو جائے کہ مبادا یہ خدا کی ناراضی کا موجب ہو۔ ایک حدیث میں ہے:

لا یبلغ العبد حقیقة التقویٰ حتی یدع ماحاک فی الصدر [۲]

---

۱ مسلم، بحوالہ ریاض الصالحین، باب: تعظیم حرمات المسلمین

۲ بخاری، کتاب الایمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"بندہ تقویٰ کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس چیز کو
بھی نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹک کا باعث ہو۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع مالا
باس به حذراً مما به باس[1]

"بندہ اس وقت تک متقیوں میں شمار نہیں ہوتا جب تک کہ اس
اندیشہ سے کہ کہیں اس سے کوئی غلط فعل سرزد نہ ہو جائے، اس چیز
سے بھی دور رہے جس میں (بظاہر) کوئی مضائقہ نہ ہو۔"

احسان

خدائی احکام کی اتباع جب دل سے کی جاتی ہے یعنی شعور و ادراک کی پوری گہرائی سے تو قرآن مجید کی اصطلاح میں اس شعوری اور قلبی اطاعت کا نام تقویٰ ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ اور جب یہ جذبۂ اتباع اپنے درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے یعنی وہ محض شعوری نہیں ہوتا بلکہ احساسات اور نفسیات کے اندر پوری طرح سرایت کر جاتا ہے تو شریعت کی زبان میں احسان کہلاتا ہے، اور یہ اس کا اصطلاحی مفہوم ہے۔

حدیث میں احسان کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ جب تم نماز پڑھو تو خیال کرو کہ خدا کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ سمجھو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کو دیکھنا یہاں حقیقی نہیں مجازی معنی میں ہے، یعنی نماز میں توجہ اور استغراق اس درجہ تک پہنچ جائے کہ نمازی کو گمان ہونے لگے کہ گویا خدا اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ یہ ایک خالص نفسیاتی معاملہ ہے نہ کہ کوئی معروضی حقیقت، جیسا کہ اہلِ تصوف نے سمجھا ہے۔

---

1. ترمذی، بحوالہ ریاض الصالحین

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید میں ایک محسن کا تعارف ان لفظوں میں کرایا گیا ہے:

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ. (سورۂ بقرہ: ۱۱۲)

"ہاں، بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ بطریقِ احسن عمل کرنے والا ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے (اور وہ اس کو ملے گا)"

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ o (سورۂ آل عمران: ۱۳۴)

"وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ محسنوں کو دوست رکھتا ہے"

ان آیات سے معلوم ہوا کہ احسان کا تعلق انسان کے نہایت عمدہ اخلاق و اعمال سے ہے۔ قرآن مجید میں 'محسن' اور 'متقی' کے مواقع استعمال پر غور کریں تو احسان کا قرآنی مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ مطلقہ عورت کے لیے نان و نفقہ کے وجوب کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے:

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ ط حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ o

(سورۂ بقرہ۔ ۲۴۱)

"اور مطلقہ عورتوں کے لیے دستور کے مطابق متاع ہے اور اس کی ادائیگی خدا ترسوں پر واجب ہے۔"

یہ متاع کا عام اور مطلق قانون ہے اور ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو اللہ کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانون کی اتباع کرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہے۔ قانونِ متاع ہی کے سلسلے میں اسی سورہ میں ایک دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَالَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَ مَتِّعُوهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۝ (سورۂ بقرہ:۲۳۶)

"تم پر کوئی گرفت نہیں، گر تم ان عورتوں کو طلاق دو جن سے تم نے زن وشو کا تعلق قائم نہیں کیا ہے اور ان کا مہر بھی مقرر نہیں کیا ہے۔ ان عورتوں کو تم دستور کے مطابق متاع دو، دولت مند اپنی مالی حیثیت کے مطابق دے اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق، اور محسنوں پر تو یہ واجب ہے"۔

اس آیت میں 'متقین' کی جگہ 'محسنین' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لفظ کی یہ تبدیلی معنی خیز ہے۔ اس آیت کے مطابق ایسی منکوحہ عورت جس کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم نہ ہوا ہو اور مہر بھی مقرر نہ ہو اور اس کو طلاق دے دی جائے تو اس صورت میں متاع کی ادائیگی شوہر پر قانوناً واجب نہیں ہے، کیونکہ متاع اس وقتِ واجب ہوتا ہے جب زوجین مباشرت کے عمل سے گزر چکے ہوں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ محسنوں پر واجب ہے۔ اس سے بالکل ظاہر ہے کہ محسن کا درجہ متقی سے بلند ہے۔ متقی آدمی صرف یہ دیکھتا ہے کہ ایک خاص معاملے میں اللہ کا کیا حکم ہے اور اس حکم کو جان لینے کے بعد وہ جان و دل سے تعمیلِ حکم کرتا ہے، لیکن محسن کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ ان معاملاتِ زندگی میں بھی حسنِ عمل (احسان) کا مظاہرہ کرتا ہے جہاں کوئی قانونی حکم موجود نہیں ہوتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طلاق کی متذکرہ بالا صورت میں متاع قانوناً واجب نہیں ہے لیکن محسن یہاں بھی مطلقہ عورت کو متاع دے کر رخصت کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ محسن وہ شخص ہے جو اپنے نفس پر پوری طرح قابو یافتہ ہوتا ہے۔ اسی لیے محسن کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ وہ غصہ کو پی جاتا ہے اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتا ہے (آل عمران: ۱۳۴)۔ قرآن مجید کی بعض آیات میں محسن کے بالمقابل جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ظالم ہے: وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِيْنٌ (سورۃ الصافات: ۱۱۳)۔ اس آیت کے مطابق ظالم وہ ہے جس کا نفس اس کے قابو سے باہر ہو۔ نفس کی اسی بے عنانی کی وجہ سے وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی ستاتا اور ان کی حق تلفی کرتا ہے۔ اور محسن اس کے برعکس ہوتا ہے۔

اس گفتگو سے واضح ہو گیا کہ مذہبی زندگی کی سب سے اعلیٰ اور ترقی یافتہ شکل کا نام قرآن مجید کی اصطلاح میں احسان ہے اور یہ غایت درجہ حسنِ عمل سے عبارت ہے۔

عبادت

عبادت کے لغوی معنی انتہائی عجز و تذلل کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں:

> "عبودیت کے معنی اظہارِ فروتنی کے ہیں اور عبادت کے معنی اس سے بھی ایک درجہ آگے یعنی غایت درجہ فروتنی کے ہیں۔ اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جس کی مہربانیاں بے پایاں ہیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا ہے: ان لا تعبدوا الا ایاہ "صرف اسی کی عبادت کرو"[1]

---

[1] مفرداتِ راغب، بذیل مادہ "عبد"

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معروف عربی لغت 'لسان العرب' میں ہے:

''عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں۔ عبد الطاغوت یعنی اس نے طاغوت کی اطاعت کی۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا قول ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ یعنی ہم تیری ہی عاجزانہ اطاعت کرتے ہیں۔ اور لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع ہیں۔ چنانچہ وہ راستہ جو آمد و رفت کی کثرت سے پامال ہو گیا ہو طریقِ معبّد کہلاتا ہے[1]۔''

تاج العروس میں ہے:

''لغت میں عبادت کے معنی اطاعت مع الخضوع ہیں[2]۔''

مفسرین نے بھی عبادت کے یہی معنی لکھے ہیں۔ امام طبری فرماتے ہیں: ''جملہ اہل عرب کے نزدیک عبودیت کی اصل ذلت ہے اور اسی لیے وہ راستہ جو مسافروں کی آمد و رفت کی کثرت سے پست و پامال ہو چکا ہو طریقِ معبّد کہلاتا ہے۔ طرفہ کا شعر ہے:

تباری عتاقاً ناجیات، واتبعت
وظیفاً وظیفاً فوق مور معبد[3]

اس شعر میں 'مورِ معبّد' سے مراد طریقِ معبّد یعنی پامال راہ ہے۔ اور اسی طرح وہ اونٹ جسے سواری کے لیے رام کیا جا چکا ہو بعیرِ معبّد کہلاتا ہے۔ عبد کو بھی اسی وجہ سے عبد یعنی غلام کہتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کا مطیع و منقاد ہوتا ہے۔ اشعار عرب میں اس کے

---

[1] لسان العرب، ج ۳، ص ۲۷۲

[2] تاج العروس، ج ۲، ص ۴۱۰

[3] ترجمہ: ''وہ تیز رفتار گھوڑوں کا مقابلہ کرتی ہے اور ایک پیر پر کے پیچھے اور دوسرا پیر پامال راستہ پر رکھتی چلی جاتی ہے۔''

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

شواہد اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ مشکل ہے[۱]"

صاحبِ کشاف لکھتے ہیں:

"عبادت نام ہے غایت درجہ خضوع و تذلّل کا اور اسی لیے اس لفظ کا استعمال صرف اللہ کے سامنے خضوع کے لیے خاص ہے کیونکہ وہی آقا اور منعم حقیقی ہے، اس لیے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے آگے خضوع و تذلل کا اظہار کیا جائے[۲]"

علامہ علاء الدین بغدادی رقم طراز ہیں:

"عبادت انتہائی جھکاؤ اور پستی کا نام ہے (العبادۃ اقصیٰ غایۃ الخضوع والتذلّل) ۔ غلام کو اسی لیے عبد کہتے ہیں کہ وہ بالکل جھکا ہوا اور مطیع ہوتا ہے[۳]"

علامہ ابن کثیر لکھتے ہی: "لغت میں عبادت کے معنی ذلّت کے ہیں[۴]۔

عبادت کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ خدا ہی کی اطاعت و بندگی کی جائے، اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے سرِ عبودیت نہ جھکایا جائے (سورۂ کہف ۔ ۱۱۰)۔ سجدہ عبادت کا جزوِ لازم ہے، اس لیے یہ کسی مخلوق کے لیے جائز نہیں ہے، فرمایا گیا ہے:

لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للّٰه الذی خلقهن ان كنتم اياه تعبدونo (سورۂ حم سجدہ ۔ ۳۷)

---

۱ تفسیر طبری، ج ۱، ص ۱۶۱

۲ الکشاف، ج ۱، ص ۹

۳ تفسیر خازن مع البغوی، ج ۱، ص ۱۵

۴ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۲۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں بنایا ہے، اگر تم فی الواقع اسی کی عبادت و بندگی کرتے ہو۔''

خدا کی نعمتوں کی شکر گزاری بھی عبادت میں داخل ہے، اس کے علاوہ کسی اور کا شکر ادا کرنا عبادت کے منافی ہے۔ فرمایا ہے: واشکروا نعمة اللّٰه ان کنتم ایاه تعبدون (سورۂ نحل۔۱۱۴) ''اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم فی الواقع اسی کی عبادت و بندگی کرتے ہو۔'' دوسری جگہ ہے: بل اللّٰه فاعبد وکن من الشاکرین (سورۂ زمر۔٦٦) ''بلکہ اللہ ہی کی عبادت و بندگی کرو اور (اسی کے) شکر گزار بنو۔''

توکل یعنی خدا کی ذات پر بھروسہ کرنا بھی عبادت کا حصہ ہے: فاعبده وتوکل علیه (سورۂ ہود۔۱۲۳) ''اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔'' ایک عابد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صرف خدا ہی سے مانگے کیونکہ استعانت کا شمار عبادت میں ہوتا ہے: ایاک نعبد وایاک نستعین (فاتحہ) ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' خدا ہی سے استعانت اس لیے ضروری ہے کہ بندوں کا نفع ونقصان صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ اقم وجهک للدین حنیفاً ج ولا تکونن من
المشرکین ○ ولا تدع من دون اللّٰه مالا ینفعک ولا
یضرک ج فان فعلت فانک اذاً من الظلمین ○ وان
یمسسک اللّٰه بضرٍ فلا کاشف له الا هو ج وان یردک
بخیر فلا راد لفضله ط یصیبُ به من یشآء من عباده ط
وهو الغفور الرحیم ○ (سورۂ یونس۔۱۰۵ تا ۱۰۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"تم اپنا رخ یکسو ہوکر (خدا کی) اطاعت کی طرف رکھو (یعنی اسی کی خالص اطاعت و بندگی کرو) اور مشرک نہ بنو۔ اللہ کے سوا ان کو نہ پکارو جو نہ تمہیں فائدے پہنچائیں اور نہ نقصان، اگر تم نے ایسا کیا (یعنی غیر خدا کو مدد کے لیے پکارا) تو پھر تم ظالم (یعنی مشرک) ہو۔ (جان لو) اگر اللہ تمہیں کسی مصیبت میں مبتلا کردے تو اس کے علاوہ اس مصیبت کو کوئی دفع کرنے والا نہیں اور اگر تمہیں کوئی فائدہ پہنچانے کا ارادہ کرلے تو اس کو کوئی ہٹانے والا بھی نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ وہ بہت معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

صراطِ مستقیم

یہ دو لفظوں سے مرکب ہے، صراط اور مستقیم، یعنی سیدھا راستہ۔ اس سیدھے راستے سے کیا مراد ہے، اس میں علماء اور مفسرین سے مختلف باتیں منقول ہیں۔ اس سلسلے میں طبری نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں، مثلاً ذکر، قرآن، کتاب اللہ، دین اللہ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء اربعہ کا راستہ وغیرہ[1]۔ صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے صراط مستقیم سے ملتِ اسلام اور بعض نے طریقِ حق اور اس پر استقامت مراد لی ہے[2]۔ اس سلسلے میں سید رشید رضا لکھتے ہیں:

---

1. تفسیر طبری، ج ۱ ص ۱۷۱ تا ۱۷۴

2. روح المعانی، ج ۱، ص ۸۰

امام رازی نے اس مفہوم کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اعمال و اخلاق میں افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال و توسط کی راہ اختیار کرنا ہے۔ دیکھیں: روح المعانی ج ۱، ص ۷۹،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وقد قالوا ان المراد بالصراط المستقیم، الدین الحق، اوالعدل اوالحدود، نحن نقول انه جملة مایوصلنا الی سعادة الدنیا والآخرة من عقاید وآداب و احکام و تعالیم[۱]۔

"عام طور پر صراط مستقیم سے لوگوں نے دین حق یا عدل یا حدود مراد لیے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی سعادت کے حصول کا ذریعہ ہیں، یعنی عقائد، آداب، احکام اور تعلیمات۔"

صراط مستقیم کے مفہوم کی تعیین میں مفسرین کے درمیان اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صراط مستقیم سے اس کا لغوی مفہوم مراد لیا اور اس اعتبار سے متذکرہ سب مفہومات اس میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ قرآن مجید کی ایک اصطلاح بھی ہے اور جہاں صراط مستقیم کے الفاظ بطور اصطلاح کے استعمال ہوئے ہیں وہاں اس سے ایک متعین مفہوم مراد ہے یعنی توحید، مثلاً ایک جگہ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّی وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝

(آل عمران۔ ۵۱)

"بے شک اللہ ہی میرا اور تمہارا رب ہے، پس اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھی راہ ہے"۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ إِنَّنِي هَدٰنِي رَبِّي إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۚ دِينًا قِيَمًا

---

[۱] تفسیر المنار، ج ۱، ص ۶۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

(سورۂ انعام۔۱۶۱)

"(اے محمدؐ) کہہ دو، میرے رب نے مجھے سیدھی راہ دکھادی ہے، راست دین جس میں کوئی کجی نہیں، ابراہیم کا طریقہ جسے اس نے یکسو ہو کر اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا"۔

مؤخر الذکر آیت میں دینِ قیم اور ملتِ ابراہیم کے الفاظ سے صراطِ مستقیم کا توحیدی مفہوم بالکل واضح ہوجاتا ہے، 'وما کان من المشرکین' کے جملے سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی ایک اور آیت بھی اس مفہوم کی طرف رہ نمائی کرتی ہے۔ فرمایا ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِىْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ (یٰسٓ۔۶۰، ۶۱)

"اے اولادِ آدم، کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت (یعنی اطاعت) نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے، اور یہ کہ میری ہی بندگی کرنا، یہی سیدھا راستہ ہے"۔

قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح اپنے اندر توحید کے علاوہ بعض دوسرے مفہومات بھی رکھتی ہے جو دراصل توحید ہی کی شرح و تفصیل ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ
اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○
وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ
اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا
قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ○ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ
وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (انعام۔۱۵۱تا۱۵۳)

"(اے محمد) ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں جو کچھ تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کیا ہے: خدا کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی روزی دیتے ہیں اور انھیں بھی دیں گے۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو، اِلّا یہ کہ اسے حق کی خاطر ہلاک کرنا پڑے[1]۔ اس بات کی اس نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم سمجھ سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو

---

[1] جیسے قصاص وغیرہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائے۔ اور انصاف ودیانت کے ساتھ ناپ تول کرو، ہم کسی شخص پر اس کی مقدرت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اور جب کوئی بات کہو تو انصاف کی کہو، خواہ صاحب معاملہ قرابت دار ہی ہو۔ اور اللہ سے جو عہد وپیماں کرو اسے پورا کیا کرو۔ اس کا اس نے تمھیں تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ یہ ہے میرا راستہ جو بالکل سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، وہ یقیناً اس کی راہ سے تمھیں جدا کردیں گے۔ اس بات کی اس نے تمھیں سخت تاکید کی ہے تاکہ تم کج روی سے بچو''۔

آیاتِ مذکورہ میں نو باتوں کو صراط مستقیم میں شمار کیا گیا ہے: (۱) اللہ کی ذات و صفات اور اختیارات میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرنا، (۲) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، (۳) اولاد کو قتل نہ کرنا، (۴) بے شرمی اور بے حیائی کی تمام کھلی اور چھپی باتوں سے اجتناب کرنا، (۵) ناحق کسی شخص کو قتل نہ کرنا، (۶) یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اور اس کو ناروا طریقے سے کھانے سے احتراز کرنا، (۷) انصاف ودیانت کے ساتھ ناپ تول کرنا، (۸) باہمی معاملات میں عدل وانصاف سے کام لینا، (۹) اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنا۔

ان تعلیماتِ قرآنی میں اوّل الذکر توحید کی تعلیم ہے اور آخرالذکر تعلیم کا تعلق بھی توحید ہی سے ہے، یعنی اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کرنا۔ اس عہد سے خدا کی خالص اطاعت وبندگی کا عہد مراد ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دین

دین کے معنی لغت میں متعدد ہیں، مثلاً حساب (یوم الدین)، مذہب، ملت، عادت، سیرت، پرہیزگاری، فرماں برداری، بدلہ، قہر وغلبہ وغیرہ ۔اس کی جمع ادیان ہے۔ کہتے ہیں: قوم دین ''اطاعت گزار لوگ''۔

قرآن میں یہ لفظ اطاعت (یونس ۔۲۲،نحل ۔۵۲)، قانون (نور ۔۲، یوسف ۔ ۷۶) اور حساب وجزا (سورۂ معارج ۔۲، انفطار ۔۱۷) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک سے زیادہ آیات میں یہ مذہب (Religion) کے معنی میں بھی استعمال کیا گیا ہے، مثلاً: لکم دینکم ولی دین (سورۂ کافرون)، دوسری جگہ ہے: ورایت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجا (سورۂ نصر)، ایک اور جگہ ہے: ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم (آل عمران ۔۷۳) ''صرف اسی کی بات مانو جو تمہارے مذہب کا پیرو ہو''۔

لیکن حقیقی دین اللہ کے نزدیک توحید ہے اور اس کا ضد شرک ہے۔ اس اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے تمام انبیاء کا دین ایک تھا یعنی دینِ توحید، جیسا کہ فرمایا ہے:

> شرع لکم من الدین ما وصیٰ بہ نوحا والذی اوحینا
> الیک وما وصینا بہ ابرٰھیم و موسیٰ وعیسیٰ ان
> اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیہ کبر علی المشرکین
> ماتدعوھم الیہ (سورۂ شوریٰ ۔۱۳)
>
> ''اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اس
> نے نوح کو دیا تھا اور جس کا حکم ہم نے تمہاری طرف بھیجا
> ہے، اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا (اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ حکم یہ تھا کہ) دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ تم
جس چیز (یعنی دین توحید) کی طرف انھیں بلاتے ہو وہ
مشرکوں پر بہت گراں ہے''۔

آیت میں جس دین کی اقامت کی بات کہی گئی ہے وہ دینِ توحید ہے، آخری فقرہ "کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ" سے یہ مفہوم بالکل واضح ہوگیا ہے۔ اسی کو ایک دوسری جگہ دین حق کہا گیا ہے اور اس دین کو تمام ادیانِ شرک پر غالب کرنے کے لیے آخری رسول کی بعثت ہوئی تھی۔ ارشاد ہوا ہے:

ھو الّذی ارسل رسوله بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ
علی الدین کلّه ولو کرہ المشرکون o

(سورۂ صف۔۹)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے
ساتھ بھیجا تا کہ جملہ ادیانِ (شرک) پر اس کو غالب کردے،
خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے''۔

اس دینِ حق کے مفہوم کی وضاحت ایک دوسری جگہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ان لفظوں میں کی گئی ہے:

قل یا ایّھا الناس ان کنتم فی شک من دینی فلا
اعبدالّذین تعبدون من دون اللّٰه ولکن اعبداللّٰه
الذی یتوفّٰکم واُمرتُ اَن اَکون من المومنین o واَنْ
اقم وجھک للدین حنیفا ولاتکونَنّ مِن المشرکین o

(سورۂ یونس۔۱۰۴،۱۰۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"کہہ دو، اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے متعلق کوئی شک
ہے تو (سن لو کہ) تم اللہ کے سوا جن باطل معبودوں کی
عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت ہرگز نہیں کرتا، بلکہ اس
اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمھیں وفات دیتا ہے، اور مجھ کو حکم
ملا ہے کہ میں (خدائے واحد کی عبادت میں) یقین رکھنے والا
بنوں اور (یہ بھی حکم ہوا ہے کہ تمھیں بتادوں کہ) تم یکسو ہو کر
اپنا رخ اسی کی اطاعت کی طرف رکھو اور مشرک نہ بنو"۔

اس دین توحید میں اخلاقی تعلیمات بھی شامل ہیں، جیسا کہ سورۂ لقمان میں بیان ہوا ہے (آیات: ۱۳۔۱۹)۔ خدا کی شریعت بھی اس دین کا جز ہے۔ جس طرح اللہ اپنے بندوں کا تنہا معبود ہے، اسی طرح بلاشرکت غیرے ان کا حاکم اور شارع بھی ہے۔ فرمایا ہے:

اَفحکم الجاھلیة یبغون ط ومن احسن من اللہ حکما
لقوم یّوقنون (سورۂ مائدہ۔۵۰)

"کیا یہ لوگ جاہلیت (کے زمانے) کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ جو
لوگ ایمان و یقین رکھتے ہیں، ان کے لیے اللہ سے بڑھ کر
کس کا فیصلہ ہوگا"۔

قرآن میں بالکل واضح لفظوں میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم وقانون کی پیروی نہیں کرتے وہ ناشکرے، ظالم اور فاسق ہیں (مائدہ: ۴۳۔۴۷)۔ لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس حکم (یعنی شریعت) کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے اور یہ اسی وقت مطلوب ہے جب اہل ایمان کو علاقائی بالادستی حاصل ہو یعنی وہ کسی ملک و علاقہ کے مالک اور اس پر حاکم ہوں۔ معلوم ہے کہ سورۂ مائدہ کے احکام مدینہ میں اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وقت نازل ہوئے جب وہاں ایک اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی۔ اس لیے جہاں اسلامی ریاست قائم نہ ہو وہاں کے اہل ایمان نے جن چیزوں کی اقامت مطلوب ہے ان میں توحید خالص، عبادات اور عام اخلاقی تعلیمات شامل ہیں اور ان کا ذکر قرآن کی متعدد سورتوں میں ہوا ہے۔ ان ہی امور کی اقامت سے وہ حالات پیدا ہوں گے جب اہلِ ایمان کے ہاتھوں زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہوگا۔

بہت سے علماء اور بعض دینی جماعتوں نے دین اور اقامتِ دین کے مذکورہ مفہومات کو نظر انداز کر کے دین کا ایک ایسا تصور دیا ہے جس میں اس کا سیاسی پہلو اس کی توحیدی اور اخلاقی تعلیمات پر حاوی ہو گیا ہے[۱]

ظواہرِ قرآن

انسان نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے کئی طریقے ایجاد کیے ہیں اور یہ طریقے ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی نہ کسی شکل میں استعمال ہو رہے ہیں۔ افہام و تفہیم کے ان ذرائع میں سے سب سے عمدہ اور مکمل ذریعہ زبان ہے۔

ہر زبان الفاظ و علامات کا ایک پیچیدہ نظام رکھتی ہے۔ لیکن ان میں جو چیز قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ کہ ہر لفظ خواہ مفرد ہو یا مرکب، ایک مخصوص معنی رکھتا ہے اور جب وہ بولا جاتا ہے تو متکلم اور سامع دونوں اس کو یکساں طور پر سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر اردو میں کہا جائے کہ ''یہ سیب ہے'' تو ایک اردو داں سامع سمجھ لیتا ہے کہ اس سے کون سا پھل مراد ہے۔ وہ اس کو آم نہیں سمجھے گا۔ اگر متکلم اور سامع کے ذہن میں الفاظ کے معنی مختلف ہوں تو پھر افہام و تفہیم ناممکن ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیں، راقم کی کتاب 'احیائے ملت اور دینی جماعتیں' ص ۱۱۸ تا ۱۳۳

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ افہام و تفہیم کی ذہنی سطح یکساں ہوتی ہے لیکن متکلم ذو معنی یا مجازی الفاظ، یا استعارے کا اسلوب استعمال کرتا ہے تو اس صورت میں فہم معنی میں تھوڑی سی دشواری ہو سکتی ہے۔ مثلاً اردو میں کہا جائے: ''دیکھو، دریا کی موجیں ساحل پر اپنا سر پٹک رہی ہیں''، یا ''وہ بالکل گدھا ہے''، یا ''وہ آستین کا سانپ ہے''، یا ''اس کے تو ہاتھ بندھے ہوئے ہیں'' وغیرہ۔

کلام کی اس مجازی صورت کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ متکلم اور سامع دونوں الفاظ کی مختلف معنوی جہتوں اور مجازی اسلوب کلام سے واقف ہوں۔ اختلاف معنی کی صورت میں فیصلہ کے لیے اہل زبان کے استعمالات اور ان کے مقرر کردہ لسانی اصول و قواعد کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اس اصول کا اطلاق عربی زبان پر بھی ہوگا۔ اس زبان میں بھی مفرد اور مرکب اور اصلی و مجازی الفاظ مستعمل ہیں اور ان کے معنی اہل زبان کی بول چال کے مطابق مقرر ہیں۔ ہر لفظ اور ہر فقرہ کے وہی معنی مراد لیے جائیں گے جو ظاہرِ الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ ظواہرِ الفاظ سے عدول صرف اس صورت میں جائز ہوگا جب لسانی یا عقلی بنیاد پر ثابت ہو کہ لفظ یا فقرہ اصلی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے مجازی معنی مراد ہیں۔

قرآن میں مجازی الفاظ و اسالیب بکثرت استعمال ہوئے ہیں، کچھ اس لیے کہ یہ نہایت فصیح و بلیغ زبان میں ہے اور کچھ اس لیے کہ اس میں بہت سے مابعد الطبیعیاتی مسائل زیرِ بحث آئے ہیں۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے 'ید'، 'عین' اور 'وجہ' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے اصلی معنی مراد نہیں ہو سکتے ہیں، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ خدا بھی انسانوں کی طرح ہاتھ اور آنکھ اور چہرہ رکھتا ہے۔ وہ ہر طرح کے تجسّم و تشبیہ سے منزّہ ہے۔ وہ اپنی طاقت و قدرت کے اظہار کے لیے مادّی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذرائع کا محتاج نہیں ہے۔ کسی ظاہری ہاتھ کے بغیر ساری کائنات اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہ مادّی آنکھوں کے بغیر کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو دیکھتا اور ان کی خبر رکھتا ہے۔

معلوم ہے کہ قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک 'محکمات' جن کا معنی ومفہوم واضح ہے اور ان میں ایک سے زیادہ مفہوم لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر آیت کا ایک ہی مدلول ہے۔ ان کا وہی مفہوم صحیح ہوگا جو ظواہرِ الفاظ سے ثابت ہو۔ کسی واضح قرینہ کے بغیر ان کے ظاہری معنی سے انحراف ناجائز ہوگا۔ قرآن کا بڑا حصہ محکم آیات پر مشتمل ہے، یعنی وہ 'امّ الکتاب' ہے (سورہ آل عمران۔ ۷)۔

دوسرا حصہ قرآن کی اصطلاح میں 'متشابہات' کہلاتا ہے۔ اس کا مفہوم محکمات کی طرح بالکل واضح اور متعیّن نہیں ہے، اس میں ایک سے زیادہ معنی کی گنجائش ہے۔ اس طرح کی آیات کا تعلق خدا کی ذات وصفات اور عالمِ غیر مادی یعنی آخرت کے احوال ومقامات سے ہے۔ چونکہ اس عالمِ روحانی کی تشریح انسانی زبان کے ذریعہ سے مشکل تھی کیونکہ وہ مادّی خواص رکھتی ہے، اس لیے تمثیل کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور زیادہ تر مجازی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

قرآن میں اس بات کی وضاحت کردی گئی ہے کہ آیاتِ متشابہات کے اصلی معنی کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے، اس لیے ان پر مجمل ایمان کافی ہے۔ ان کی اصل حقیقت جاننے کے درپے نہ ہوا جائے (آل عمران۔ ۷)۔ ان آیات کے ظواہرِ الفاظ پر اصرار کرنے کے بجائے ان حقائق پر نظر رکھی جائے جن کی طرف اس نوع کی آیات کا مجموعی نظام واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔ لیکن قرآن کی اس وضاحت اور تنبیہ کے باوجود بہت سے فلاسفہ ومتکلمین اور صوفیہ نے آیاتِ متشابہات میں کلام کیا ہے۔ خود بھی فتنہ میں مبتلا ہوئے اور بہتوں کو بھی اس میں مبتلا کیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اتنا ہی نہیں، بہت سے دنیا پرست اور بد باطن علماء نے قرآن کے حصۂ محکمات میں بھی قیل وقال کیا ہے اور اس کے الفاظ کے ظاہری معنی سے انحراف کر کے بہت سی آیات کے وہ معنی بیان کیے ہیں جو لسانی اور عقلی دونوں اعتبار سے بالکل غلط اور لغو ہیں۔

مثلاً، بریلوی مسلک کے حامل علماء نے لکھا ہے کہ والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ (سورۂ ضحیٰ) میں 'والضحیٰ' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور اور 'واللیل' سے آپ کی زلفیں مراد ہیں۔ اس پر مزید گفتگو آگے آئے گی۔

اہلِ تشیع نے بھی اسی طرح کے ستم کیے ہیں۔ مثلاً[1]:

(۱) 'تبت یدا ابی لھب' سے ابو بکرؓ و عمرؓ مراد ہیں۔

(۲) لئن اشرکت لیحبطن عملک (سورۂ زمر-۶۵)۔ ابو بکرؓ و عمرؓ اور علیؓ کے درمیان مسئلہ خلافت میں نزاع کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) انّ اللّٰہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ (بقرہ-۶۷) سے حضرت عائشہؓ مراد ہیں۔

(۴) فقاتلوا ائمۃ الکفر (سورۂ توبہ-۱۲)، طلحہ و زبیر مراد ہیں۔

(۵) مرج البحرین (سورۂ رحمٰن-۱۹)، حسن و حسین مراد ہیں۔

(۶) اللؤلؤ والمرجان (رحمٰن-۲۲) حسن و حسین مراد ہیں۔

(۷) وکل شئی احصیناہ فی امام مبین (سورۂ یٰسٓ-۱۲)، علی ابن طالب مراد ہیں۔

شیعوں کے ردِ عمل میں بعض سنّی علماء نے بھی اسی نوع کی تحریف کا مظاہرہ کیا ہے[2]، مثلاً:

۱؎ مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۸۷ ۲؎ ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) الصابرین والصادقین والقانتین والمنفقین والمستغفرین (سورۂ آل عمران-۱۷) میں صابرین سے رسول اللہ، صادقین سے ابوبکرؓ، قانتین سے عمرؓ، منفقین سے عثمانؓ، اور مستغفرین سے علیؓ مراد ہیں۔

(۲) محمد رسول اللہ والذین معہ (سورۂ فتح-۲۹)، ابوبکر مراد ہیں۔

(۳) سورۂ فتح کی اسی آیت میں 'اشدآء علی الکفار' سے عمرؓ، 'رحمآء بینھم' سے عثمانؓ، 'تراھم رکعاً وسجداً' سے علیؓ مراد ہیں۔

(۴) سورۂ تین میں 'تین' سے مراد ابوبکرؓ، 'زیتون' سے مراد عمرؓ، 'طور سینین' سے عثمانؓ اور 'بلد الامین' سے علیؓ مراد ہیں۔

(۵) لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح (سورۂ حدید-۱۰) سے حضرت ابوبکرؓ مراد ہیں۔

اکثر صوفیہ ظواہر الفاظ سے عدول کر کے بدترین قسم کی تحریفِ معنوی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن سلمی (محمد بن الحسین بن موسیٰ ازدی نیشاپوری (متوفی ۴۱۲ھ ہجری) نے 'حقائق التفسیر' کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے جس میں ظواہر قرآن سے صرف نظر کر کے ہر آیت کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس تفسیر کا صحیح نام 'اباطیل التفسیر' یا 'اضالیل التفسیر' ہونا چاہیے۔ علامہ سبکیؒ لکھتے ہیں:

> "ابوعبدالرحمان شیخ الصوفیہ اور خراسان کے ایک بڑے عالم ہیں اور تصوف میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تفسیر تحریفات سے بھری پڑی ہے۔ ان کی تحریر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرقۂ باطنیہ سے متاثر ہیں"[1]

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس تفسیر کے بارے میں امام ابوالحسن واحدیؒ کی رائے ہے کہ جو شخص اس کو تفسیر کہے اس نے کفر کیا[1]۔ امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ اس تفسیر میں باطل اور فاسد معنی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صاحب تفسیر نے دلیل اور مدلول دونوں میں خطا کی ہے[2]۔

یہ ساری فتنہ انگیزی اس لیے ہوئی کہ ان سب نے ظواہرِ الفاظ سے عدول کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم وصوفی ہونے کے باوجود ان لوگوں نے یہ جسارت کیوں کی؟ راقمِ سطور کا خیال ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ماحول اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے متأثر ہوکر یہ خیال کیا کہ قرآن کے الفاظ کے معنی صرف وہی نہیں ہیں جو ظاہرِ الفاظ سے متبادر ہیں بلکہ ان کے دوسرے معنی بھی ہیں جو پوشیدہ ہیں۔ ظاہرِ الفاظ کے مخاطب عام لوگ ہیں جو علم ونظر سے نہیں رکھتے اور اس کے باطن یعنی پوشیدہ معنی کا تعلق اہلِ دل اور اصحابِ بصیرت سے ہے، جن میں صوفیہ کو بلند درجہ حاصل ہے۔

ظاہر ہے کہ ان کا یہ خیال عقل ونص دونوں اعتبار سے غلط اور گمراہ کن ہے۔ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے (سورۂ نحل-۱۰۳)، یعنی ایک ایسی زبان میں جس کا مفہوم ومدّعا بالکل واضح ہے۔ اس کے اوّلین مخاطب بھی اس کو ایک واضح کلام مانتے تھے۔ قرآن کے الفاظ کا ظاہر ہی ان کے درمیان حجت تھا۔ وہ اس معنی ومفہوم کو خوب سمجھ رہے تھے جو قرآن ان تک منتقل کرنا چاہتا تھا۔ اگر ظواہرِ الفاظ کے علاوہ بھی آیات کے کچھ معانی ہیں تو پھر قرآن سن کر عربوں کی مخالفت کے کوئی معنی نہیں تھے۔ اور جو لوگ قرآن سن کر مسلمان ہو رہے تھے وہ کیا تھا؟ الفاظ کے ظاہری معنی ہی تو تھے جو دلوں میں اتر کر ان کو اپنے آبائی دین کی تبدیلی پر مجبور کر رہے تھے۔ ملحوظ رہے کہ اس وقت تک

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۳

[2] ایضاً ص ۹۲، ۹۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن کتابی صورت میں یکجا نہیں کیا گیا تھا۔

اگر الفاظِ قرآن کے ظاہری معنی کو حجت نہ مانا جائے تو اس کی وہ تمام آیات جو تذکیری مفہوم رکھتی ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے؟ اختلاف کا محل بن جائیں گی اور ان سے جو تذکیر مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ قرآن کے جملہ احکام کی اطلاقی صورتوں کا تعین بہت مشکل ہوگا۔ اس میں بڑا اختلاف واقع ہوگا، کوئی عمل کی ایک صورت تجویز کرے گا اور کوئی دوسری صورت۔ پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قرآن میں جگہ جگہ آیات پر غور و تدبّر کی دعوت دی گئی ہے۔ اب اگر الفاظ کے ظاہری معنی پر استقلال نہ ہو تو پھر آیات میں غور و تدبّر کیوں کر ممکن ہے۔ اور اگر غور کیا جائے گا تو فہم معنی میں شدید اختلاف ہوگا اور اس کو کسی طرح رفع نہ کیا جا سکے گا۔

یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ قرآن ایک لسانی اور علمی معجزہ ہے اور کفارِ عرب کو چیلنج دیا گیا تھا کہ وہ اگر اس کو خدا کا کلام نہیں مانتے ہیں تو اس کا مثل لائیں (سورۂ بقرہ۔۲۳)۔ اس چیلنج کو سن کر کفارِ عرب کہہ سکتے تھے کہ اس کتاب کا مثل کون لا سکتا ہے جس کے الفاظ کے ظاہری معنی کے علاوہ بھی معنی ہیں۔ لیکن عربوں نے قرآن کی تحدّی سن کر اس طرح کا کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ سکوت اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے معنی و مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

ان سب وجوہ سے جن کا اوپر ذکر ہوا، ماننا ہوگا کہ قرآن کے الفاظ کے ظاہری معنی ہی حجت ہیں اور انہیں کے ذریعہ افہام و تفہیم ممکن ہے۔ ظواہرِ الفاظ سے جیسا کہ تفصیل سے ذکر ہوا، عدول صرف اسی صورت میں جائز ہوگا جب کسی واضح قرینہ یا دلیلِ عقلی سے ثابت ہو کہ لفظ اپنے ظاہری معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ناسخ ومنسوخ

علم تفسیر کا یہ ایک مہتم بالشان موضوع ہے، لیکن اس میں بہت اختلاف ہے۔

لغوی اعتبار سے نسخ کے دو معنی ہیں، ازالہ اور نقل وتحویل۔ امام راغب نے اوّل الذکر کی وضاحت میں لکھا ہے:

النسخ : ازالة الشئی بشئی یتعقبه، کنسخ الشمس الظل...... نسخ الکتاب : ازالة الحکم بحکم یتعقبه [1]

''نسخ ایک چیز کو دوسری چیز کے ذریعے سے جو اس کے بعد آئے، ہٹانا ہے، جیسے سورج سائے کو زائل کردیتا ہے۔...... نسخِ کتاب کا مطلب، ایک حکم کو دوسرے حکم کے ذریعہ سے جو اس کے بعد آئے، ہٹانا یا بدل دینا ہے۔''

علماء وفقہاء کی ایک جماعت نے نسخ کے لغوی معنی میں فضول بحثیں کی ہیں۔ کسی نے پہلے معنی کو حقیقت اور دوسرے کو مجاز اور کسی نے اس کے برعکس کہا ہے۔ علامہ آمدی نے اس بحث کو نزاعِ لفظی قرار دیا ہے [2]۔

بہر حال، جب شریعت میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب ایک حکمِ شرعی کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا حکمِ شرعی لانا ہے۔ پہلا منسوخ اور دوسرا ناسخ ہوگا اور یہی حقیقی معنی میں ازالہ ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ لکھتے ہیں:

''آنچہ از استقراء کلام صحابہ وتابعین معلوم شد آنست کہ ایشان نسخ را استعمال می کردند برائے لغوی معنی کہ ازالہ چیزے است بچیزے [3]''

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، ص ۵۳۶ [2] الاحکام، ج ۲، ص ۱۶۱

[3] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۱۵

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

''صحابہ اور تابعین نے اس سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات نسخ کو لغوی معنی میں استعمال کرتے تھے، یعنی ایک چیز کا ازالہ کسی دوسری چیز سے۔''

ہم اپنی گفتگو نسخ کے اسی لغوی مفہوم تک محدود رکھیں گے کیونکہ اس کے دوسرے معنی یعنی نقل و تحویل کا تعلق قرآن سے نہیں ہے۔ قرآن میں اس طرح کا کوئی نسخ واقع نہیں ہوا ہے، جیسا کہ امام جلال الدین سیوطیؒ [1] اور امام بزودیؒ نے لکھا ہے[2]۔

قائلینِ نسخ کا استدلال

جو علماء نسخ کے قائل ہیں ان میں امام فخر الدین رازیؒ بہت نمایاں ہیں۔ انہوں نے نسخ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''ہمارے نزدیک نسخ نہ صرف عقلاً جائز ہے بلکہ وہ واقع بھی ہوا ہے، برخلاف یہودیوں کے کہ ان کا ایک گروہ اس کے وقوع کا منکر ہے۔ ان کا ایک دوسرا گروہ اس کو عقلاً تسلیم تو کرتا ہے لیکن اس کے وقوع کو نہیں مانتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعض مسلمان بھی نسخ کے منکر ہیں۔ نسخ کے جواز کی اہم ترین دلیل یہ ہے کہ اگر ہم بعثتِ محمدی سے پہلے کے شرائع کو منسوخ نہیں مانتے ہیں تو پھر نبوتِ محمدی کے اثباتی دلائل کسی طرح بھی درست قرار نہیں پاتے۔ فی الواقع شرائعِ سابقہ اور خود شریعتِ یہود میں وقوعِ نسخ ایک ثابت شدہ معاملہ ہے۔ چنانچہ تورات ہی میں آیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کی شادی اپنے بیٹوں سے کی تھی اور اب یہ بالاتفاق حرام ہے[3]۔''

علامہ ابوبکر جصاص بھی نسخ کے قائل ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''متاخرین علماء

---

1. الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۱
2. کشف بزودی، ج ۳، ص ۸۷۵
3. تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۲۲۷ (بالاختصار)

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

میں سے ایک صاحب کا یہ خیال ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا ہے اور قرآن میں جہاں کہیں نسخ کا ذکر آیا ہے اس سے سابقہ کتبِ سماویہ کا نسخ مراد ہے، مثلاً سبت اور مشرق و مغرب کی طرف نماز پڑھنا وغیرہ۔ شریعتِ محمدی کا اس نسخ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ یہ دائمی شریعت ہے اور تا قیامت باقی رہنے والی ہے۔ یہ بات مطلق درست نہیں ہے اور اس شخص سے پہلے کسی نے بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا ہے۔ سلف اور خلف کے تمام علماءِ اُمت نے اس مسئلہ میں کافی غور و خوض کیا ہے اور شریعت محمدی کے منسوخات کو متعین کر کے انہیں ہم تک من و عن منتقل کر دیا ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کی تاویل جائز ہے[۱]"۔

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ "اس شخص نے ناسخ و منسوخ آیات اور ان سے متعلق احکام کے بارے میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو علماء اُمت کے خیالات واقوال سے بالکل جداگانہ ہیں اور ان کے وہ معنی مراد لیے ہیں جو بالکل غیر واضح اور نادرست ہیں اور جن کو قبول کرنے سے عقل ابا کرتی ہے[۲]"

مذکورہ اقتباس میں 'اس شخص' سے مراد ابو مسلم اصفہانی ہیں۔ وہ نسخ کے منکر تھے۔ ان کا ذکر آگے آرہا ہے۔ جو لوگ نسخ کے قائل ہیں ان کے دلائل کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا یہ قول 'ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا' (بقرہ۔۱۰۶) وقوعِ نسخ پر صریح دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح آیت: واذا بدلنا آیۃ

---

[۱] احکام القرآن، ج ۱، ص ۶۷

[۲] ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکان آیة واللّٰہ اعلم بماینزل قالوا انما انت مفتر (سورۂ نحل-۱۰۱) سے آیات واحکام میں تبدیلی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: سیقول السفھآء من الناس ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا (بقرہ-۱۴۲)، مزید فرمایا ہے: قد نری تقلب وجھک فی السمآء فلنولینّک قبلة ترضاھا فولّ وجھک شطر المسجد الحرام (بقرہ-۱۴۴)۔ ابتدا میں مسلمان بیت المقدس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے تھے، پھر اس کو منسوخ کرکے انہیں مسجد حرام کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

(۳) اللہ نے فرمایا ہے کہ مرد بوقت وفات اپنی بیویوں کے حق میں ایک سال کے لیے نان ونفقہ اور غیر اخراج کی وصیت کر جائیں: والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لازواجھم متاعا الی الحول (بقرہ-۲۴۰)۔ یہ حکم آیتِ میراث سے منسوخ ہو گیا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ فرمایا ہے: ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا ماتین (سورۂ انفال-۶۵)۔ بعد میں مومنین اور کفار میں اس ایک اور دس کی نسبت کو منسوخ کرکے ایک اور دو کی نسبت متعین کی گئی، فرمایا ہے: الآن خفف اللّٰہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا فان یکن منکم مائة صابرة یغلبوا ماتین (انفال-۶۶)[1]

مذکورہ دلائل کی بنیاد پر نسخ کے قائل علماء کہتے ہیں کہ وقوعِ نسخ پر امت کا اجماع ہے، اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ "ناسخ ومنسوخ کی شناخت کی دین میں بڑی اہمیت ہے اور اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ علماء وفقہاء نے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں، تفسیر کبیر، ج ۳، ص ۲۳۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کی معرفت سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ اس کا انکار صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو کم علم اور غبی ہیں۔ اس لیے کہ اسی بات پر نزولِ احکام کی ترتیب کا مدار ہے اور اسی سے حلال وحرام میں تمیز ممکن ہے۔ متاخرین میں سے ایک گروہ اس کے جواز کا منکر ہے۔ لیکن اس باب میں علماء سلف کا جو اجماع ہے وہ ان کے خلاف ایک برہانِ قاطع ہے۔ ان کے خیالات ایسے نہیں ہیں کہ ان پر ادنیٰ توجہ بھی دی جائے[1]۔"

اقسامِ نسخ

جو لوگ نسخ کے قائل ہیں انھوں نے اس کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) نسخ التلاوة والحکم معاً، یعنی تلاوت اور نسخ دونوں منسوخ ہیں، (۲) نسخ التلاوة مع بقاء الحکم، یعنی تلاوت منسوخ لیکن حکم باقی ہے، (۳) نسخ الحکم وبقاء التلاوة، یعنی حکم منسوخ لیکن تلاوت باقی ہے۔

نسخ کی پہلی قسم میں تلاوت اور اس حکم پر عمل دونوں ممنوع ہیں، اس لیے کہ وہ بالکل منسوخ ہو چکے ہیں۔ اس کی مثال میں آیت تحریم پیش کی جاتی ہے۔ نسخ کی دوسری قسم میں تلاوت تو منسوخ ہے لیکن حکم منسوخ نہیں ہے۔ اس خیال کی بنیاد اس روایت پر ہے کہ سورۂ نور میں آیتِ رجم موجود تھی یعنی الشیخ والشیخة الخ۔

نسخ کی تیسری قسم میں حکم تو منسوخ ہے لیکن تلاوت منسوخ نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی نسخ کی مثالیں قرآن میں بکثرت ہیں۔ علامہ زرکشی کے لکھنے کے مطابق قرآن کی ۶۳ سورتوں میں اس نوع کا نسخ موجود ہے، مثلاً وصیت، عدت، تحویلِ قبلہ، صیام، رسول سے سرگوشی سے پہلے صدقہ دینا، مشرکین سے قتال کرنے سے متعلق آیات وغیرہ۔

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۲، ص ۵۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نسخ کے منکر علماء کے دلائل

جو علماء قرآن میں کسی طرح کے نسخ کے منکر ہیں ان میں ابو مسلم اصفہانی قابل ذکر ہیں۔ ان کا ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ نے قرآن کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے: لایاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه (سورۂ حم سجدہ-۴۲)۔ اگر نسخ کو درست تسلیم کیا جائے تو پھر ماننا ہوگا کہ باطل اس کے قریب آ سکتا ہے اور اس کو مس کر سکتا ہے۔

(۲) قرآن میں جہاں کہیں نسخ کا ذکر آیا ہے، مثلاً ماننسخ من آیة الخ (بقرہ۔۱۰۶)، اس سے کتب سابقہ یعنی تورات وانجیل کے شرائع کا نسخ یا لوحِ محفوظ سے کتب سماویہ کا نقل و تحویل مراد ہے۔

(۳) احکام سے متعلق آیاتِ سابقہ میں جو نسخ کی بات کہی گئی ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ نسخ واقع ہوا ہے بلکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر نسخ واقع بھی ہوا ہے تو وہ محض تبدیلیِ صورت ہے، یعنی ناسخ یا تو منسوخ کے مثل ہوتا ہے یا اس سے بہتر۔ اس تبدیلی کو نسخ کون کہہ سکتا ہے۔

ہندی علماء میں سرسید نسخ کے منکر تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قرآن میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے، یعنی اس کی کوئی آیت دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی ہے۔ آگے انہوں نے عربی میں لکھا ہے۔ پہلے عربی عبارت ملاحظہ ہو اور پھر اس کا ترجمہ جو راقم نے کیا ہے:

ولیس فی القرآن نوع من الاشارۃ علی ھذا، واما آیتہ:

ماننسخ من آیة اوننسھا نات بخیر منھا اومثلھا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متعلقة بشرایع ماقبل الاسلام بآیات القرآن، ولا شک ان اهل الکتاب من الیهود والنصاریٰ والمشرکین لایودون من احکام الاسلام ما خلف شرایعهم، لذکره سبحانه تعالیٰ اوّلا وقال: مایود الذین کفرو امن اهل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللّٰهُ یختص برحمته من یشآء واللّٰهُ ذوالفضل العظیم، ثم قال: مانسخ من آیة اوننسهانات بخیر منها او مثلها، الم تعلم ان اللّٰه علیٰ کل شیٔ قدیر (بقرہ۔۹۶،۱۰۰)۔ فظاهر ان النسخ المذکور فی الآیة المذکورة متعلق بشرایع ماقبل الاسلام لا بآیات القرآن، ولا دلیل علیٰ ان المراد بلفظ الآیة فی قوله: واذابدلنا آیة مکان آیة (نحل –۱۰۳) آیات القرآن، ولا دلیل علیٰ ان قوله: یمحوا اللّٰه مایشاء ویثبت وعنده ام الکتاب (رعد–۳۹) متعلق بنسخ آیات القرآن [1]"

"اس نوع کے نسخ کی طرف قرآن میں کوئی بھی اشارہ نہیں ہے۔ رہی قرآن کی یہ آیت: مانسخ من آیة اوننسها الخ اور اسی طرح کی دوسری آیات تو ان کا تعلق ماقبلِ اسلام کی شرائع کے نسخ سے ہے اور ان کی ناسخ قرآن کی آیات ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ اور مشرکین اسلام کے ان احکام کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے جو ان کی شریعتوں کے برعکس تھے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے پہلے

---

[1] تفسیر القرآن (تحریری اصول التفسیر)، ج ۱، ص ۱۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تو فرمایا: مایود الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین...
...... پھر فرمایا: ماننسخ من آیۃ اوننسھا...... الخ اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ آیات میں جس نسخ کا ذکر ہوا ہے ان کا تعلق ماقبلِ اسلام کی شرائع سے ہے۔ اور اس کی کوئی دلیل نہیں کہ اللہ کے قول: واذا بدلنا آیۃ مکان آیۃ (نحل-۱۰۳) میں آیت سے مراد قرآن کی آیات ہیں۔ اس کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اللہ کا یہ قول: یمحوا اللّٰہ مایشآء ویثبت...... آیاتِ قرآن کے نسخ سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔"

شاہ ولی اللہ دہلوی "بھی نسخ کے قائل نہیں تھے، لیکن حزم و احتیاط کی وجہ سے کھلے لفظوں میں اس کا انکار نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ناسخ و منسوخ کی معرفت فنِ تفسیر میں ایک مشکل مسئلہ ہے، جس کے اندر بڑی بڑی بحثیں اور بے شمار اختلافات ہیں۔ اس کے اشکال کے اسباب میں سب سے زیادہ قوی سبب متقدمین اور متاخرین کی اصطلاح کا اختلاف ہے۔ اس باب میں حضرات صحابہ اور تابعین کے کلام کے استقراء سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات نسخ کو اس کے لغوی معنیٰ (یعنی ایک چیز کا ازالہ دوسری چیز کے ذریعہ سے) میں استعمال کرتے تھے نہ کہ اہلِ اصول کی اصطلاح کے موافق [1]۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

"علامہ جلال الدین سیوطی نے مذکورہ بالا بیان کو بعض علماء کی کتابوں سے لے کر اپنی کتاب میں مناسب بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور جو

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۳۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیات متاخرین کی رائے پر منسوخ ہیں ان کو ابن العربی کے موافق تحریر کرکے تقریباً بیس منسوخ آیتیں گنوائی ہیں۔ لیکن فقیر کو ان بیس میں بھی اکثر کی نسبت کلام ہے[1]۔"

بعض ہندی علماء نے اس مسئلہ میں درمیانی راہ اختیار کی ہے، یعنی وہ صرف قرآن کی ان چند آیات میں نسخ کو مانتے ہیں جن کا تعلق احکام سے ہے۔ مولانا عبدالحق حقانی نے لکھا ہے کہ "ابومسلم وغیرہ علماء کا خیال ہے کہ نہ احکام میں نسخ ہوا ہے نہ آیات کے الفاظ میں۔ جن احکام کو منسوخ کہا جاتا ہے دراصل وہاں تعمیم وتخصیص ہے یا وہ احکام دراصل واجب وفرض نہ تھے۔ لوگ ان کو عمل میں بطور واجب کے لاتے تھے۔ بعد میں واضح کردیا گیا کہ یہ واجب نہیں۔ اس بات کو علماء نے نسخ سمجھ لیا۔ اور جن کو آیاتِ منسوخ عن التلاوۃ کہا جاتا ہے وہ دراصل قرآن نہ تھا بلکہ حضرت رسول کریم صلعم کی تفسیر تھی جس کو صحابہ نے متبرک سمجھ کر ان آیات کے ساتھ ملا کر مصاحف میں لکھ لیا تھا۔ قرآن جب جمع کیا گیا اور ان تفسیری جملوں کو ترک کیا گیا تو لوگوں نے سمجھ لیا کہ وہ منسوخ التلاوۃ ہوگئے اور بے احتیاط محدثوں نے اس کی بابت حدیثیں روایت کردیں جو بیشتر غلط ہیں[2]۔"

مولانا حقانی صرف احکام میں نسخ کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نسخ ہوسکتا ہے صرف احکامِ عملیہ میں اور احکام عملیہ کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک اصول جیسے نماز و زکوٰۃ اور مکارم اخلاق......ان میں نسخ نہیں...... دوم فروعِ عملیات یعنی ان احکام کے قوالب اور صورتیں، البتہ ان میں حسبِ ضرورت

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۳۲،۳۳

[2] البیان فی علوم القرآن، (مقدمہ تفسیر حقانی)، ص ۷۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وقت و بلحاظِ اقوام ضرور نسخ ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے [1]۔"

جن احکام میں نسخ ہوا ہے ان کے متعلق ارشاد ہے کہ "پانچ حکموں میں نسخ پایا گیا ہے: (۱) ابتدائے اسلام میں میراث کے حکم سے پہلے وصیت فرض تھی۔ یہ حکم آیتِ میراث سے منسوخ ہوگیا، (۲) ابتدائے اسلام میں متوفیہ کے لئے ایک سال کی عدّت تھی، بعد میں یہ چار مہینے دس دن ہوگئی، (۳) ابتدائے اسلام میں چند کفار سے مقابلہ فرض تھا (ان یکن منکم عشرون صابرون)، بعد میں دو چندے مقابلہ کرنا باقی رہ گیا (فان یکن منکم ماۃ صابرۃ)، (۴) آنحضور کو موجودہ بیویوں کے علاوہ سے نکاح ممنوع تھا (لا یحل لک النساء)، یہ حکم اس آیت سے منسوخ ہوگیا (سورۂ احزاب۔۵۰)، (۵) مدینہ میں بغیر صدقہ کے سرگوشی ممنوع تھی مگر بعد میں یہ حکم تبدیل ہوگیا [2]"

مولانا امین احسن اصلاحی بھی محدود نسخ کے قائل ہیں۔ لکھتے ہیں:

"مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی کہ سورۂ بقرہ کی زیرِ بحث آیت (۱۰۶) کا تعلق تمام تر ادیانِ سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں، دوسرا گروہ اس کا یک قلم منکر ہے، تیسرا گروہ

---

[1] البیان فی علوم القرآن، (مقدمہ تفسیر حقانی)، ص ۴۷۵

[2] ایضاً، ص ۴۷۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکامات تک محدود مانتا ہے[1] "

مولانا نے آگے ان تینوں گروہوں کے نقطۂ نظر کی تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان میں سے پہلے گروہ نے اس دائرے کو جو بہت وسعت دی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے۔ یہ لوگ ان تمام مواقع میں بھی نسخ مانتے ہیں جہاں کوئی بات کسی عام کو خاص یا خاص کو عام کر رہی ہو یا کسی اجمال کو تفصیل کا رنگ دے رہی ہو، حالانکہ اس طرح کے مواقع میں نسخ ماننے سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ عام وخاص اور مجمل و مفصل کے درمیان توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ توفیق نہایت آسانی سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ جو گروہ نسخ کا یک قلم منکر ہے اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں، جو احکام منسوخ ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہوئے ہیں کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات دوبارہ پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سر نو بحال ہو جائیں گے...... ہمارے نزدیک اس رائے میں متعدد غلطیاں ہیں[2]"

مولانا نے آگے خود اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان وجوہ کی بنا پر ہم نسخ کے باب میں مذکورہ بالا دونوں مسلکوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا مسلک یعنی ان لوگوں کا مسلک جو قرآن کی بعض آیات کو منسوخ مانتے ہیں، ہمارے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے...... یہاں چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیں، ایک تو یہ کہ قرآن کا کوئی حکم منسوخ ہوا ہے تو قرآن ہی سے منسوخ ہوا ہے اور یہ ناسخ و منسوخ دونوں قرآن میں موجود ہیں...... بعض فقہاء نے حدیث کو بھی ناسخ مانا ہے لیکن ہمارے

---

[1] تدبر قرآن، ج۱، ص ۲۱۳

[2] ایضاً، ج۱، ص ۲۱۳، ۲۱۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے...... دوسری یہ کہ اس نسخ کا تعلق تمام تر صرف احکام وقوانین سے ہے، عقاید وایمانیات یا اخلاق وصفات یا واقعات وحقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے[1]۔"

راقمِ سطور کا نقطۂ نظر

اس باب میں راقمِ سطور کا خیال ہے کہ قرآن میں کسی طرح کا کوئی نسخ نہیں ہوا ہے۔ قرآن میں نسخ کو ماننے کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا کی یہ آخری کتاب ایک مکمل ہدایت نامہ اور دائمی شریعت نہیں ہے۔ نسخ عدمِ تکمیل کی دلیل ہے حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے: الیوم اکملت لکم دینکم ......الخ (مائدہ-۳)

نسخ کے قائل علماء نے جوازِ نسخ کے جو دلائل دیے ہیں اور ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، وہ محلِ نظر ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ان دلائل پر تفصیل سے گفتگو کروں تاکہ ان کا ضعف واضح ہو جائے اور یہ بات ثابت ہو جائے کہ قرآن میں کسی نوع کا بھی نسخ واقع نہیں ہوا ہے۔

عام طور پر نسخ کے ثبوت میں وہ آیتیں پیش کی جاتی ہیں جن میں نسخ کا لفظ استعمال ہوا ہے، مثلاً یہ آیت: ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات بخیر منھا او مثلھا (بقرہ-۱۰۶)۔ اس آیت میں جس نسخ کی بات کہی گئی ہے اس کا تعلق یہودیوں کی شریعت سے ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہود مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے تھے کہ جب قرآن حضرت موسیٰ کو خدا کا پیغمبر اور تورات کو خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو پھر تورات کے احکام میں ردوبدل کے کیا معنیٰ؟ کیا خدا اپنے بنائے

---

[1] تدبر قرآن، ج۱، ص۲۱۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوئے قوانین کو خود اپنے ہی ہاتھوں بدلتا ہے، کیا اب تجربہ کے بعد خدا پر اپنی غلطیاں واضح ہو رہی ہیں اور وہ ان کی اصلاح کر رہا ہے[1]"

یہود کو جو شریعت دی گئی تھی وہ ان کے سماجی اور تمدنی حالات کے لحاظ سے دی گئی تھی لیکن عہد نبوی کا سماج اور اس کے تمدنی حالات ان سے بالکل مختلف تھے، اس لیے ناگزیر تھا کہ پچھلی شریعت میں حالات و مقتضیاتِ زمانہ کی رعایت سے ضروری تبدیلی کی جائے۔ اس سلسلے میں یہودیوں کا اعتراض ان کی کم علمی، مذہبی تعصب اور شریعت کی غرض و غایت سے ان کی ناواقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

نسخ کی تائید میں جو دوسری آیتیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:
واذا بدلنا آیة مکان آیة ......الخ (نحل-۱۰۱)۔ اس آیت کا بھی نسخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں تبدیلِ آیات سے مراد تصریفِ آیات ہے۔ یہ قرآن کا ایک مخصوص اسلوب بیان ہے کہ اس میں ایک ہی بات کو مختلف الفاظ اور اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔ کہیں ایک بات کو مجمل طور پر بیان کیا گیا ہے تو دوسری جگہ تفصیل سے، کہیں واقعہ کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے اور کہیں دوسرے پہلو کو، کہیں اثبات حق میں ایک دلیل دی گئی ہے تو کہیں دوسری دلیل۔ اسی طرح ایک ہی واقعہ یا مضمون مواقعِ بیان کے لحاظ سے مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس تکرارِ مضمون سے نہ تو کلام میں کہیں کوئی عیب پیدا ہوا اور نہ ہی قاری کوئی اکتاہٹ اور بے لطفی محسوس کرتا ہے بلکہ ہر جگہ حسنِ زبان و معنی کا ایک نیا جلوہ اس کی آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور وہ طرز بیان کی نیرنگیوں سے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تذکیر کے پہلو سے بھی یہ اسلوب بیان نہایت حکیمانہ ہے۔ انسان بسا اوقات طولِ بیان اور طرز بیان کی یکسانیت سے

---

[1] تدبر قرآن، ج ۱، ص ۲۹۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گھبرا جاتا ہے۔ اللہ نے انسانی فطرت کی رعایت کرتے ہوئے ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ واسالیب میں بیان کیا ہے تاکہ تذکیر کا مقصد بدرجۂ اتم حاصل ہو سکے۔

لیکن کفارِ عرب کلام کی اس حکمت کو نہ سمجھ سکے اور انہوں نے اعتراض کیا کہ اگر قرآن خدا کا کلام ہے تو پورا واقعہ ایک جگہ اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ کیوں نہیں بیان کیا گیا ہے، الفاظ اور بیان بار بار کیوں بدلے جاتے ہیں؟ الفاظ اور جملے بدلنا انسانی کلام کی صفت ہے نہ کہ خدائی کلام کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے۔ اسی اعتراض کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے۔ اس کا نسخ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسری آیت جو نسخ کی تائید میں پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے: سیقول السفهآء ما ولّٰهم عن قبلتهم التی کانوا علیها (بقرہ-۱۴۲)۔ معلوم ہے کہ ابتدائے اسلام میں مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے، بعد میں انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مسجد حرام کو اپنا قبلہ بنا کر نماز ادا کریں۔ بظاہر تو یہ ایک حکم کی تبدیلی معلوم ہوتی ہے لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔

بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ فی الواقع اہل ایمان کا قبلہ تھا بلکہ اس کی غرض امتحان تھا اور آیت مذکورہ سے متصل ہی اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے:

وما جعلنا القبلة الّتی کنت علیها الا لنعلم من یتّبع
الرسول ممن ینقلب علیٰ عقبیه (سورۂ بقرہ-۱۴۳)
"ہم نے تمہارے لیے جو قبلہ مقرر کیا تھا اور جس پر تم (اس حکم
کے آنے سے پہلے تک) قائم تھے، وہ اس لیے تھا تاکہ ہم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون روگردانی

کرتا ہے۔"

یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہودی 'خیمۂ اجتماع' میں عبادت وقربانی کے وقت جنوب کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوتے تھے اور مکہ مکرمہ جنوب ہی میں واقع ہے، گویا وہ مسجد حرام ہی کی طرف منھ کر کے عبادت کرتے تھے، لیکن اس سے بے خبر تھے۔ معلوم ہوا کہ یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کا قبلۂ عبادت شروع سے خانۂ کعبہ تھا تو پھر حکم میں تبدیلی کی بات خود بخود غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

ثبوتِ نسخ سے متعلق تیسری آیت ہے: والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لازواجھم متاعاً الی الحول غیر اخراج (سورۂ بقرہ-۲۴۰)۔ اس آیت کو آیتِ میراث سے منسوخ بتایا گیا ہے، لیکن یہ منسوخ نہیں ہے۔ یہ دراصل توضیحی آیت ہے جیسا کہ کذالک یبیّن اللہ ایٰتہ الخ (بقرہ:۲۴۱) سے بالکل واضح ہے۔ بیوہ کی عدت کو جو چار مہینے دس دن تھی (والّذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً یتربّصن بانفسھنّ اربعة اشھر وعشرا (بقرہ-۲۳۴)، اس کی دل جوئی کے خیال سے بڑھا دیا گیا ہے۔ اصل عدت (چار مہینے دس دن) کی پابندی اس کے لیے لازمی ہے۔ لیکن اضافی مدت (سات مہینے بیس دن) میں اگر وہ گھر سے نکلنا چاہے یا کسی سے نکاح کرنا چاہے تو ایسا کر سکتی ہے۔

ثبوتِ نسخ میں پیش کی جانے والی چوتھی آیت ہے: ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا ماتین...... (سورہ انفال-۶۵)۔ اس آیت میں مومنوں اور کافروں کے درمیان ایک اور دس کی نسبت رکھی گئی ہے، یعنی بیس مومن دو سو کفار پر غالب آجائیں گے۔ لیکن بعد میں یہ نسبت ایک اور دو کی ہوگئی: فان یکن منکم ماة صابرة

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یغلبوا مائتین الخ (بقرہ-٦٦)، یعنی ۱۰۰ مومن ۲۰۰ کافروں پر غالب آ جائیں گے۔

میری فہم سے بالاتر ہے کہ اس میں نسخ کی کیا بات ہے۔ اس کو نسخ پر محمول کرنا اللہ تعالیٰ کے علم و خبر کی نفی کرنا ہے۔ دراصل پہلی آیت میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر اہلِ ایمان صبر و ثبات کا کامل نمونہ ہوں تو وہ اللہ کی نصرت سے اپنے سے دس گنا کفار پر غالب آ جائیں گے۔ اس ایمانی قاعدۂ کلیہ کے ذکر کے بعد فرمایا کہ چونکہ مسلمانوں کی ایمانی حالت میں ابھی کچھ کمی ہے اس لیے فی الحال مسلمانوں اور کافروں کے مابین ایک اور دس کے بجائے ایک اور دو کی نسبت ہے۔ جب وہ اپنی ایمانی حالت میں ترقی کر کے مقامِ مطلوب تک پہنچ جائیں گے تو پھر سورۂ انفال کی آیت ٦۵ کے مطابق یہ نسبت ایک اور دو سے بڑھ کر ایک اور دس کی ہو گی۔

آیتِ میراث کو ثبوتِ نسخ میں ایک بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ابو مسلم اصفہانی نے جو نسخ کے منکر تھے، اس آیت کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ ان کا ذکر امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں کیا ہے۔ ایک توجیہ یہ ہے کہ آیتِ میراث نے آیتِ وصیت کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ تخصیص کی ہے اور وہ یہ کہ آیتِ وصیت کے مطابق اقربا کے حق میں وصیت کی جا سکتی تھی لیکن آیتِ میراث نے ان اقارب کو وصیت کے دائرہ سے خارج کر دیا ہے جو وارث ہوں۔ لیکن جو اقارب وارث نہ ہوں ان پر آیتِ وصیت کا اطلاق ہو گا، یعنی ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے۔[1] بلاشبہ یہ ایک معقول توجیہ ہے۔ بعض لوگ حدیث 'لا وصیة لوارث' کو آیتِ وصیت کا ناسخ مانتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ حدیث نے وصیت کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ آیتِ میراث کی وضاحت کی ہے کہ جن وارثوں کا حق آیت میں مقرر کر دیا گیا ہے ان کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں، تفسیر کبیر، ج ۲، ص ۱٦۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اقسامِ نسخ کی مغالطہ انگیزی

دلائلِ نسخ کی طرح اقسامِ نسخ بھی مغالطہ انگیز ہیں۔ نسخ کی پہلی قسم 'نسخ التلاوۃ والحکم' ہے، یعنی جس میں نہ آیت کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ حکم پر عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن میں اس نوع کا کوئی نسخ نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے جو حدیث مروی ہے وہ بالکل موضوع ہے۔

نسخ کی دوسری قسم 'نسخ التلاوۃ مع بقاء الحکم' ہے، یعنی جس میں تلاوت موقوف لیکن حکم باقی ہے۔ ثبوت میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے: الشیخ والشیخۃ اذا زانیا فارجموھما البتۃ نکالاً من اللہ واللہ عزیز حکیم[1] "بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت اگر زنا کریں تو دونوں کو ضرور پتھر مار کر ہلاک کر دو۔ اللہ کی طرف سے یہ ایک عبرتناک سزا ہے اور اللہ زبردست اور حکمت والا ہے۔"

کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ آیت قرآن میں موجود تھی، بعد میں اس کو نکال دیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ جب اس کا حکم باقی ہے تو اس کو نکال کیوں دیا گیا، پھر یہ آیت کس کے حکم سے نکالی گئی؟ اس سوال کا کوئی جواب کسی عالم و محدث کے پاس نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ ناقابلِ یقین بات یہ روایت ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اس متروک آیت کو دوبارہ مصحف میں لکھوانا چاہتے تھے لیکن اس خوف سے باز رہے کہ لوگ کہیں گے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کر دیا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

لولا ان یقول الناس زاد عمر بن الخطاب فی کتاب اللہ لکتبتھا: الشیخ الخ[2]

---

[1] رواہ البخاری

[2] موطا، کتاب الحدود، مزید دیکھیں، البرہان فی علوم القرآن، علامہ زرکشی، ج ۲، ص ۲۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر بن الخطاب نے اللہ کی کتاب میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو لکھ دیتا: بوڑھا زانی الخ"۔

غور فرمائیں، یہ بات صرف حضرت عمر فاروقؓ جانتے تھے کہ پہلے یہ آیت قرآن میں موجود تھی، دوسرے صحابہ جن میں کاتبینِ وحی بھی شامل ہیں، اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔ اگر بفرض محال یہ آیت قرآن میں تھی اور کسی نے نکال دی اور اس بات کا علم صرف حضرت عمر فاروقؓ کو تھا تو ان کے بے مثال کردار سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی کے خوف سے حق بات کہنے سے باز آ گئے۔ یہ بالکل موضوع روایت ہے جو اس لیے گھڑی گئی ہے تاکہ حکمِ رجم کو قرآن سے ثابت کیا جائے۔

لیکن اس مذموم کوشش میں واضعِ حدیث نے قرآن اور حضرت عمر فاروقؓ دونوں کے ساتھ ظلمِ عظیم کیا ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر کون دعویٰ سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی ہے اور یہ مکمل طور پر وہی قرآن ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور خلیفۂ اوّل کے وقت میں اس کو ایک مصحف کی صورت میں جمع کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تواتر کی حد تک پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ اس کتاب میں لفظ و آیت تو کجا ایک حرف و شوشہ کا بھی حذف و اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اور یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے۔

نسخ کی تیسری قسم 'نسخ الحکم وبقاء التلاوۃ' ہے، یعنی جس میں حکم تو منسوخ ہے لیکن اس کے الفاظ کی تلاوت ہوتی ہے۔ زیادہ تر منسوخات کو اسی زمرہ میں داخل کیا گیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نسخِ احکام کی حقیقت

قرآن کے احکام وقوانین میں نسخ کی سب سے بڑی دلیل قائلین نسخ کی طرف سے یہ دی جاتی ہے کہ اسلامی شریعت سماجی حالات اور انسانی مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ تکمیل کو پہنچی ہے۔ اس لیے وہ احکام جو مرحلۂ تکمیل سے پہلے نازل ہوئے تھے وہ خود بخود کالعدم ہو گئے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

> ''جملہ اصحاب علم یہ بات مانتے ہیں کہ انبیاء کی شریعتوں میں انسانوں کے دینی اور دنیوی دونوں مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ جس طرح ایک طبیب (نسخہ نویسی میں) مریض کے جملہ احوال وکوائف پر برابر نظر رکھتا ہے، اسی طرح ایک عالم بھی اُمت کے مصالح پر نگاہ رکھتا ہے اور ان کی تبدیلی کے ساتھ اپنے خطاب کا رخ بدل لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اپنی مشیت سے اپنی مخلوق کے مصالح پر ہر وقت نگاہ رکھتا ہے۔ حالات کے تحت اس کا خطاب تو تبدیل ہو جاتا ہے لیکن اس کے علم وارادہ میں کوئی تغیر نہیں ہوتا[1]۔''

اس سلسلے میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''معاشرہ کے ابتدائی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے کوئی بات میں کوئی عارضی حکم دیا جائے اور جب معاشرہ اپنے بلوغ کو پہنچ جائے تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا جائے۔ مثلاً بعض متروکہ ورثاء کے حقوق کے تحفظ کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا، بعد کو رفتہ رفتہ کے

[1] تفسیر قرطبی، ج ۲، ص ۵۷

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

سدباب کے لیے پنچایتی قسم کی تعزیری ہدایت کی گئی، انصار ومہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا، لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی [1]"۔

یہ بات اصولی حیثیت سے بالکل صحیح ہے کہ اسلام کے احکام وقوانین میں سماجی حالات، تمدنی ضروریات اور انسانی مصالح کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ان کو تدریجاً نافذ کیا گیا ہے۔ لیکن اس تدریج وتکمیل کی بنیاد پر یہ کہنا کہ ابتدائی دور کے احکام یا علماء وفقہاء کی تشریح کے مطابق عارضی قوانین منسوخ ہو چکے ہیں، کلّی طور پر صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ عہد نبوی میں حتمی قوانین کے نزول کے بعد اس سے پہلے کے احکام پر عمل ترک کر دیا گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عارضی قوانین تھے اس لیے مستقل قوانین کی تشکیل کے بعد وہ کالعدم ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات میں مستقل قانون تھے۔ اس بنا پر وہ منسوخ نہیں صرف معطل ہوئے ہیں اور یہ تعطّل (Suspension) بھی صرف عہد نبوی کے سماج کے لیے تھا۔ اس کا اطلاق بعد کے ادوار بالخصوص عہدِ حاضر کے سماجوں پر نہیں ہوگا، جو عہد نبوی کے سماج سے ہر اعتبار سے مختلف ہیں۔

ہمارے علماء وفقہاء ایک طرف تو یہ کہتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، کہ اسلامی احکام وقوانین میں سماجی حالات اور انسانی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور دوسری طرف جب اسلامی شریعت کی تنفیذ کی بات آتی ہے تو وہ اس اصولِ تشریع کو بھول جاتے

---

[1] تدبر قرآن، ج ۱، ص ۳۱۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں اور موجودہ دور میں اسلامی شریعت کو جو عہد نبوی میں درجہ بدرجہ نافذ ہوئی تھی، یک لخت نافذ کرنے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ وہ یہ امر فراموش کر دیتے ہیں کہ کوئی بھی سماج ہو جس میں بگڑا ہوا مسلم سماج بھی شامل ہے، وہ ایمان و عمل کے لحاظ سے بتدریج ترقی کر کے اپنے بلوغ کو پہنچے گا۔ اس لیے دورِ طفولیت میں دورِ بلوغ کے قوانین کا نفاذ اس کے ساتھ صریح ناانصافی ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے ایک بچے کو کسی بالغ آدمی کا لباس پہنا دیا جائے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ جب اسلام آیا تو اس وقت کا عربی سماج ایمانی نقطۂ نظر سے اپنے عہد طفولیت میں تھا بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس سے بھی زیادہ کمزور حالت میں تھا۔ اس لیے اس کی اصلاح و تعمیر میں صبر وضبط اور اصولِ تدریج کو ہر قدم پر ملحوظ رکھا گیا۔ چنانچہ ابتدا میں افرادِ معاشرہ کی ذہنی اور اخلاقی حالت کے مطابق احکام نازل کیے گئے۔ جیسے جیسے ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت میں ترقی ہوتی گئی اسلامی احکام و قوانین میں بھی اسی کی مناسبت سے اضافہ کیا گیا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب دین ہر اعتبار سے کامل ہو گیا اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا (سورۂ مائدہ-۲)۔

یہاں ملحوظ رہے کہ تمام احکام و قوانین خواہ وہ عربی سماج کے عہدِ طفولیت سے تعلق رکھتے ہوں یا عہدِ بلوغ سے، قرآن میں بعینہٖ موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ طفولیت کے احکام کو قرآن میں کیوں باقی رکھا گیا؟ ان کا باقی رہنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ وہ اب بھی افادیت سے خالی نہیں ہیں۔

اس بنا پر راقم کا خیال ہے کہ آج یا آئندہ جب بھی کوئی قوم دائرہ اسلام میں داخل ہوگی تو اس پر اسلامی شریعت کا اطلاق ٹھیک اس طرح تدریجاً ہوگا جس طرح عہدِ نبوی میں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر اگر اس قوم کے لوگ شراب کے عادی ہوں گے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جس طرح عرب کے لوگ عادی تھے، تو ان کو مہلت دی جائے گی اور کچھ دنوں تک اس برائی کو بادلِ نخواستہ برداشت کرنا ہوگا۔ لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی (سورہ نساء۔۴۳) کی ہدایت کے مطابق ان کو رفتہ رفتہ ترک شراب کی منزل تک لایا جائے گا اور پھر حرمتِ خمر کا اسلامی قانون ان پر نافذ ہوگا۔ اسی طرح اسلامی شریعت کے دوسرے احکام پر عمل کیا جائے گا۔

یہ تو ایک غیر اسلامی سماج کی اصلاح اور اس پر اسلامی شریعت کے اطلاق کی حکیمانہ صورت ہے۔ موجودہ بگڑے ہوئے مسلم سماج پر بھی اصولِ تدریج کا اطلاق ہوگا۔ لیکن ہمارے اکثر علماء اس خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"آنحضرتؐ کے دور میں اور ہمارے دور میں کافی فرق ہے۔ آنحضرتؐ نے جب اسلامی شریعت کی دنیا کو دعوت دی ہے اس وقت لوگ جاہلی رسوم وعادات کے اتنے خوگر تھے کہ اس سے ان کا نکلنا آسان نہ تھا۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں، اسلامی احکام وقوانین لوگوں کے لیے کوئی نامانوس اور اجنبی چیز نہیں ہیں اس وجہ سے اس زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کر کے ایک کے احکام کو دوسرے پر منطبق کرنا ہمارے خیال میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

پھر اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لیے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ اس دلیل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

> کے سہارے روزہ، نماز، حرمت شراب اور حد زنا وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ ایسے اجتہاد شروع کر دیں گے کہ دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی[1]"

مولانا نے عربی عہد اور دور حاضر کا جو تقابل کیا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ جس طرح عہدِ نبوی کے جاہلی معاشرے میں بہت سے ضرر رساں رسوم ورواج مروّج تھے اور لوگ بہت سے اخلاقی معائب میں گرفتار تھے، اسی طرح آج کا نام نہاد اسلامی معاشرہ بھی سیکڑوں جاہلی رسوم ورواج، بدعات وخرافات اور اخلاقی مفاسد میں جکڑا ہے۔ بے شک گنتی کے لحاظ سے آج مسلمانوں کی تعداد اسلام کے دور اوّل سے بہت زیادہ ہے۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے کثرتِ تعداد کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل چیز جو قابل لحاظ ہے وہ افراد کی ایمانی اور اخلاقی حالت ہے۔ اور اس اعتبار سے موجودہ دور کے مسلمانوں کی حالت بہت افسوسناک ہے۔

ان مسلمانوں کی ایمانی حالت کو عہد نبوی کے مسلمانوں کے ایمان پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ مدنی دور میں کوئی مسلمان تارکِ نماز نہیں تھا، کیونکہ ترکِ نماز کا مطلب ترکِ اسلام تھا، حتی کہ اس عہد کے منافق مسلمان بھی نمازیں پڑھتے تھے اور بادلِ ناخواستہ ہی سہی زکوۃ بھی دیتے تھے۔ لیکن آج حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد نماز ترک کر چکی ہے۔ یہی حال دوسرے فرائض وواجبات کا ہے۔ اس کے علاوہ مدنی معاشرہ ایک توحیدی معاشرہ تھا اور سارے مسلمان توحید کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے قلب ودماغ شائبہ شرک سے پاک تھے۔ لیکن آج مسلمانوں کا سوادِ اعظم کسی نہ کسی نوع کے شرک میں مبتلا ہے حتّٰی کہ ان کی ایک بڑی تعداد شرک جلی

---

1. تدبر قرآن، ج ۱، ص ۳۱۴، ۳۱۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے گناہ کی مرتکب ہے۔ کون نہیں دیکھتا کہ بزرگانِ دین کے مزارات پر علانیہ مشرکانہ اعمال انجام دیے جا رہے ہیں۔ ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے دعائیں کی جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہاں سجدے تک کیے جاتے ہیں۔

کیا اس طرح کے نام نہاد "مسلم معاشرہ" کو حقیقی اسلامی معاشرہ سمجھ کر اس پر دورِ مدنی کے احکام و قوانین کو یک بارگی نافذ کرنا صحیح ہوگا؟ ہر انصاف پسند اور عاقل و دانا یہی کہے گا کہ ایسا کرنا نادانی اور کم اندیشی کی بات ہوگی۔ یہ کہنا کہ مسلمان اس دلیل کے سہارے نماز روزے اور دیگر دینی فرائض کی تعمیل میں ترک و سہولت کی راہ اختیار کرے گا، ایک کمزور دلیل اور اندیشۂ دور دراز ہے اور کچھ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں اس معنی میں کوئی نسخ واقع نہیں ہوا ہے جس معنی میں یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ جو علماء نسخ کے قائل ہیں ان کے دلائل کمزور ہیں، جیسا کہ راقم نے ان کا تفصیلی جائزہ لے کر بالکل واضح کر دیا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم:

علمِ تفسیر اور اس کے مناہج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علمِ تفسیر اور اس کے مناہج

علمِ تفسیر

علمِ تفسیر میں دو لفظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں، ایک تفسیر اور دوسرا تاویل۔

تفسیر کا لفظ 'فسر' سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی کشف وایضاح کے ہیں۔ قاموس میں ہے: (الفسر) الابانة و کشف[1]۔ لسان العرب میں ہے: (الفسر) البیان، فسر الشئی یفسر بکسر ویفسرہ بالضم فسراً وفسرہ، ابانة...... والتفسیر، کشف المراد عن الالفاظ المشکل[2]۔ قرآن میں یہ لفظ ایک جگہ بیان و وضاحت کے معنی میں استعمال ہوا ہے: ولا یاتونك بمثل الا جئنك بالحق واحسن تفسیرا (سورۂ فرقان۔۳۳)

"یہ لوگ اس طرح کا کوئی سوال تمہارے پاس لے آئیں تو ہم فوراً ہی اس کا صحیح جواب جو مطابق حقیقت اور وضاحت میں بڑھ کر ہوتا ہے، تمہیں عطا کر دیتے ہیں۔"

تاویل کے لغوی معنی رجوع کرنے کے ہیں۔ قاموس میں ہے: ال الیہ اولا ومآلا، رجع، وعنہ ارتد[3]۔ لسان العرب میں ہے: الأول، الرجوع، ال الشئی یؤول اولا ومآلا، رجع، واول الشئی رجعہ، والت عن شئی، ارتدت ......واولہ وتاولہ، فسرہ[4]۔

امام راغب نے لکھا ہے کہ تاویل "اول" سے ہے یعنی اصل کی طرف رجوع کرنا[5]۔

---

[1] قاموس، ج ۲، ص ۱۱۰
[2] لسان العرب، ج ٦، ص ۳٦۱
[3] قاموس، ج ۳، ص ۳۳۱
[4] لسان العرب، ج ۱۳، ص ۳۳، ۳۴
[5] المفردات فی غریب القرآن، ص ۳۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں تاویل کا لفظ ایک سے زیادہ آیات میں استعمال ہوا ہے۔اس کے محلِ استعمالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معنی کسی پوشیدہ حقیقت کو کھولنے یعنی تبیین کے ہیں۔مثلاً ایک جگہ ہے: وما یعلم تاویلہ الا اللّٰہ (آل عمران۔۷)، دوسری جگہ ہے: ذٰلک خیر و احسن تاویلا (نساء۔۵۹)، ایک اور جگہ ہے: ھل ینظرون الا تاویلہ (اعراف۔۵۳)۔سورۂ یوسف میں یہ لفظ مکرر تعبیر خواب کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے بھی اس کے اصل معنی پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً: ویعلمک من تاویل الاحادیث (آیت ۶)، وما نحن بتاویل الاحلام بعلمین (آیت ۴۴)، انا انبئکم بتاویلہ (آیت ۴۵)۔

جب یہ دونوں لفظ علم تفسیر میں استعمال ہوتے ہیں تو علماء کی تشریح کے مطابق تفسیر کے معنی الفاظ کے ظاہری معنی بیان کرنے کے ہیں، دوسرے لفظوں میں کسی آیت کے معنی و مفہوم کو کھول دینے کے ہیں، بالخصوص وہ آیت جس کے الفاظ کے ایک ہی معنی ہوں۔لیکن وہ آیت جس کے الفاظ مشترک المعنی ہوں یعنی اس کے ایک سے زیادہ مفہوم ہو سکتے ہوں، ان میں سیاقِ کلام اور نظائر کی روشنی میں کسی ایک مفہوم کو جو اس کا واقعی مفہوم ہو، ترجیح دینا تاویل ہے۔

علمِ فقہ و حدیث کی طرح علمِ تفسیر بھی ایک باضابطہ علم ہے جس کی مدد سے نہ صرف قرآن کے معنی و مفہوم کو سمجھا جاتا ہے بلکہ اس کے احکام و ہدایات کا مفہوم اور اس کی غایتِ نزول کا فہم بھی حاصل ہوتا ہے۔علامہ زرکشی لکھتے ہیں:

علم یعرف بہ کتاب اللّٰہ المنزل علی نبیہ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم، و بیان معانیہ واستخراج احکامہ و حکمہ[1]

---

[1] البرہان فی علوم القرآن، ج ۱، ص ۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"علم تفسیر وہ علم ہے جس سے اللہ کی کتاب کا جو اس کے نبی پر نازل ہوئی، فہم حاصل ہوتا ہے اور اس کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے اور اس کے احکام اور حکمتوں کا اس سے استخراج ہوتا ہے"۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

علم يبحث فيه عن كيفية النطق بالالفاظ القرآن ومدلولاتها و احكامها الافرادية والتركيبية ومعانيها التى تحمل عليها حالت التركيب و تتماست لذلك[1]

"علم تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کے طرز ادا اور ان کے مفہومات اور اس کے انفرادی اور اجتماعی احکام اور ان معانی سے بحث کی جاتی ہے جو حالتِ ترکیب میں الفاظ سے متبادر ہوتے ہیں، اور دوسرے معانی بھی (مثلاً ناسخ و منسوخ اور مجملاتِ قرآن وغیرہ کا علم)"۔

تفسیری لٹریچر میں تین طرح کی تفسیریں ملتی ہیں۔ ایک وہ تفسیر جس کی بنیاد روایت پر ہے۔ اس میں اقوالِ رسول جو بہت کم ہیں، اور اقوالِ صحابہ و تابعین شامل ہیں۔ اس کو تفسیرِ ماثور یا تفسیر بالرّوایت کہا جاتا ہے۔ دوسری تفسیر وہ ہے جس میں روایت کے ساتھ عقل کا استعمال بھی شامل ہے، لیکن زیادہ اعتماد عقل اور علم لسان پر رکھا جاتا ہے۔ یہ تفسیر غیر ماثور ہے۔ اس کو تفسیر بالدّرایت بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرزِ تفسیر کے مخالف علماء اس کو تعریضاً تفسیر بالرّائے کہتے ہیں۔ تیسری تفسیر کا نام علمی تفسیر ہے۔

---

[1] روح المعانی، ج ا، ص ۴، مزید دیکھیں، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۱۷۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ ماثور

علماء کا ایک بڑا گروہ صرف اسی طریقۂ تفسیر کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے علاوہ کسی اور طریقۂ تفسیر کو جائز نہیں رکھتا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

ونحن نعلم ان القرآن قراه الصحابة والتابعون وتابعوهم وانهم كانوا اعلم بتفسيره ومعانيه، كما انهم اعلم بالحق الّذی بعث الله به رسوله، فمن خالف قولهم و فسّر القرآن بخلاف تفسيرهم فقد اخطا فی الدليل والمدلول۔[1]

''ہم جانتے ہیں کہ قرآن کو (سب سے پہلے) صحابہ، پھر تابعین اور تبع تابعین نے پڑھا اور وہ اس کے معانی و مطالب کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، بالکل اسی طرح جیسے وہ اس حق کے سب سے بڑے عالم تھے جس کو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے بھیجا تھا۔ اس لیے جس نے ان کے قول کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کے خلاف تفسیر لکھی تو اس نے دلیل اور مدلول دونوں میں غلطی کی۔''

تفسیرِ ماثور کے اصول

تفسیرِ ماثور کا پہلا اصول 'تفسیرُ القرآن بالقرآن والسنّة' ہے، یعنی قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنا اور اگر اس سے ممکن نہ ہو تو پھر سنت (حدیث) کی طرف رجوع کرنا۔ اس اصول کی وضاحت کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

انّ اصح الطريق فی ذلک أن يفسر القرآن بالقرآن، فما اجمل فی مكانه فانّه قد فسّر فی موضع آخر، وما اختصر

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فی مکان فقد بسط فی موضع آخر، فان عیاک ذلک فعلیک بالسنّة، فانها شارحة للقرآن وموضحه له ،بل قد قال الامام ابو عبد اللّٰہ محمد بن ادریس الشافعی : کل ماحکم به رسول اللّٰہ فھو ممّا فھمه من القرآن[1]

”تفسیر کا سب سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے ۔اس لیے کہ اگر ایک جگہ بات مجمل ہے تو دوسری جگہ اس کی شرح ووضاحت کردی گئی ہے ۔اسی طرح اگر کسی مقام پر اختصار ہے تو دوسری جگہ اس کو مفصّل کر دیا گیا ہے ۔اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو پھر سنت کی طرف تمہاری رجعت ضروری ہے ۔اس لیے کہ وہ قرآن کی شارح ومفسّر ہے۔ امام ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی کا قول ہے کہ رسول اللہ نے جو حکم بھی دیا ہے وہ سب کا سب قرآن سے ماخوذ ہے۔“

علامہ ابن کثیر کا بھی خیال ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے ۔وہ لکھتے ہیں:

فان قال قائل ،فما احسن طریق التفسیر؟ (فالجواب): أن اصح الطریق فی ذلک أن یفسر القرآن بالقرآن[2]

”اگر کوئی سائل پوچھے کہ تفسیر کا سب سے اچھا طریقہ کیا ہے ؟تو جواب یہ ہے کہ تفسیر کا سب سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔“

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر ص ۹۳

[2] تفسیر ابن کثیر (مقدمہ)،ص ۶

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ ماثور کا دوسرا اصول ' تفسیر القرآن باقوالِ الصحابہ ' ہے، یعنی اگر قرآن کی کسی آیت کی تفسیر قرآن اور سنت سے نہ ہو سکے تو پھر اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے، کیونکہ وہ قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

وحینئذ اذا لم تجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة رجعت فی ذلک الی اقوال الصحابة فانهم ادریٰ بذلک لما شاهدون من القرآن والاحوال التی اختصوابها ولما لهم من الفهم التام والعلم الصحیح[1]

''اور جس وقت قرآن اور سنت سے بھی تفسیر نہ ہو سکے تو اس صورت میں اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس لیے کہ وہ اس کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، انہوں نے قرآن کے نزول اور احوال کو جو انہی سے متعلق تھے، خود مشاہدہ کیا تھا۔ اور اس بنا پر بھی کہ وہ فہم کامل اور علمِ صحیح رکھتے تھے۔''

تفسیرِ ماثور کا تیسرا اصول ' تفسیر القرآن باقوالِ التابعین ' ہے، یعنی اگر قرآن وسنت اور اقوالِ صحابہ سے قرآن کی تفسیر نہ ہو سکے تو پھر اقوالِ تابعین کے مطابق تفسیر کی جائے۔ امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

اذا لم تجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة ولا وجدته عن الصحابة فقد رجع کثیر من الأمة فی ذلک الی اقوالِ التابعین کمجاهد بن جریر، فانه آیة فی التفسیر[2]

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۵ [2] ایضاً، ص ۱۰۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''اگر قرآن و سنت اور اقوالِ صحابہ سے بھی تفسیر نہ ہو سکے تو اس صورت میں بہت سے کبار علماء نے اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کیا ہے، مثلاً مجاہد بن جریر جو تفسیر میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔''

تفسیرِ ماثور کے اصولِ اربعہ کا تنقیدی جائزہ

تفسیرِ ماثور کے جن چار اصولوں کا اوپر ذکر ہوا، ان کا تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ تفسیر کے یہ چاروں اصول اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں اور اب کسی نئے اصولِ تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال کلیۃً صحیح نہیں ہے، جیسا کہ اگلی سطروں سے واضح ہو جائے گا۔

تفسیرِ ماثور کا پہلا اصول 'تفسیر القرآن بالقرآن' ہے۔ بلاشبہ یہ قرآن کی تفسیر کا سب سے عمدہ اصول ہے۔ لیکن افسوس کہ تفسیرِ ماثور کے قائل کسی مفسر نے اپنی تفسیر میں اس زرّیں اصول کی مکمل طور پر پیروی نہیں کی ہے۔ جہاں انہیں آسانی کے ساتھ کوئی مماثل آیت مل گئی وہ درج کر دی گئی اور اس میں بھی اس بات کا اہتمام ملتا ہے کہ وہی آیات بطور نظائر پیش کی جائیں جن سے ان کے خیال و مسلک کی تائید ہوتی ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ اس اصول کی پیروی نہایت مشکل تھی کیونکہ اس کے لیے قرآن میں ایک طویل مدت تک غور و فکر درکار تھا۔ ظاہر ہے کہ جو مفسر بھی اس کا اہتمام و التزام کرتا وہ پورے قرآن کی تفسیر نہیں لکھ سکتا تھا اور ہر مفسر چاہتا تھا کہ وہ پورے قرآن کی تفسیر لکھے اور مفسّرِ قرآن کہلائے۔ مذکورہ اصول کی پیروی میں ایک دشواری یہ بھی تھی کہ اکثر مفسرین کا دوسرے اسلامی علوم سے گہرا شغف و اشتغال تھا۔ اس غیر معمولی مشغولیت کی وجہ سے قرآن میں تدبّر کے لیے کافی وقت نکالنا مشکل تھا۔ ان ہی وجوہ سے تفسیر بالرّوایت کے طریقے کو ترجیح دی گئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ ماثور کا دوسرا اصول' تفسیر القرآن بالسنۃ ' ہے۔ اس میں سنت کا لفظ مغالطہ انگیز ہے۔ بہت سے علماء سنت اور حدیث میں فرق نہیں کرتے اور دونوں کو مترادف اصطلاح سمجھتے ہیں حالانکہ ان میں بہت فرق ہے[1]۔ ہم یہاں یہ مان کر گفتگو کریں گے کہ سنت سے مراد حدیث ہے جس میں سنت بھی شامل ہے۔

عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کی تفسیر بیان کر دی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تفسیر قرآن میں وہ حجت قطعی ہوتی اور کسی دوسری چیز کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چند ہی آیات کی تفسیر مروی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوالات کرتے تھے۔

کتب تفسیر میں جو روایات بیان کی گئی ہیں ان میں رطب و یابس سب موجود ہے، اسرائیلیات کی کثرت ہے اور ان کا بڑا حصہ مراسیل[2] پر مشتمل ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مشہور قول ہے: ثلاثة امور ليس لها اسناد، التفسير و الملاحم و المغازي[3] "تین چیزوں کا اعتبار نہیں، ایک تفسیر، دوسرے ملاحم (غزوات) اور تیسرے مغازی (غازیوں کے مناقب)۔" اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

> وفي التفسير من هذه الموضوعات قطعة كبيرة مثل الحديث الذي يرويه الثعلبي و الواحدي و الزمخشري في فضائل سور القرآن، سورة سورة، فانه موضوع باتفاق اهل العلم[4]

---

[1] دیکھیں، راقم کی کتاب، ایمان و عمل کا قرآنی تصور، ص ۸۳ تا ۸۸

[2] مرسل (مراسیل) سے مراد وہ حدیث ہے جسے تابعی نے کسی سے سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیا ہو لیکن اس میں صحابی کے نام کا ذکر نہ ہو۔

[3] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۵۱، مزید دیکھیں، الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۳۰۴

[4] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۷۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"تفسیر میں موضوع روایتوں کی کثرت ہے، مثلاً قرآن کی ہر سورہ کے فضائل کے بارے میں ثعلبی[1]، واحدی[2] اور زمخشری نے جو روایتیں بیان کی ہیں وہ اہل علم کے نزدیک بالاتفاق موضوع ہیں۔"

مولانا حمید الدین فراہیؒ تفسیری روایات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ولکن فی ذلک العصر کثرت الروایات الضعیفة و اعتمدوا علیها فی التفسیر فصارت کتب التفسیر حاملة لروایات من الیهود والدجالین الواضعین[3]۔

"لیکن اس دور میں ضعیف روایتوں کی کثرت تھی اور تفاسیر میں ان پر بھروسہ کر لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کتب تفسیر میں کثرت سے وہ

---

1. ثعلبی (ابواسحاق احمد بن محمد نیشاپوری، م ۴۲۴ھ) نے ایک تفسیر 'الکشف والبیان' کے نام سے لکھی ہے۔ اس تفسیر کے کچھ اجزاء جامع ازہر مصر میں موجود ہیں (مقدمہ فی اصول التفسیر ص ۷۷)۔ اس تفسیر میں زیادہ تر ضعیف اور موضوع روایتیں ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ نے صاحبِ تفسیر کے بارے میں لکھا ہے:

"هو فی نفسه کان فیه خیر و دین ولکنه کان حاطب لیل، ینقل ماوجد فی کتب التفسیر من صحیح و ضعیف و موضوع (مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۷۶)" "وہ یعنی ثعلبی بذات خود اچھا اور دین دار آدمی تھا لیکن اس کے کلام میں رطب و یابس سب موجود ہے۔ کتب تفسیر میں جو بھی صحیح وضعیف اور موضوع روایت مل جاتی ہے اس کو نقل کر دیتا ہے۔"

2. واحدی (علی بن احمد نیشاپوری) نے ثعلبی سے تفسیر کا علم حاصل کیا تھا۔ اس کی کتابوں میں 'اسباب النزول' کے علاوہ تفسیر میں 'البسیط' اور 'الوجیز' قابل ذکر ہیں۔ لیکن اس کی تفسیر میں بھی موضوع روایات کی کثرت ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ "عربی میں اچھی استعداد رکھتا تھا لیکن اس میں سلامت روی نہیں تھی۔ اس نے اکثر اتباع سلف سے گریز کیا ہے۔" (مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۷۶)

3. التکمیل فی اصول التاویل، ص ۱۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روایتیں جگہ پا گئیں جن کے راوی یہود اور دجّال واضعین تھے یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔"

ابتدا میں تفسیری اقوال کو جو صحابہ کی طرف منسوب ہیں، زبانی روایت کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب حدیثیں جمع کی گئیں تو ان میں ایک باب تفسیر سے متعلق روایات کے لیے رکھا گیا۔ امام بخاری نے اس سلسلے میں زیادہ اہتمام کیا ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری میں ایک حصّہ 'تفسیر القرآن' کے لیے اور دوسرا حصّہ 'فضائل القرآن' کے لیے مختص کیا ہے اور دونوں باب مبسوط ہیں۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان میں مرفوع روایات بہت کم ہیں۔

اس سلسلے میں زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ امام مالک کی 'مؤطا' میں جو حدیث کی پہلی مدون کتاب ہے، تفسیر سے متعلق بہت کم حدیثیں ہیں اور اس کے لیے انہوں نے علیحدہ سے کوئی باب قائم نہیں کیا ہے۔ بہر حال کتب حدیث میں تفسیر سے متعلق روایات کا الگ باب قائم ہو جانے سے ان کی اہمیت میں اضافہ ہوا اور الگ سے تفسیر لکھنے کا رواج شروع ہوا اور اس کی بنیاد ان ہی روایات پر رکھی گئی جو صحابہ، تابعین اور تبعِ تابعین سے مروی ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ان میں سے اکثر روایتیں کم زور ہیں اور روایت و درایت کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ تفسیری روایات کے علاوہ جو مرفوع حدیثیں ان کتابوں میں درج ہیں ان سے تفسیر میں استفادہ کرنے میں کیا حرج ہے؟ بلاشبہ جو مرفوع حدیثیں روایت و درایت کے اصولوں کی روشنی میں صحیح ثابت ہوں ان سے قرآن کی تفسیر میں ضرور فائدہ اٹھانا چاہیے۔

لیکن یہ بات فراموش نہ ہو کہ زیادہ تر حدیثیں بالمعنیٰ روایت ہوئی ہیں اور ان کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حیثیت 'اخبار آحاد' کی ہے[1]۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح مرتبۂ یقین سے محروم ہیں۔ اور اس کو اہل حدیث بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن کی تفسیر میں ان کو یقینی ذریعۂ علم کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت فرع کی ہے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو اس کتاب کے آخری باب میں کی گئی ہے۔ قارئین اس کو وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

لیکن اس اصول کا اطلاق ثابت شدہ سنتوں پر نہیں ہوگا کیونکہ حدِ تواتر کو پہنچنے کی وجہ سے وہ مرتبۂ یقین پر فائز ہیں۔ ہمارے نزدیک سنت سے مراد وہ حدیثیں ہیں جن میں قرآن کے کلی احکام کی توضیح کی گئی ہے یعنی ان کے عملی جزئیات متعین کیے گئے ہیں۔ اس بنا پر معروف معنی میں ان کو تفسیر نہیں کہا جائے گا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ غیر تعبدی سنتوں کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس میں عربوں کے رسوم و رواج اور اس وقت کے سماجی اور تمدنی حالات کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لیے ان کو آیاتِ احکام کی مستقل تبیین کا درجہ حاصل نہیں ہے[2]۔

---

[1] زیادہ تر حدیثوں کے راویوں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ بہت سی حدیثوں کا ایک ہی راوی ہے۔ اسی لیے حدیثوں کو ظنی کہا جاتا ہے، یعنی ان میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب 'المستصفی' میں جو اصول پر ہے، لکھا ہے: خبر الواحد لا یفید العلم (ص ۱۴۵) ''خبر واحد مفید علم نہیں ہے''۔ آگے 'خبر واحد' کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: انا نرید بخبر الواحد فی هذا المقام مالا ینتهی من الاخبار الی حدّ التواتر المفید للعلم۔ فما نقله جماعة من خمسة او ستة مثلاً فهو خبر الواحد (ص ۱۴۵) ''اس جگہ خبر واحد سے ہماری مراد وہ حدیث ہے جو حدِ تواتر تک جو مفید یقین ہے، نہ پہنچی ہو، مثلاً ایک حدیث جو ایک جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبر واحد ہے۔''

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں، راقم کی کتاب 'خطبات اقبال، ایک مطالعہ' ص ۲۲۸ تا ۲۳۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ ماثور کا تیسرا اصول 'تفسیر القرآن باقوالِ الصحابه' ہے، یعنی جب قرآن اور سنت دونوں سے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر نہ ہو سکے تو پھر اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے، اس لیے کہ ان کے علم و عمل دونوں معتبر تھے۔ اس میں کیا دو رائے ہو سکتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اس لیے کہ قرآن ان کے سامنے ان ہی کے احوال و مسائل کے مطابق نازل ہوا تھا، پھر زبان ان کی تھی اور اس کے اسالیب بیان سے وہ خوب اچھی طرح واقف تھے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

انّ القرآن نزل بلغة العرب وعلیٰ اسالیب بلاغتهم فکانوا کلّهم یفهمونه ویعلمون معانیه فی مفرداته وتراکیبه[1]

''بلا شبہ قرآن عربوں کی زبان اور ان کے اسالیبِ بلاغت کے مطابق نازل ہوا تھا۔ اس لیے وہ اس کو بخوبی سمجھتے تھے اور اس کے مفردات و تراکیب کے معنی و مفہوم سے آگاہ تھے۔''

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ ''قرآن ٹھیک ٹھیک بلا کسی تفاوت کے محاورہٴ عرب کے موافق نازل ہوا اور اہل عرب اپنی زبان کے سمجھنے میں جو سلیقہ رکھتے تھے اس سے وہ قرآن کے معنیٰ منطوق کو سمجھ لیتے تھے[2]۔''

اس معنیٰ منطوق کا تعلق قرآن کے حصۂ محکمات سے ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کی آیاتِ متشابہات میں غور و خوض سے احتراز کرتے تھے، حتیٰ کہ وہ صفات و قصص جن میں اجمال و ابہام ہے، ان کی تفصیل و توضیح کے بھی درپے نہیں ہوتے تھے،

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص ۴۸۹

[2] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۲۷، ۲۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شارع کا مقصود یہاں تفصیل نہیں بلکہ اجمال ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

''شارع کی مرضی ہے کہ قرآن کے متشابہات کی تاویل اور صفاتِ خداوندی کے حقائق کی صورت آفرینی اور مبہمات کی تعیین اور قصوں کی تفصیل میں غور وخوض نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضوان اللہ عنھم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں سوالات کم پیش کرتے تھے۔''[1]

طبری کی روایت ہے کہ ایک شخص نے ترجمان القرآن عبداللہ ابن عباسؓ سے قرآن کی آیت: تعرج الملئكة والروح اليه يوم كان مقداره خمسين الف سنة (سورۂ معارج۔۴) کے بارے میں پوچھا کہ اس میں 'یوم' سے کون سا دن مراد ہے؟ فرمایا: هما يومان ذكر هما الله فى كتابه والله اعلم بهما، فكره ان يقول فى كتاب الله مالا يعلم[2] ''یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے اور وہی ان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے ناپسند کیا کہ کتاب اللہ کی جس بات کو وہ نہیں جانتے اس کے بارہ میں کچھ کہیں۔''

قرآن کے بارے میں صحابہؓ کے اس محتاط طرزِ عمل کے پیشِ نظر ان سے منسوب تفسیری اقوال کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب انہی کے فرمودات ہیں۔ سب سے زیادہ تفسیری اقوال حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں اور یہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ لیکن امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ابن عباسؓ سے تفسیر کے متعلق صرف ۱۰۰ روایات ثابت ہیں۔[3]

۱۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۲۹، ۳۰

۲۔ تفسیر طبری، ج ۲۹، ص ۷۲

۳۔ الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۲۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ ماثور کا چوتھا اصول 'تفسیر القرآن باقوالِ التابعین' ہے، یعنی اگر قرآن کی تفسیر مذکورہ ماخذِ ثلاثہ سے نہ ہو سکے تو پھر تابعین کے اقوال دیکھے جائیں، جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ اور دوسرے علماء نے لکھا ہے اور اس کا ذکر ہو چکا ہے[۱]۔

زیادہ تر تفسیری اقوال تابعین سے منسوب ہیں لیکن اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتساب صحیح ہے۔ صحابہؓ کرام کی طرح تابعین بھی تفسیرِ قرآن کے باب میں بہت محتاط رہتے تھے۔ یزید بن یزید بیان کرتے ہیں کہ ہم سعید بن المسیبؒ (م ۹۴ ہجری) سے حرام و حلال کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور وہ سب سے زیادہ قرآن کے جاننے والے تھے۔ لیکن جب ہم قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھتے تو وہ اس طرح خاموش رہتے گویا سنا ہی نہیں (سکت کان لم یسمع)[۲]۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں: اذا سئل عن تفسیر آیة من القرآن، قال: انا لا اقول فی القرآن شیئا[۳] ''جب قرآن کی کسی آیت کی تفسیر پوچھی جاتی تو فرماتے: ہم قرآن کے بارے میں کچھ نہیں کہتے۔''

صحابہؓ اور تابعینؒ دونوں کا دستور تھا کہ وہ صرف قرآن کے حصۂ محکمات کے بارے میں بات کرنا پسند کرتے تھے اور ان ہی امور پر گفتگو کرتے تھے جن کے بارے میں وہ واضح علم رکھتے تھے۔ سعید بن المسیبؒ ہی کے بارے میں ہے کہ: انه لا یتکلم الا فی المعلوم من القرآن[۴]۔ ''قرآن کی جن باتوں کا انہیں علم ہوتا انہی کے بارے

۱۔ مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۱۰۵،

۲۔ تفسیر طبری، ج ۱، ص ۸۶

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں وہ کلام کرتے تھے۔"

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اقوالِ تابعین کے حجت ہونے کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف ہے۔ شعبہ بن الحجاج کہتے ہیں: اقوال التابعین فی الفروع لیست حجة فکیف تکون حجة فی التفسیر[1] "جب فروع میں اقوالِ تابعین حجت نہیں ہیں تو پھر تفسیر میں کیونکر حجت ہو سکتے ہیں۔" امام ابن تیمیہؒ نے اس خیال کا رد کیا ہے۔ اسی حوالے سے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

"اگر تابعی نے کسی آیت کی تفسیر براہ راست صحابہ سے نقل کی ہے تو اس کا وہی حکم ہے جو صحابۂ کرام کی تفسیر کا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کا اپنا قول ہو تو بھی حجت ہے بشرطیکہ کسی دوسرے تابعی کے قول کے خلاف نہ ہو۔ اگر خلاف واقع ہے تو اس صورت میں آیت کی تفسیر کے لیے قرآن، لغت عرب، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ پر غور کرنا ہوگا[2]۔"

شعبہ بن الحجاج کی طرح امام ابوحنیفہؒ بھی تابعی کے قول کو حجت نہیں مانتے تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ: ماجاء عن الرسول فعلی الراس و العین وما جاء عن الصحابه تخیر نا، وماجاء عن التابعین فهم رجال و نحن رجال[3]۔" جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر اور صحابہ سے جو کچھ مروی ہے اس میں سے ہم بہتر کو لیتے ہیں، اور جو کچھ تابعین نے کہا ہے تو وہ بھی انسان تھے اور ہم بھی انسان ہیں۔"

۱۔ مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۱۰۵

۲۔ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۵

۳۔ التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذہبی، ص ۱۲۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ بہت سے اقوالِ تابعین ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔مثال کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت: وللرّجال علیهن درجة (آیت ۲۲۸) میں مجاہد کے نزدیک درجہ یعنی فضیلت سے مراد میراث اور جہاد ہے جس میں مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔قتادہ نے اس سے جہاد مراد لیا ہے۔خود حضرت ابن عباسؓ نے اس سے وہ مہر اور مال مراد لیا ہے جو مرد عورت پر خرچ کرتا ہے[۱]۔

اس تفصیلی گفتگو سے بالکل واضح ہوگیا کہ تفسیرِ ماثور کے اصولِ چہارگانہ میں سے اوّل الذکر اصول یعنی تفسیر القرآن بالقرآن کو مستثنیٰ کر کے بقیہ تین اصول یعنی تفسیر القرآن بالسنۃ، تفسیر القرآن باقوالِ الصحابہ اور تفسیر القرآن باقوالِ التابعین میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں، اس لیے تفسیر قرآن میں ان پر کلّی طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان سے استفادہ کرنے میں حزم و احتیاط لازمی ہے اور تفسیر کا اوّل الذکر اصول ہر حال میں پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

تفاسیرِ ماثور

تفسیرِ ماثور کے اصولوں کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ماثور تفاسیر کے بارے میں بھی گفتگو کی جائے، کیونکہ قرآن کے بہت سے قاری تفہیمِ آیات میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بسا اوقات بے احتیاطی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ماثور تفسیروں میں تین تفسیریں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، ایک ابن جریر طبریؒ کی 'جامع البیان' (معروف بہ تفسیرِ طبری)، دوسری 'المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز' جس کے مولف ابو محمد عبدالحق بن ابوبکر غالب بن عطیہ غرناطی ہیں، اور

---

[۱] تفسیر طبری، ج۴، ص۵۳۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تیسری تفسیر امام جلال الدین سیوطیؒ کی 'الدّر المنثور فی تفسیر الماثور' ہے۔

تفسیر طبری بڑی جامع اور مبسوط تفسیر ہے۔ طبری محدث بھی تھے اور مؤرخ وفقیہ بھی اور اس کے اثرات ان کی تفسیر میں بالکل نمایاں ہیں۔ انھوں نے تفسیر سے متعلق تمام روایات کو اپنی تفسیر میں جمع کر دیا ہے اور اس طرح یہ روایات محفوظ ہو گئی ہیں اور یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ لیکن اس کا کمزور پہلو یہ ہے کہ انھوں نے روایات کو تنقیح کے بغیر لے لیا ہے اور ان میں صحیح اور موضوع دونوں طرح کی روایتیں ہیں۔ ان کے کئی راوی غیر ثقہ ہیں۔ ابن حاتم نے طبری کی صحیح روایات کو جمع کیا ہے اور ان روایتوں کو خارج کر دیا ہے جس کے راوی سدی ہیں[1]۔ اس نقص سے قطع نظر، اس تفسیر میں چند خوبیاں بھی ہیں۔

تفسیر طبری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صاحب تفسیر نے الفاظِ قرآن کی تحقیق بڑی دقیقہ رسی کے ساتھ کی ہے اور ان کے مختلف معانی کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں اشعارِ عرب سے بھی استناد کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر آیت سے متعلق مختلف روایتوں کو بیان کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ کون سی روایت ان کے نزدیک راجح ہے اور وجوہِ ترجیح بھی بیان کر دیے ہیں۔ اس تفسیر کے متعلق امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے:

هو من اجل التفاسير المأثورة واعظمها قدراً[2]

"وہ ماثور تفاسیر میں بڑی عظمت رکھتی ہے اور قدر و قیمت کے اعتبار سے ان سے بلند تر ہے"۔

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن، ج ۲، ص ۲۲۴

[2] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے تفسیر طبری کے نقائص اور محاسن دونوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

فاعلم ان تفسير ابن جرير هو الجامع لكل ماجاء من طريق النقل من غير نقد فى الرواية ولكنه بعدنقل الوجوه المنقوله يبيّن ماهو الصواب عنده. واذا امكنه يجعل المفهوم جامعا للوجوه، ويبحث عن اللغة والاعراب وكثيراً مايستند بكلام العرب. ومن اجل محاسن هذا التفسير ...... اقبلت العلماء عليه. واما النظر فى الروايات من جهة القرآن والمعقول والتاريخ فليس من شانه حتى انه جمع من المناكير الكبر من غير تنبيه علىٰ نكارتها. وانما ترك ذلك لاهل النظر فانه لواراده لم يتيسّر له اتمام هذا الجامع الكبير[1]

”جان لو کہ تفسیر ابن جریر میں جملہ منقولہ روایات کو کسی نقد کے بغیر جمع کر دیا گیا ہے۔ لیکن صاحب تفسیر ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ان میں سے کون سی روایت ان کے نزدیک صحیح اور قابلِ ترجیح ہے۔ اور جہاں ممکن ہوا ہے انھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اسی سلسلۂ کلام میں لغت اور اعراب سے بحث کی ہے اور کلام عرب سے بھی بکثرت استناد کیا ہے۔ اس تفسیر کی...... انہی خوبیوں کی وجہ سے علماء نے اس کی طرف

---

[1] التكميل فى اصول التاويل، ص ۶

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

توجہ کی ہے۔ لیکن اگر اس کو قرآن، معقول اور تاریخ کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پھر اس پر حرف آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اس میں بڑے منکرات تک کو جمع کر دیا ہے اور ان پر کوئی فہمائش نہیں کی ہے۔ غالباً انھوں نے اس کام کو اہل نظر کے لیے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ اگر وہ یہ کام خود کرتے تو اس بڑی تفسیر کو مکمل نہیں کر سکتے تھے“۔

دوسری اہم تفسیرِ ماثور 'المحرر الوجیز' ہے۔ اس تفسیر کے بارے میں علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ”اس نے تمام تفسیر کی کتابوں (تفاسیرِ منقولہ) کا خلاصہ نکال کر رکھ دیا ہے اور ان میں سے قصداً انہی باتوں کو لیا ہے جو صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ ان سب معلومات کو جو اہل مغرب اور اندلس میں متداول اور مقبول ہیں، اس نے نہایت سلیقہ سے اس کتاب میں مرتب کر دیا ہے۔[1]“

تیسری اہم تفسیرِ ماثور امام جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) کی "الدّر المنثور" ہے۔ طبری ہی کی طرح انھوں نے بھی روایات کی تنقیح نہیں کی ہے اور اسرائیلیات سے بھی اجتناب نہیں کیا ہے۔ اس تفسیر میں ان کے عہد کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔ اس تفسیر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی تحقیق پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور بعض دوسری مفید باتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ 'تفسیر ابن کثیر' اور 'معالم التنزیل' (بغوی) بھی ماثور تفاسیر میں شمار ہوتی ہیں۔

تفسیرِ غیر ماثور

بہت سے علماء کا خیال ہے کہ تفسیر بالرّوایت یا تفسیرِ ماثور جس پر تفصیلی گفتگو پچھلے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، بحوالہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ج ۶، ص ۴۹۷

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

صفحات میں ہو چکی ہے، تفسیر کا سب سے محفوظ اور قابل اعتماد طریقہ ہے۔ اس طریقۂ تفسیر سے ہٹ کر تفسیر کرنا تفسیر بالرّائے ہے۔ اس سلسلے، میں امام ابن تیمیہؒ کی رائے پہلے نقل کی جا چکی ہے۔ اس کو ہم دوبارہ لکھتے ہیں۔ صرف ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ہم جانتے ہیں کہ قرآن کو (سب سے پہلے) صحابہ، پھر تابعین اور تبع تابعین نے پڑھا اور وہ اس کے معانی و مطالب کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، اسی طرح جیسے وہ اس حق کے سب سے بڑے عالم تھے جس کو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجا تھا۔ اس لیے جس نے ان کے قول کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کے خلاف تفسیر لکھی تو اس نے دلیل اور مدلول دونوں میں غلطی کی[1]۔''

امام صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے قرآن میں غور و تدبّر کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی کتاب میں تدبر کیا جائے (سورہٰ صٓ۔ ۲۹)۔ قرآن کی حکمت کا ایک بڑا حصہ آیات کے نظم و ترتیب میں چھپا ہے اور جب تک کافی غور و خوض نہ کیا جائے ان کا فہم مشکل ہے۔ قرآن میں تدبر کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی ایک بڑی غرض ان ہی حکیمانہ معارف کی تعلیم ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر ماثور میں کئی نقائص ہیں اور ان کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس بنا پر تفسیرِ ماثور کی صحت پر اصرار صحیح نہیں ہے، اس سے ہٹ کر تفسیر کرنا بالکل جائز ہے اور کل کی طرح آج بھی قرآن میں غور و تدبر کا دروازہ کھلا ہے۔

امام غزالیؒ اس طرزِ فکر کے سب سے بڑے حامی تھے۔ احیاء العلوم میں 'فهم القرآن وتفسيره بالرائے من غير نقل' کا عنوان قائم کر کے انھوں نے اس

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ قرآن کی تفسیر میں منقول اور مسموع کے سوا کچھ کہنا ممنوع ہے۔ فرماتے ہیں:

"اس بحث سے یہ بات غلط ثابت ہوگئی کہ مطالب قرآن کے فہم کے لیے صرف اس چیز پر اکتفا لازم ہے جو قرونِ اولیٰ کے لوگوں سے منقول ہو۔ اور اس بات کا جواز بھی ثابت ہوگیا کہ ہر صاحب علم اپنی فہم اور عقل کے مطابق قرآن پر غور کرے اور اس سے معانی و مطالب اخذ کرے[1]۔"

امام راغب اصفہانی کا بھی خیال ہے کہ ہر شخص جو عالم ہو اور عربی زبان وادب سے کماحقہٗ آگاہ ہو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ منقول سے آگے بڑھ کر قرآن میں غور وفکر کرے اور اس کی تفسیر بیان کرے[2]۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے جو دورِ آخر کے علماء میں قرآن فہمی میں درجۂ امتیاز رکھتے تھے، لکھا ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ جو تفسیر سلف سے منقول ہو وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ تفسیر بالرّائے ہے۔ اس خطرناک طرزِ فکر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

من الناس من یزعم ان التفسیر اما ان یکون منقولاً من السلف الصالحین اویکون خلافه وهو بالرائی، والاوّل هو المعتمد والثانی فهو المنهی عنه، ثم استنجوا من هذا ان المنقول وان کان ضعیفا،

---

[1] احیاء العلوم، باب چہارم، ص ۲۹۴-۲۹۵

[2] مقدمۃ التفسیر، راغب اصفہانی، ص ۴۲۲، ۴۲۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احق بالاتباع، وعلى هذا الاصل كتب كثير من التفاسير مثل تفسير محمد بن جرير الطبرى الذى قيل فيه انه لم يصنف مثله، ولا شك انه كذلك فى بابه، ومثل التفسير البغوى وابن كثير والسيوطى وغيرهم من المحدثين، وهذا الذى زعموا قول عليه طلاوة الحق وفى طيه اباطيل مضلة، من هو فى هو تها لم يخرج منها الا ما شاء الله[1]۔

''کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ تفسیر یا تو سلفِ صالحین سے منقول ہوگی اور یا اس کے برعکس ہوگی اور یہ تفسیر بالرآئے ہے۔ اس لیے اوّل الذکر قابلِ اعتماد اور مؤخر الذکر ممنوع اور ناپسندیدہ ہے، پھر اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ منقول ہی قابل اتباع ہے، خواہ وہ ضعیف ہو۔ اکثر کتب تفسیر اسی اصول پر لکھی گئی ہیں، مثلاً تفسیر ابن جریر، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جیسی کوئی دوسری تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ اس نوع کی یہ سب سے عمدہ تفسیر ہے۔ بغویؒ، ابن کثیرؒ، سیوطیؒ اور دوسرے محدثین کی تفاسیر بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔ یہ ایک ایسا قول ہے جس پر حق کا ملمع ہے اور اس کے باطن میں ناحق پوشیدہ ہے۔ جو شخص بھی اس گڑھے میں گرا اس سے اس کو نکلنا نصیب نہ ہوا، الا ماشاء اللہ''۔

---

[1] التکمیل فی اصول التاویل، ص ۶

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

تفسیر بالرّائے

یہ خیال کہ ہر وہ تفسیر جو تفسیرِ ماثور کے طریقے سے ہٹ کر لکھی گئی ہو تفسیر بالرّائے ہے، صحیح نہیں ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی شرط وقید کے بغیر ہر عالم وفاضل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قرآن میں غور وفکر کرے اور جو کچھ اس کی سمجھ میں آئے وہ بیان کرے، نہ اس میں سیاقِ کلام کو ملحوظ رکھے اور نہ قرآن کے نظائر اور لغاتِ عرب کو۔ جو شخص بھی اس طرز پر قرآن کی تفسیر کرے گا اور اس میں قرآن کے حقیقی معنی ومنشا کو سمجھنے سے زیادہ اپنی پسند اور ناپسند اور اپنے مسلک وخیال کی تائید وتصویب کرے گا وہ ایک بڑے دینی جرم کا مرتکب ہوگا۔ اور اسی قسم کی تفسیر پر حقیقی معنی میں تفسیر بالرّائے کا اطلاق ہوتا ہے[1]۔ امام راغب اصفہانی نے تفسیر بالرّائے کی مختلف صورتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’اگر آدمی پہلے سے کوئی نظریہ وعقیدہ رکھتا ہو اور اس کو ثابت کرنے کے لیے آیات قرآنی کو استعمال کرے اور اس میں وہ نہ تو زبان وادب

---

[1] تفسیر بالرّائے کے سلسلے میں کئی روایتیں منقول ہیں لیکن محدثین نے ان میں کلام کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے: قال رسول اللّٰہ : من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ فی النار (تفسیر طبری، ج۱ص ۷۷) ’’رسول اللہ نے فرمایا کہ جس نے علم کے بغیر قرآن کے بارے میں کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے‘‘۔ اس حدیث کے رواۃ میں ایک عبدالعلی ہے اور محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قال فی القرآن برائہ فاصاب فقد اخطاء ’’جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کہا تو خواہ اس کی رائے ٹھیک ہو، اس نے خطا کی‘‘۔ (تفسیر طبری، ج۱، ص ۷۹)۔ امام ترمذی نے اس روایت کو ’حدیثِ غریب‘ کہا ہے (سنن الترمذی ۱۴۶/۸)۔ امام بخاری، امام احمد اور نسائی نے اس کے ایک راوی سہیل بن ابی حزم کے بارے میں کلام کیا ہے۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کے قواعد کا لحاظ کرے اور نہ شرعی اصطلاحات کا اور نہ ہی معروف طریقہ ہائے استدلال کو کوئی اہمیت دے تو یہ تفسیر بالرّائے ہے۔ اگر وہ تفسیر تو معروف قواعد کے مطابق کرے لیکن آیت کے مصداق کو بدل دے اور کہے کہ یہ آیت فلاں کے بجائے فلاں کے متعلق ہے تو یہ بھی تفسیر بالرّائے ہے۔ اسی طرح وہ بھی تفسیر بالرائے ہے جو عقلِ صحیح اور منطق کے مسلمہ قواعد کے خلاف ہو[1]۔"

امام ابن تیمیہؒ نے مسلمانوں کے بعض گروہوں کو تفسیر بالرّائے کا مصداق ٹھہرایا ہے، یعنی فلاسفہ، رافضی، قرامطہ، صوفیہ اور اہلِ بدعت (اہلِ سنّت و جماعت)۔ ان لوگوں نے پہلے سے ایک رائے قائم کر لی، پھر قرآن کے الفاظ کو اس پر محمول کیا۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کی متعدد آیات کے وہ معنی بیان کیے ہیں جن کر پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امام صاحب نے اس کی مثالیں بھی نقل کی ہیں[2]۔

حقیقت یہ ہے کہ تفسیرِ ماثور سے کہیں زیادہ نقصان تفسیرِ غیر ماثور سے پہنچا ہے۔ تفسیرِ ماثور سے بلاشبہ تدبّر فی القرآن کی راہ مسدود ہو گئی لیکن تفسیر میں ہر شخص کے لیے قیل و قال کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ تفسیر میں بہت کم اختلافات ہوئے۔ لیکن تفسیر بالرّائے نے ہر شخص کو کھلی چھوٹ دیدی کہ وہ تفسیر کے نام سے جو جی میں آئے وہ لکھے۔ یہ عدول اس طرح ہوا کہ پہلے اسانید کو مختصر کیا گیا، پھر انھیں حذف کر دیا گیا، پھر اقوال داخل ہوئے، اور اس کے بعد ہر مفسر کی سمجھ میں جو بات آ گئی اس کو تفسیر میں داخل کر دیا۔ ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں:

---

۱ دیکھیں، مقدمۃ التفسیر، راغب اصفہانی

۲ مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۸۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثم الّف فی التفسیر طائفة من المتأخرین، فاختصروا الاسانید ونقلوا الا قوال تبرا، فدخل من هنا الدخیل والتبس الصحیح بالعلیل، ثم صار کل سنح له قول یورده ومن خطر بباله شئی یعتمده، ثم ینقل ذالک خلف عن سلف ظانا ان له اصلا غیر ملتفت الیٰ تحریر ماورد عن السلف الصالح ومن هم قدوة فی هذا الباب[1]۔

''اس کے بعد متاخرین کے ایک گروہ نے تفسیریں لکھیں اور اسانید کو مختصر کر دیا اور بہت سے اقوال نقل کیے۔ یہیں سے تفسیر قرآن میں زائد باتیں داخل ہونے لگیں اور صحیح اور غلط باہم خلط ملط ہو گئے۔ اس کے بعد جس کو کوئی بات سوجھی اس کو درج کر دیا اور جو خیال بھی اس کے ذہن میں آیا اس پر اعتماد کر لیا۔ اس کے بعد ہر پچھلا طبقہ اپنے سے پہلے کے لوگوں سے نقل کرنے لگا، اس خیال سے کہ اس کی ضرور کوئی اصل ہوگی۔ اس سلسلے میں سلفِ صالح سے جو کچھ منقول ہے اس کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا، حالانکہ یہ لوگ اس باب میں پیشوا اور مقتدا کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

آگے چل کر قرآن کی تفسیر مسلک وفن کے اعتبار سے کی جانے لگی۔ اس خطرناک رجحان نے جو مہلک نتائج پیدا کیے اس کی تفصیل کرتے ہوئے ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں:

ثم صنف بعد ذالك قوم برعوا فی شئی من العلوم

---

[1] کشف الظنون، ج ا ص ۳۰۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

و(منهم من) ملاء كتابه بما غلب على طبعه من الفن واقتصر فيه على ماتمهّر هو فيه، كانّ القرآن انزل لاجل هذا العلم لاغير مع ان فيه تبيان كل شئی. فالنحوی تراه ليس له هم الّا الاعراب وتكثير الاوجه المحتملة فيه وان كانت بعيدة، و ينقل قواعد النحو ومسائله وفروعه وخلافياته كالزجاج والواحدی فی البسيط وابی حيان فی البحر والنهر، والاخباری ليس له شغل الا القصص واستيفاؤها والاخبار عن سلف سواء كانت صحيحة اوباطلة، ومنهم الثعلبی، والفقيه يكاد يسرد فيه الفقه جميعاً وربما استطرد الی اقامة ادلة الفروع الفقهية التی لاتعلق لها بالآية اصلاً والجواب عن ادلة المخالفين كالقرطبی، وصاحب العلوم العقلية خصوصاً الامام فخرالدين قدملأ تفسيره باقوال الحكماء والفلاسفة وخرج من شئی الی شئی حتی يقضی الناظر العجب. قال ابوحيان فی البحر، جمع الامام الرازی فی تفسيره اشياء كثيرة طويلة لا حاجة بها فی علم التفسير، ولذالك قال بعض العلماء فيه كل شئی الا التفسير، وللمبتدع ليس له قصد الّا تحريف الآيات وتسويتها على مذهبه الفاسد بحيث انه لولاح له شاردة من بعيد اقتنصها اووجد موضعاً له فيه ادنی مجال سارع اليه

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

...... والملحد فلا تسئل عن كفره والحاده فى آيات الله وافترائه على الله مالم يقله ...... ومن ذالك القبيل الذين يتكلمون فى القرآن بلاسند ولا نقل عن السلف ولارعاية للاصول الشريعة والقواعد العربية كتفسير محمود بن حمزة الكرمانى فى مجلدين، سماه العجائب والغرائب، ضمنه اقوالا هى عجائب عندالعوام وغرائب، عما عهد عن السلف بل هى اقوال منكرة لايحل الاعتقاد عليها ولا ذكرها الا للتحذير من ذالك ...... وسئل البلقينى عمن فسر بهذا فافتى بانه ملحد. واما كلام الصوفية فى القرآن فليس بتفسير، قال ابن الصلاح فى فتاواه وجدت عن الامام الواحدى انه قال صنف السلمى حقائق التفسير، ان كان قد اعتقد ان ذالك تفسير فقد كفر، قال النسفى فى عقائده النصوص تحمل على ظواهر هاو العدول عنها الى معانى يدعيها اهل الباطن، الحاد[1]۔

"اس کے بعد ایسے لوگوں نے کتابیں تصنیف کیں جو کسی علم و فن میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس گروہ سے تعلق رکھنے والے بعض اہلِ علم نے اپنی کتابوں کو اس فن سے بھر دیا جس سے ان کو غیر معمولی طبعی شغف تھا اور اس علم تک خود کو محدود کر لیا جس میں انھیں مہارت حاصل تھی۔ گویا قرآن اسی علم کے لیے نازل کیا گیا تھا، حالانکہ اس میں

[1] کشف الظنون، ج۱، ص۳۰۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہر چیز کا بیان ہے۔ چنانچہ نحوی کے پیش نظر فقط اعراب اور وجوہ ترکیب ہوتی ہیں، خواہ وہ بعید ہی کیوں نہ ہوں، وہ نحو کے قواعد، اس کے مسائل وفروع اور خلافیات ہی کو اپنی کتاب میں لے گا، جیسا کہ زجاج اور واحدی نے 'بسیط' میں اور ابوحیان نے 'بحر اور نہر' میں کیا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے (اخباری) کو صرف قصوں اور گزشتہ واقعات ہی سے دلچسپی ہوتی ہے، خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ ثعلبی کا تعلق ان ہی لوگوں سے ہے۔ فقیہ بھی لگ بھگ یہی چاہتا ہے کہ قرآن میں ساری فقہ کو بیان کر دے اور بسا اوقات وہ ایسے فروعی فقہی دلائل قائم کرتا ہے جن کا آیت سے فی الحقیقت کوئی تعلق نہیں ہوتا اور پھر مخالف کے دلائل کا جواب بھی دیتا ہے۔ قرطبی کا شمار اسی گروہ فقہاء میں ہوتا ہے۔ عقلی علوم کے ماہرین بالخصوص امام فخرالدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں حکماء وفلاسفہ کے اقوال بھر دیے ہیں۔ وہ آیت کی تفسیر میں بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ابوحیان نے 'بحر' میں لکھا ہے کہ امام رازی نے اپنی تفسیر میں بکثرت ایسی چیزیں نہایت تفصیل سے لکھی ہیں جن کی علم تفسیر میں چنداں ضرورت نہ تھی۔ اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ اس میں سب کچھ ہے، بجز تفسیر کے۔ اسی طرح ایک بدعتی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ آیات میں تحریف کر کے اس کو اپنے فاسد مذہب پر منطبق کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی دور کی بات بھی اس کے ذہن میں آجاتی ہے تو اس کو بھی لے لیتا ہے، یا اگر اسے کوئی ایسا موقع ملتا ہے

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

جس سے فائدہ اٹھانے کی معمولی گنجائش بھی ہو تو اس کی طرف تیزی سے بھاگتا ہے۔ رہا ملحد تو اللہ کی آیات کا کفر والحاد اور اللہ کی ذات پر اس کی افترا پردازی کا پوچھنا ہی کیا۔ اسی گروہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن میں کلام کرتے ہیں، نہ کوئی سند، نہ اقوالِ سلف کا کوئی حوالہ، اور نہ ہی شرعی اصول اور عربی قواعد کا کوئی پاس ولحاظ۔ مثلاً محمد بن حمزہ کرمانی کی تفسیر جو دو جلدوں میں ہے۔ اس کا نام 'العجائب والغرائب' ہے۔ اس میں ایسے اقوال ہیں جو عوام کی نظروں میں عجیب اور سلف کے طریقے سے بالکل الگ ہیں، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ ایسے ناپسندیدہ اقوال ہیں کہ ان پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں۔ ان کو صرف تحذیر کی غرض سے ہی بیان کیا جاسکتا ہے۔ ایسے مفسروں کے بارے میں بلقینی سے پوچھا گیا تو انھوں نے فتویٰ دیا کہ وہ ملحد ہیں۔ قرآن کے بارے میں صوفیاء کے کلام کو تفسیر نہیں کہا جاسکتا ہے۔ ابن صلاح نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ میں نے امام واحدی سے اس بارے میں معلوم کیا تو انھوں نے کہا کہ سلمی نے 'حقائق التفسیر' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ جو شخص اس کو تفسیر کہے وہ کافر ہے۔ نسفی نے 'عقائد' میں لکھا ہے کہ نصوص کو ان کے ظواہر پر محمول کیا جائے گا، ان سے عدول کرکے اہل باطن کے مطلوب معانی کی طرف جانا الحاد ہے''۔

معلوم ہوا کہ ان تمام اہل علم کی تفسیروں پر تفسیر بالرائے کا اطلاق ہوگا جنھوں نے کسی مخصوص مسلک کے اثبات یا اپنے عہد کے علوم ونظریات سے متاثر ہوکر قرآن کی تفسیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لکھی ہے۔ چنانچہ فلاسفہ، متکلمین اور صوفیاء نے جو تفسیریں لکھی ہیں ان میں تفسیر بالرائے کا رنگ پوری طرح غالب ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے بالکل واضح ہے۔

مشہور فلسفی ابن سینا (م ۱۰۸۰ء) نے سورۂ اخلاص اور سورۂ والناس کی جو تفسیر لکھی ہے وہ اس طرز تفسیر کا بدترین نمونہ ہے۔ صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی کا جو درجہ ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ انھوں نے قرآن کی آیت: واعبد ربك حتی یاتیك الیقین (سورۂ حجر۔۹۹) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: حتی یاتیك حق الیقین منتهی عبادتك بالقضاء وجودك فیكون هذا العابد والمعبود جمیعا لا غیره [۱] "یہاں تک کہ تجھے حق الیقین حاصل ہو اور تیرے وجود کے ختم ہونے سے تیری عبادت بھی ختم ہو جائے، پھر عابد ومعبود دونوں ایک ہوں گے، غیر نہیں"۔ یہ شعر بھی ان ہی کا ہے جس سے ان کے مذکورہ خیال پر مزید روشنی پڑتی ہے:

الرب حق والعبد حق یالیت شعری من المكلف
ان قلت عبد فذاك میت او قلت رب انی یكلف [۲]

"رب حق ہے اور بندہ بھی حق ہے۔ کاش مجھے معلوم ہو کہ
مکلف کون ہے؟ اگر تو کہے کہ بندہ ہے تو وہ معدوم ہو چکا، اور
اگر کہے کہ رب ہے تو وہ کیسے مکلف ہوگا"

اس سے پہلے مشہور صوفی ابوعبدالرحمٰن سلمی اور ان کی تفسیر 'حقائق التفسیر' کا ذکر ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں کئی علماء کی رائیں بھی نقل کی گئی ہیں کہ اس تفسیر میں کفر و ضلالت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے [۳]۔

---

[۱] عرائس البیان، ج۱، ص۵۲۰ (برحاشیہ)   [۲] الفتوحات المکیہ، ج۱، ص۲
[۳] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص۹۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شیخ علی مھائمی (م ۸۳۵ھ) ایک ہندی عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے 'تبصیر الرحمن وتیسیر المنان' (معروف بہ تفسیر مہائمی) کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے اور اس میں آیات کے درمیان ربط و نظم بیان کرنے کا بالخصوص اہتمام کیا ہے۔ لیکن صوفی ہونے کی وجہ سے آیات کی جو تفسیر بیان کی ہے اس میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے، جگہ جگہ احسان و سلوک کا مضمون زیر بحث آیا ہے۔ وہ شیخ محی الدین ابن عربی کے غالی معتقد اور ان کے نظریۂ وحدت الوجود کے زبردست حامی تھے۔ اس کے اثرات بھی تفسیر میں واضح طور پر ملتے ہیں۔

علامہ زمخشری (م ۵۳۸ھ) فقہ و لغت کے امام تھے۔ ان کی تفسیر 'الکشاف' میں نحو و بلاغت سے متعلق بہت سی مفید باتیں پائی جاتی ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ "زمخشری اپنی تفسیر میں قرآن کی عبارت پر اپنی توجہ مبذول رکھتے ہیں۔ لغت، اعراب، ربط کلام ہر چیز سے بحث کرتے ہیں۔ وہ کلام کو طول دیے بغیر معتزلہ کے مذہب کی تائید کرتے ہیں اور روایات بہت کم لاتے ہیں۔ ان کی تفسیر کی نمایاں خصوصیت اس کا مختصر ہونا اور لغت و اعراب کی تحقیق کی غلطیوں کا کم ہونا ہے۔ لہٰذا یہ تفسیر طالب علموں کے لیے زیادہ مفید ہے۔[1]"

لیکن اس تفسیر میں اعتزال کا رنگ غالب ہونے کی وجہ سے اس کی معتبریت متاثر ہوئی ہے۔ جن آیات کی تفسیر انھوں نے مسلکِ اعتزال کے مطابق کی ہے اور سیاقِ کلام سے اس کی تائید نہ ہوتی ہو، یقیناً ان پر تفسیر بالرائے کا اطلاق ہوگا۔

اسی ذیل میں امام رازیؒ کی تفسیر (تفسیر کبیر) بھی آتی ہے۔ اس میں دو رائے

---

[1] تفسیر قرآن کے اصول، ص ۶۸ (زمخشری نے فضائل قرآن کے بیان میں جو روایتیں نقل کی ہیں وہ زیادہ تر ضعیف ہیں (مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۱۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہ تفہیمِ قرآن سے متعلق اس میں بہت سی مفید باتیں موجود ہیں، لیکن کلامی مباحث کی کثرت اور فلسفۂ یونان کی خوشہ چینی کی وجہ سے اس کا ایک بڑا حصّہ تفسیر بالرّائے کے زمرہ میں آتا ہے۔ مولانا فراہیؒ نے اس تفسیر کے متعلق لکھا ہے کہ ''اس میں قرآن کے بعض ایسے معارف واضح ہوئے ہیں جو اگرچہ آیات میں موجود تھے لیکن سلف سے مروی تفسیر میں وہ کہیں بیان نہیں ہوئے ہیں...... لیکن رازی نے قرآن کی دلالت کو ظنّی قرار دیا ہے۔ مثلاً آیت: اذاجاء نصراللّٰہ والفتح میں وہ فتح سے مراد فتحِ مکہ، فتحِ طائف، فتح خیبر، فتح عام، فتح علوم اور فتحِ معقولات سب لیتے ہیں...... وہ اشاعرہ کے مذہب کی تائید کرتے ہیں۔ اس تفسیر کی بڑی خوبی اقوالِ متکلمین کا جامع ہونا ہے۔ تفسیر کے اسی کمزور پہلو (یعنی کلامی اقوال کی کثرت) کے باعث ابن جریر کی تفسیر کی طرح اس میں بھی غث وسمین، خلط ملط اور نہایت ہی بھونڈی باتیں داخل ہوگئی ہیں[1]''

تفسیرِ علمی

قرآن کی ایسی تفسیریں بھی لکھی گئی ہیں جن میں قرآن کے علوم ومعارف کے بیان میں غلو اختیار کیا گیا ہے۔ علماء نے یہ تفسیریں اس لیے لکھی ہیں تاکہ ثابت کیا جائے کہ قرآن میں جملہ علوم وفنون کا ذکر ہوا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور یہ ایک علمی معجزہ ہے۔ امام غزالیؒ کی کتاب 'جواہر القرآن' اسی طرزِ فکر کی ترجمان ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ قرآن میں دنیا کے سارے علوم کا ذکر ہوا ہے، مثلاً علم طب، علمِ نجوم، علمِ ہیئت، علمِ بدنِ حیوان، تشریح الاعضاء (اناٹمی) علمِ سحر، علمِ طلسمات وغیرہ۔ ان علوم کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر قرآن کے اصول، ص ۶۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''ان کے سوا اور بھی علوم ہیں جن کے عنوان معلوم ہیں اور دنیا ان کے جاننے والوں سے خالی نہیں ہے، اور ایسے اصناف علوم بھی ہیں جو ابھی تک حیز امکان میں ہیں اور بالقوہ موجود ہیں مگر ابھی بالفعل ان کا وجود نہیں ہوا ہے، اگرچہ ان تک پہنچنا آدمی کے بس میں ہے۔ ......اور ایسے علوم بھی ہیں جن کا ادراک اور احاطہ سرے سے بشر کی طاقت سے باہر ہے[1]''۔

آگے چل کر اس خالص علمی طرز تفسیر کو مقبولیت حاصل ہوئی اور ایسی تفسیریں لکھی گئیں جن کا تعلق مظاہرِ فطرت اور قرآن کی مختلف آیات میں تطبیق سے ہے۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ جدید سائنس نے کائنات اور انسان سے متعلق جو انکشافات کیے ہیں وہ سب پہلے سے اشارتاً یا صراحتاً قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً محمد بن احمد الاسکندری (تیرہویں صدی ہجری) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام 'کشف الاسرار النورانية القرآنية فی ما يتعلق بالاجرام السماوية والا رضية والحيوانات و النباتات والجواهر المعدنية' ہے۔ اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب 'بيان اسرار الربانية فی النباتات والمعادن والخواص الحيوانية' ہے۔ یہ دونوں کتابیں بالترتیب ۱۲۹۷ھ اور ۱۳۰۰ھ میں قاہرہ سے چھپ چکی ہیں۔

بعض دوسرے اصحاب علم نے بھی اسی طرز کی کتابیں لکھی ہیں۔ سید عبدالرحمن الکواکبی نے 'طبائع الاستعداد' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ سائنس کے جدید انکشافات کچھ نئے نہیں ہیں، قرآن میں ان سب باتوں

---

[1] جواہر القرآن، بحوالہ دائرہ معارف اسلامیہ (اردو) ج ۶، ص ۳۹۹-۵۰۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی طرف اشارات موجود ہیں۔ یہ اب تک اس لیے پردۂ خفا میں رہے کہ ایک خاص زمانے میں جو دراصل عہد حاضر ہے، قرآن کا علمی معجزہ بن کر ظاہر ہوں اور ثابت ہو کہ یہ خدا کا کلام ہے[1]۔

مشہور مصری ادیب مصطفیٰ صادق رافعی نے اپنی کتاب 'اعجاز القرآن' میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن میں جملہ علوم کے اصول وکلیات موجود ہیں۔ اگر جدید علوم کا کوئی عالم قرآن میں کافی غور وفکر کرے اور طبعِ سلیم بھی رکھتا ہو تو اس کو جگہ جگہ ایسے اشارات ملیں گے جو حقائقِ علوم سے تعلق رکھتے ہیں اور کائنات کے بہت سے حقائق کی طرف اجمالاً رہبری کرتے ہیں[2]۔ اس سلسلے میں شیخ طنطاوی جوہری کی علمی موشگافیاں سب پر بازی لے گئیں۔ ان کی کتاب 'الجواھر فی تفسیر القرآن الحکیم' کافی شہرت رکھتی ہے۔ ۱۹۸۸ء میں پاکستان سے ایک کتاب 'مظاہر فطرت اور قرآن' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر سید عبدالودود ہیں۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ قرآن میں فطرت کے بہت سے پوشیدہ حقائق کا ذکر ہوا ہے۔

ان سب کتابوں کا شمار تفسیر بالرائے میں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں آیات کا مفہوم متعیّن کرنے میں سیاقِ کلام اور نظائر کا بالکل لحاظ نہیں کیا گیا ہے اور الفاظ کے معنیٰ معلوم کرنے میں کلاسیکی عربی ادب اور لغات سے کوئی مدد نہیں لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر مقامات پر آیات سے وہ مفہوم مراد لیا گیا ہے جس سے جدید سائنسی انکشافات کی تائید ہو۔

یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں۔ قرآن میں

---

1. طبائع الاستعداد، ص ۲۶، ۲۷

2. اعجاز القرآن، ص ۱۴۵، ۱۴۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک جگہ فرمایا گیا ہے: وتری الجبال تحسبها جامدة وهی تمرّ مرّ السحاب (سورۃ نمل۔۸۸) ۔اس آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے"اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر خیال کرتے ہو کہ وہ جامد ہیں حالانکہ یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہیں۔"اس ترجمہ سے انہوں نے ثابت کیا ہے کہ زمین چل رہی ہے۔لیکن یہ مفہوم اس لیئے غلط ہے کہ سیاقِ کلام سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔نظم کلام صاف بتا رہا ہے کہ اس میں وقوعِ قیامت کے دن کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے کہ اس روز پہاڑ جو اس وقت زمین میں مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں، بادلوں کی طرح اڑیں گے۔مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ ہوگا"اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرتے ہو کہ وہ جامد ہیں (اور کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے، حالانکہ روز قیامت) وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے"۔

دوسری مثال کا تعلق درج ذیل آیت سے ہے:

اولم یر الذین کفروا انّ السمٰوٰت والارض کانتا رتقا ففتقنٰهما (سورۃ انبیآء۔۳۰)

"کیا منکرین حق غور نہیں کرتے کہ زمین و آسمان (پہلے) باہم ملے ہوئے (منہ بند) تھے، پھر ہم نے انہیں کھول دیا۔"

تفسیرِ علمی کے قائلین نے اس آیت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس میں آغازِ کائنات کا بیان ہے اور بتایا گیا ہے کہ کائنات کے سارے اجزاء جو اس وقت منتشر دکھائی دیتے ہیں، کبھی باہم متحد تھے۔ایک خاص وقت میں اللہ کے حکم سے پھٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے اور اس طرح کائنات کے مختلف مظاہر وجود میں آئے۔سائنس کی اصطلاح میں اس واقعۂ ظہور کو Big Bang Theory کہا جاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کی وضاحت سائنسدانوں نے اس طرح کی ہے کہ کائنات ابتدا میں ٹھوس مادّوں کا ایک مجموعہ (Primodial Mass) تھی اور اندازہ کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۵ ملین سال پہلے یہ کائناتی مادہ ایک عظیم دھماکے سے پھٹ کر خلا میں منتشر ہو گیا اور پھر اس منتشر مادے کا ایک حصہ قانونِ تجاذب (Gravitational Attraction) کے سبب منجمد ہو گیا اور اس طرح کہکشائیں اور ستارے وجود میں آئے۔

لیکن مذکورہ آیت کی یہ تشریح صحیح نہیں ہے[1] اس غلطی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آیت کے سیاق و سباق کو نہیں دیکھا گیا اور لفظ 'فتق' پر ایک نئے خیال کی عمارت کھڑی کر دی گئی۔ فتق کے معنی پھاڑنے کے بھی ہیں اور کھولنے کے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب نہ آسمانوں سے بارش ہوتی تھی اور نہ زمین میں روئیدگی کی صلاحیت تھی۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے پانی برسایا اور اس پانی سے زمین کی پشت پر زندگی کا ہنگامہ شروع ہوا، سبزے اور نباتات نکلے اور اس طرح انسان کی گزر بسر کا سامان مہیا ہوا۔ اس مفہوم کی تائید اگلی آیت سے ہوتی ہے: وجعلنا من الماء کل شیء حیّ ؕ (آیت ۳۰) ''ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز بنائی۔'' یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لفظ 'فتق' کے بعض مشتقات کا تعلق بارش سے ہے۔ مثلاً ''خرج فلان الی فَتُقٍ'' [2] کا مطلب یہ ہے کہ فلاں آدمی ایسے مقام کی طرف گیا جہاں بارش نہیں مگر اس کے اردگرد بارش ہے۔''

۱۰ اس گفتگو سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن میں کائنات کے حقائق سے کہیں

---

[1] پہلے غلطی سے راقم کا بھی یہی خیال تھا۔ دیکھیں، راقم کی کتاب، وجود خدا کا اثبات قرآن اور سائنس کی روشنی میں، ص ۳۱۹

[2] دیکھیں، منجد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔ بہت سی آیات میں انفس و آفاق کے حقائق کا ذکر اجمالاً ہوا ہے۔ اور یہ خیال صحیح نہیں ہے جیسا کہ علامہ شاطبی نے لکھا ہے، کہ قرآن میں انہیں علوم کا ذکر ہوا ہے جن سے اہل عرب مانوس تھے[1] قرآن صرف عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا، یہ قیامت تک کے انسانوں کی ذہنی اور اخلاقی رہبری کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس لیے اس میں ان علوم کا بھی ذکر ہوا ہے جن سے اہل عرب بالکل ناواقف تھے۔ مثلاً سورۂ طارق کی آیت: فلینظر الانسان مما خلق ○ خلق من ماء دافق ○ یخرج من بین الصلب والترائب (آیات ۵۔۷) ''پس انسان دیکھے کہ وہ کس چیز سے بنایا گیا ہے؟ اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا جو ریڑھ اور پسلی کی ہڈی کے درمیان سے نکلتا ہے۔'' اس دعویٰ پر دلیل ہے۔

بظاہر یہ ایک حقیقت ہے کہ منی کی جائے پیدائش اور اس کا مخرج دونوں خصیے ہیں، لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ مخرج 'بین الصلب والترائب' ہے۔ اور اس کا یہ بیان جدید علم تشریح کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔ یہ بات انیسویں صدی سے پہلے کسی بڑے سے بڑے عالم طب کو جس میں بابائے طب بقراط بھی شامل ہے، معلوم نہیں تھی۔ جدید علمِ تشریح (ماڈرن اناٹمی) سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خصیوں کا اصل خلقی مقام وہ ہے جس کو آیت میں 'بین الصلب والترائب' کہا گیا ہے۔ پیدائش سے ذرا پہلے یہ اس مقام سے کھسک کر فوطے میں آجاتے ہیں۔ اس نقل مکانی کی وجہ یہ ہے کہ جرثومۂ حیات (Spermatozoa) کی تولید کے لیے کم درجۂ حرارت درکار ہے اور اندرونِ شکم درجۂ حرارت زیادہ ہے[2]

---

[1] الموافقات، ج ۲، ص ۴۶

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں، راقم کی کتاب 'وجود خدا کا اثبات قرآن اور سائنس کی روشنی میں' ص ۳۴۱۔۳۴۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسری مثال سورۂ مومنون کی آیات (۱۲۔۱۴) ہیں۔ ان میں انسان کے مادۂ تخلیق (سلالة من طين) اور مدارجِ تخلیق کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ تخلیقی مدارج پانچ ہیں، ایک نطفہ، دوسرا علقہ، تیسرا مضغہ، چوتھا عظم ولحم اور پانچواں وہ درجہ ہے جس کو آیت میں 'خلقاً اخر' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل عرب ان مدارجِ خمسہ کی حقیقت سے بالکل بے خبر تھے۔ اور یہ اہل عرب ہی پر موقوف نہیں، ان کے بعد بھی ایک طویل زمانہ تک اصحابِ علمِ طب بدن انسان کے ان تخلیقی حقائق کے ادراک سے قاصر رہے۔ ان مدارجِ تخلیق کی اصل حقیقت اس وقت معلوم ہوئی جب جدید علم الجنین (Embryology) وجود میں آیا۔

ایک تیسری مثال بھی دیکھیں اور اس کا تعلق وقوعِ قیامت کی ایک حالت سے ہے۔ سورۂ دخان میں فرمایا گیا ہے: فارتقب یوم تاتی السماءُ بدخانٍ مّبین (آیت ۱۰) ''اس دن کا انتظار کرو جس دن آسمان ایک کھلے ہوئے دھویں کے ساتھ نمودار ہوگا۔'' اس آیت کا مطلب اہل عرب تو کیا جدید دور کے بہت سے اہل علم بھی ایک طویل مدت تک سمجھنے سے قاصر رہے۔

اس سلسلے میں دو روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک روایت کا تعلق حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس میں قحط کی طرف اشارہ ہے، جس میں اہلِ عرب حضور کی بددعا کی وجہ سے مبتلا ہوگئے تھے۔ قحط کے ان دنوں میں جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اس کو شدید بھوک کی وجہ سے وہ دھواں دھواں نظر آتا تھا[1]

دوسری روایت میں اس کے بالکل برعکس بات کہی گئی ہے، یعنی آیات میں جس دھواں کا ذکر ہے اس کا تعلق وقوعِ قیامت کے قرب سے ہے۔ اس دن یہ آسمان سے

---

[1] رواہ البخاری واحمد والترمذی وغیرہم عن مسروق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نمودار ہو کر اہل زمین پر چھا جائے گا۔ اس عذاب میں اہل کفر مبتلا ہوں گے[۱]۔ ایک اور حدیث میں اس دھواں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا گیا ہے[۲]۔

ان میں سے پہلی روایت اس لیے غلط ہے کہ اس کی تائید سیاقِ آیت سے نہیں ہوتی۔ زیرِ بحث آیت سے پہلے کی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ کفار وقوعِ قیامت میں شک کرتے ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں (بل هم فی شک یلعبون) اور اس کے مابعد کی آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ ایک عذاب ہے جس میں منکرینِ آخرت مبتلا ہوں گے (یغشی الناس ھذا عذاب الیم)۔

دوسری روایت صحیح ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ دھواں کیسا ہوگا۔ قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ زمین اور آسمان کی تخلیق سے پہلے فضائے بسیط میں صرف دھواں تھا (حم سجدہ۔۱۱)۔ اور اسی کے منجمد ہونے سے رفتہ رفتہ آسمان اور زمین وجود میں آئے۔ جس وقت اس کائنات کی مقررہ مدت حیات ختم ہونے کو ہوگی تو یہ مختلف عوامل کے تحت دوبارہ گرم دھواں میں تبدیل ہو جائے گی۔ سورۂ دخان میں وقوعِ قیامت کی اسی ہوش ربا حالت کا بیان ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لیں کہ قرآن میں جہاں انفس و آفاق کے حقائق کا اجمالی ذکر ہوا ہے وہاں اس سے مقصود مجرد کسی کائناتی حقیقت کا انکشاف نہیں بلکہ اس کی غرض قرآن کے بنیادی مضامین، توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات ہے۔ انفس و آفاق سے متعلق قرآنی آیات کا مطالعہ اسی زاویۂ نگاہ سے کرنا چاہیے اور اس طرح کی آیات کا وہی مفہوم صحیح ہوگا جس کی تائید سیاقِ کلام اور قرآن کے نظائر سے ہوتی ہو۔ اس کے

۱۔ رواہ البخاری عن ابن عمرؓ وسعید بن خدریؓ

۲۔ مسلم، رواہ حذیفہ بن اسید الغفاریؓ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علاوہ سائنسی علوم کو صرف ان آیات کی تائید و تصدیق کے لیے لایا جائے۔ جہاں قرآن اور سائنس کے بیان میں اختلاف ہو وہاں توقف سے کام لیا جائے۔ یہ عین ممکن ہے کہ متعلقہ آیت کا مفہوم ٹھیک طور پر نہ سمجھا گیا ہو یا سائنس کی تحقیق میں کوئی نقص ہو۔

ملحوظ رہے کہ سائنسی معلومات دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو مسلسل تجربات کے عمل سے گزر کر مسلّمہ حقیقت کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، مثلاً زمین کی گردش، کششِ ثقل، سورج گرہن اور چاند گرہن کے وقوع سے متعلق پیشین گوئی اور سورج کے طلوع و غروب کے مقررہ اوقات وغیرہ۔ دوسری قسم کی معلومات وہ ہیں جن پر ابھی تجربات نے مہرِ تصدیق ثبت نہیں کی ہے، وہ ابھی مشاہدہ و تجربہ کے مرحلہ سے گزر رہی ہیں، دوسرے لفظوں میں اصولِ موضوعہ (Hypothesis) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اوّل الذکر معلومات اور قرآن کے بیان میں بشرطیکہ اس کا مفہوم خوب غور و فکر کے بعد متعین کیا گیا ہو، کسی اختلاف و تضاد کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اختلاف صرف دوسری قسم کی معلومات کے ساتھ ممکن ہے۔ یہاں اس وقت تک توقف سے کام لیا جائے جب تک کہ سائنس کسی حتمی نتیجہ تک نہ پہنچ جائے اور تجربہ سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔

• مثلاً، قرآن میں کہا گیا ہے کہ سات آسمانوں کی طرح سات زمینیں بھی پیدا کی گئی ہیں (سورۂ طلاق۔۱۲)۔ ایک دوسری آیت میں ہے کہ زمین کی طرح آسمانوں میں بھی 'دابۃ' یعنی جاندار مخلوقات ہیں (سورۂ شوریٰ۔۲۹)۔ ان کائناتی حقائق کے متعلق ابھی سائنس کی تحقیق بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔ اس لیے ان آیات پر کامل یقین کے باوجود اس دن کا انتظار کرنا ہوگا جب سائنس داں ان حقائق کا تجرباتی ادراک کر لیں۔ قرآن میں اس طرح کے آفاقی حقائق کا ذکر جن کے فہم سے ابھی تک سائنس قاصر ہے، اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ اس کا ماخذ کسی انسان کا ذہن نہیں ہو سکتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گزشتہ صفحات میں تفسیرِ ماثور اور تفسیرِ غیر ماثور کا جو تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اس سے بالکل واضح ہوگیا کہ تفسیر کے یہ دونوں طریقے ناقص ہیں۔ ان کے جزئی فائدوں سے انکار نہیں لیکن ان سے قرآن کی کلی تفہیم ممکن نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اگر تفسیر کے یہ دونوں طریقے ناقص ہیں تو پھر تفسیر کا صحیح اور کامل طریقہ کیا ہے؟ اس سوال کا مختصر جواب یہ ہے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ اور مامون طریقہ جس کا ذکر تفسیرِ ماثور کے ذیل میں آچکا ہے، 'تفسیر القرآن بالقرآن' ہے۔ اگلے باب میں اس طریقۂ تفسیر کو اس کے اصولوں کے ساتھ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تفسیرِ قرآن میں اختلاف اور اس کے وجوہ

قرآن آخری کتاب ہدایت ہے، اس کے بعد نہ کوئی رسول آنے والا ہے اور نہ کوئی دوسری کتاب۔ اس لیے یہ بہت ضروری تھا کہ قرآن کی تفہیم و تفسیر میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف و تفرقہ نہ کریں اور اپنے دین کی وحدت کو قائم رکھیں۔ فرمایا گیا ہے:

ولا تکونوا کالّذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء
هم البیّنات ط (سورہ آل عمران:۱۰۵)

”ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنھوں نے (حق کے) روشن
دلائل آنے کے بعد باہم تفرقہ و اختلاف کیا۔“

لیکن اس نصیحت کے باوجود اختلاف ہوا اور شدت کے ساتھ ہوا۔ آیئے، دیکھیں کہ قرآن کے واضح اور قطعی الدلالت ہونے کے باوجود اس کی تفہیم و تفسیر میں علماء

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اور مفسرین کے درمیان اختلاف کیوں ہوا؟

تفسیر قرآن میں اختلاف کی ایک بڑی وجہ آیات کے سیاق وسباق اور نظائر سے چشم پوشی ہے۔ تفسیر کی کتابوں سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ فرمایا گیا ہے:

ولهن مثل الّذی علیهن بالمعروف وللرجال علیهن درجة ؕ واللّٰهُ عزیز حکیم ۝ (سورہ بقرہ: ۲۲۸)

''عورتوں (بیویوں) کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر)، اسی طرح جیسے دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ اور مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے، اور اللہ غالب ودانا ہے۔''

اس 'درجہ' کا کیا مفہوم ہے، اس میں اختلاف ہے۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں مختلف روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق درجہ سے مراد وہ فضیلت ہے جو مردوں کو میراث اور جہاد میں عورتوں پر حاصل ہے۔ مجاہد سے یہی مروی ہے۔ بعض لوگوں نے درجہ سے امارت اوراطاعت مراد لی ہے، یعنی بیویوں پر واجب ہے کہ وہ شوہروں کی اطاعت کریں لیکن شوہروں پر بیویوں کی اطاعت واجب نہیں ہے[1] (یطعن الازواج للرجال ولیس الرجال یطیعونهن)۔

علامہ بغوی نے بھی اپنی تفسیر میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ درجہ سے مراد مہر اور وہ مال ہے جو مرد عورت پر خرچ کرتا ہے۔ قتادہ نے اس سے جہاد مراد لیا ہے۔ اس کے علاوہ شہادت، عقل، میراث اور دیت

---

[1] تفسیر طبری، ج۴، ص۵۳۴

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

وغیرہ مفاہیم بھی مراد لیے گئے ہیں[1]۔ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اس سے حق میں فضیلت مراد ہے[2]۔

لیکن ان میں سے ایک مفہوم بھی صحیح نہیں ہے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ ان مفسرین نے آیت کے سیاق وسباق پر غور نہیں کیا۔ مذکورہ آیت سے پہلے یہ فقرہ موجود ہے: وبعولتهن احق بردهن فی ذالك ان ارادوا اصلاحاً، اس فقرہ نے آیت کے مفہوم کو ٹھیک طور پر متعین کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاقِ رجعی کے بعد شوہر کو عدت کے اندر بیوی کو واپس لینے کا اختیار ہے، بشرط یہ کہ اس رجعت سے مقصود اصلاح ہو۔ اس صورت میں عورت (بیوی) اس بات کی پابند ہے کہ وہ اس کی زوجیت میں واپس جائے۔ شوہر کے اسی حقِ رجعت کو آیت میں 'علیهن درجة' کہا گیا ہے[3]۔

دوسری مثال سورۂ نور کی آیت ۶۳ ہے۔ فرمایا گیا ہے: لاتجعلوا دعاء الرسول بینكم كدعاء بعضكم بعضا[4] ''تم لوگ رسول کے بلانے کو اس طرح کا بلانا نہ سمجھو جس طرح تم ایک دوسرے کو بلاتے ہو''

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام رازیؒ نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ''اس آیت کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔ مبرد اور قفال نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ تمھیں جو حکم دیں اور تمہارے لیے جو بھی دعا کریں اس کو وہ حیثیت نہ دو جو تم آپس میں ایک دوسرے کے حکم یا دعا کو دیتے ہو...... اس کا دوسرا مفہوم

---

[1] معالم التنزیل، ج ۲، ص ۱۰۲

[2] روح المعانی، ج ۱، ص ۱۳۵

[3] تفسیر فی ظلال القرآن، سید قطب شہیدؒ، ج ۱، ص ۲۴۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ رسول اللہ کو اس طرح نہ پکارو جس طرح تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو، یعنی یا محمد اور یا ابا القاسم مت کہو بلکہ یا رسول اللہ کہا کرو۔ یہ قول سعید بن جبیر کا ہے۔ اس کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ کو پکارتے وقت اپنی آواز کو بلند نہ کیا کرو...... اس کا چوتھا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ کی بددعا سے بچو...... میرے نزدیک ان میں سے پہلا مفہوم نظم کے لحاظ سے صحیح ہے[1]"۔

لیکن ان میں سے آیت کی ایک تاویل بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہ کسی اہم معاملے میں کوئی حکم دینے یا مشاورت کے لیے اہل ایمان کو بلائیں تو اس بلانے کو اس طرح نہ سمجھیں جس طرح وہ ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کہ جی میں آیا تو آ گئے ورنہ ٹال گئے۔ رسول کے بلانے پر آنا لازمی ہے اور جب تک اجازت نہ ملے رسول کی مجلس سے نہ جایا جائے۔ اس معاملے میں منافقین کا رویہ قابلِ اعتراض تھا۔ وہ بلانے پر کبھی تو آتے نہیں تھے اور بہانہ کر دیتے تھے اور کبھی آ جاتے تو تھوڑی ہی دیر میں حاضرینِ مجلس کی نظریں بچا کر وہاں سے کھسک جاتے تھے۔

اس مفہوم کی تائید آیت کے سیاق وسباق سے ہوتی ہے۔ ماقبل کی آیت ہے:

انما المومنون الذین آمنوا باللہ ورسولہ واذا کانوا معہ علی امر جامع لم یذھبوا حتی یستاذنوہ، "حقیقی مومن وہ ہیں جو (دل سے) اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں اور جب وہ رسول کے پاس کسی ایسے کام کے سلسلے میں حاضر ہوتے ہیں جس کے لیے لوگوں کو جمع کیا گیا ہے تو (رسول کی مجلس سے) اجازت لے کر ہی جاتے ہیں۔" اور اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: قد یعلم اللہ الذین یتسللون منکم لواذا، "اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا ہے جو (رسول کی مجلس سے) آنکھ بچا کر کھسک جاتے ہیں"۔

---

[1] تفسیر کبیر، ج ۲۳، ص ۳۹، ۴۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر میں اختلاف کا دوسرا سبب محکم اور متشابہ آیات کے تعین میں بے احتیاطی اور مسلکی جانبداری ہے۔ایک ہی آیت ایک جماعت کے نزدیک محکم ہے تو دوسرے گروہ کے نزدیک متشابہ[1]۔اس صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے امام رازیؒ نے لکھا ہے:

"ہر ایک دعویدار ہے کہ صرف وہی آیات محکم ہیں جن سے اس کے مذہب و مسلک کی تائید ہوتی ہے اور جو ان کے مخالفین کے مذہب کے موافق ہیں وہ متشابہ ہیں۔معتزلہ کے نزدیک آیت 'فمن شآء فلیومن ومن شآء فلیکفر' محکم اور آیت 'وما تشآؤن الا ان یشآء اللّٰہ رب العلمین' متشابہ ہے۔اہلِ سنت اس کے برعکس خیال کرتے ہیں۔اس لیے ضروری ہے کہ کوئی ایسا اصول ہو جو لوگوں کے لیے قابلِ اعتماد ہو اور اس کی مدد سے محکم اور متشابہ آیات میں قطعی طور پر تفریق کی جا سکے[2]۔"

اس سلسلے میں امام رازیؒ نے جو اصول مقرر کیا ہے اور جسے انھوں نے برہان قرار دیا ہے وہ درحقیقت برہان نہیں ہے اور اس سے اس نزاع کا تصفیہ نہیں ہو سکتا ہے۔اس معاملے میں سیدھا سادہ اصول یہ ہے کہ وہ سب آیات جن کا تعلق خدا کی ذات و صفات اور عالم آخرت کے احوال سے ہے متشابہ کے زمرہ میں داخل ہیں اور ان پر بالاجمال ایمان کافی ہے۔ان کے معنی و مطلب میں زیادہ موشگافی فتنہ انگیزی ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران (آیت ۷) میں واضح کر دیا گیا ہے۔

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھیں تفسیر کبیر، ج ۲، ص ۴۱۵-۴۱۷

۲ ایضاً

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے برخلاف وہ ساری آیتیں جو انسانی زندگی کے امور و مسائل سے متعلق ہیں وہ محکم ہیں۔ کسی مقام پر ان کے معنوی ابہام کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہ کر دیا جائے کہ وہ متشابہ آیات ہیں، جیسا کہ اشاعرہ اور معتزلہ نے کیا ہے، بلکہ غور و فکر سے کام لیا جائے اور ان مقامات کو بغور دیکھا جائے جہاں اس ابہام و اجمال کی تفصیل کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

کتابٌ احکمت ایٰته ثم فصّلت من لدن حکیم خبیر ٥ (سورۂ ھود:۱)

یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات (پہلے) محکم کی گئیں، پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی"

آیاتِ محکمات کے وہی معنی معتبر ہوں گے جو ظاہرِ الفاظ سے متبادر ہوں اور نظمِ کلام سے مطابقت رکھتے ہوں۔

تفسیر میں اختلاف کا تیسرا اور اہم سبب الفاظ کے صحیح معنی کو نہ سمجھنا ہے۔ معلوم ہے کہ الفاظ مختلف معنوی جہتیں رکھتے ہیں۔ کبھی لفظ باعتبار معنی مفرد ہوتا ہے، کبھی مرکب، کبھی اس کے حقیقی معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی مجازی۔ مثال کے طور پر کتاب، آیات اور سلطان کے الفاظ مشترک المعنی ہیں، یعنی ان کے ایک سے زیادہ معنی ہیں اور یہ قرآن میں ایک سے زیادہ معنوں میں استعمال بھی ہوئے ہیں۔ کون سا لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے اس کا فیصلہ آیات کے سیاق و سباق اور نظائر کی روشنی میں ہوگا۔ بہت سے مفسرین نے اس کا لحاظ نہیں کیا ہے، جس کی وجہ سے آیات کے ترجمہ و تفسیر میں غلطیاں واقع ہوئی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں بہت سے الفاظ لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اس فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ متعدد آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے۔ مثلاً 'ذکر' کے لفظ کو لیں۔ اس کے ایک معنی یاد اور یاددہانی کے ہیں لیکن یہ اصطلاحاً قرآن کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

انّا نحن نزّلنا الذکر و انّا له لحٰفظون (سورۂ حجر:۹)

''ہم نے ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

سورہ طٰہٰ کی آیت (۱۲۴): ومَنْ اعرض عن ذکری کے بارے میں امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ ''سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں ذکر سے کیا مراد ہے؟ جواب ہے کہ قرآن، اس لیے کہ اس سے پہلے کی آیت اس کی تائید کرتی ہے: فاما یاتینّکم منّی ھدیً فمن تبع الخ (سورہ طٰہٰ:۱۲۳)[۱]

اسی طرح ایک مرکب لفظ 'صراط مستقیم' ہے (سورۂ فاتحہ)۔ اس کے لغوی معنی سیدھے راستے کے ہیں۔ اس سیدھے راستے سے کیا مراد ہے، اس میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد قرآن ہے، کسی نے کہا کہ اسلام ہے، کسی نے کہا کہ اس سے اتباعِ سنت و جماعت مراد ہے، کسی نے کہا کہ اس سے طریقِ عبودیت مراد ہے، کسی نے کہا کہ اس سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مراد ہے وغیرہ[۲]۔ اس انتشارِ مفہوم کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے صراط مستقیم کو لغوی معنی میں لیا حالانکہ وہ اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی توحید۔ اس پر تفصیلی گفتگو مصطلحاتِ قرآن کے عنوان

---

۱ مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۳۸

۲ ایضاً، ص ۴۱، مزید دیکھیں، التفسیر و المفسرون، ص ۱۴۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے تحت ہو چکی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن میں کوئی مترادف لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ مفسرین نے بہت سے الفاظ کو مترادف المعنی سمجھ کر ان کا ترجمہ کیا ہے، مثلاً 'اثم' اور 'ذنب' کے الفاظ۔ دونوں کا ترجمہ گناہ کیا گیا ہے، لیکن یہ مترادف نہیں ہیں۔ اثم اس گناہ کو کہتے ہیں جو عمداً کیا جائے اور اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اسی لیے سورۂ بقرہ میں شراب اور جوئے کے بارے میں سوال ہوا تو فرمایا گیا: فیھما اثمٌ کبیرٌ ومنافع للنّاس (آیت ۲۱۹)۔ اس آیت میں اثم کا لفظ منافع کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اثم میں ضرر کا پہلو غالب ہے۔ اس میں حق تلفی کے معنی بھی ہیں۔ قرآن میں ایک جگہ اثم اور عدوان کے الفاظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں (مائدہ:۲)۔ اس سے بھی اثم کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ اس کے بالمقابل ذنب کا لفظ عمداً اور سہواً دونوں طرح کے گناہوں کے لیے بولا جاتا ہے اور اس کا دائرہ وسیع ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس سے دوسرے افراد بھی متاثر ہوں۔

تفسیر میں اسرائیلیات کی شمولیت نے بھی اختلاف کی تخم ریزی کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام اور کعب الاحبار سب سے زیادہ اسرائیلی روایات کے ناقل ہیں۔ صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عمرو واحد صحابی ہیں جنھوں نے کثرت سے اسرائیلی روایات بیان کی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے پاس اسرائیلی روایات پر مشتمل کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تقریباً دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر موجود تھا۔ بہت سے لوگ ان کے پاس جاتے اور ان روایات کے سننے کی فرمائش کرتے[1]۔

---

1. فتح الباری، ابن حجر عسقلانی، ج ۱۱، ص ۱۶۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

افسوس کہ بہت سے مفسرین نے ان بے سرو پا اسرائیلی روایات کو اپنی تفسیروں میں کسی نقد و جرح کے بغیر نقل کر دیا ہے۔ تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر اور دوسری ماثور تفاسیر میں اسرائیلیات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ان اسرائیلی روایات کی وجہ سے کئی آیتوں کا غلط مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں ہاروت اور ماروت کا ذکر ہے کہ یہ دو نہایت صالح آدمی[1] تھے جو بابل میں لوگوں کو 'نقوش' کی تعلیم دیتے تھے۔ اس سلسلے میں تفسیر ابن کثیر اور دوسری تفسیروں میں جو بے ہودہ داستان نقل کی گئی ہے اس کو پڑھ کر سخت ندامت ہوتی ہے اور حیرت بھی کہ ان اصحابِ علم نے قرآن کی تفسیر میں یہ لغو قصہ کیوں لکھا۔

تفسیر بالرّائے بھی اختلاف کی ایک قابل ذکر وجہ ہے۔ تفسیر بالرائے کا مطلب جیسا کہ اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے، کسی مخصوص نظریہ و مسلک کے مطابق آیت کی تفسیر کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا وہ مفہوم بیان کرنا جس سے ایک خاص نظریہ و مسلک کی تائید ہوتی ہو۔ فلاسفہ، گم راہ صوفیہ، اہل بدعت اور سیاسی ذہن و مزاج رکھنے والے اصحاب علم نے جو تفسیریں لکھی ہیں وہ تفسیر بالرّائے کا بدترین نمونہ ہیں۔ ان تفسیروں کو دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ان لوگوں نے قرآن ہی کی تفسیر لکھی ہے۔ ایک ایک سطر سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ آیات کے معنی و مفہوم میں تحریف کی ہے۔

مثلاً، ایک مشہور صوفی حضرت خواجہ عبداللہ احرار نے سورۂ مومن کی آیت ۱٦:

لمن الملک الیوم ط للہ الواحد القھار "آج کس کی حکومت ہے؟ صرف اللہ کی جو

---

[1] اکثر مفسرین نے ان کو فرشتہ بتایا ہے لیکن یہ خیال غلط ہے۔ راقم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اس خیال کی غلطی واضح کی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یکتا اور غالب ہے'' کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے:

''ہو سکتا ہے کہ ملک سے مراد سالک کا دل ہو یعنی جب اللہ تعالیٰ قہرِ احدیت سے کسی کے دل پر تجلی فرماتا ہے تو اس دل میں اپنے وغیر وغیریت کا کوئی نشان و اثر نہیں چھوڑتا، پھر اس دل میں 'لمن الملك' کی صدا داخل فرماتا ہے اور جب اس میں اپنے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتا تو خود ہی جواب دیتا ہے: لله الواحد القهار[1]۔''

یہ بدترین تحریف معنوی نہیں تو کیا ہے؟

تفسیر بالدرایت نے بھی اختلاف کی خلیج کو وسیع کیا ہے۔ مفسرین کے ایک گروہ نے قرآن کی تفسیر محض عقل اور علوم لسان کی مدد سے کی ہے۔ تفسیر قرآن میں عقل اور لسانی علوم کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن سیاق و سباق اور نظائر قرآن سے چشم پوشی کر کے محض عقل اور لسانی علوم کی مدد سے تفسیر کرنا اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے۔ معتزلہ نے جو تفسیریں لکھی ہیں ان میں یہ رنگِ تفسیر حاوی ہے۔ اور اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

انیسویں صدی کے بعض علماء نے علمی تفسیریں لکھی ہیں اور اس پر تفصیلی گفتگو پچھلے صفحات میں ہو چکی ہے۔ ان کی تفسیر کی غایت یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن میں اجمالاً تمام علوم کا ذکر ہوا ہے اور اس میں بہت سے کائناتی حقائق منکشف کیے گئے ہیں۔ لیکن اس کوشش میں انھوں نے عجیب وغریب معنوی تحریفات کی ہیں۔

علماء کے ایک گروہ نے تفسیر علمی کا انکار کیا ہے۔ علامہ شاطبی نے اپنی مشہور

---

[1] دانش (فصل نامہ، رایزنی فرہنگی)، ص ۱۲۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کتاب 'الموافقات'[1] میں اور مفتی محمد عبدہ نے 'تفسیر الفاتحہ'[2] میں اس طریقۂ تفسیر پر کڑی تنقید کی ہے اور اسے جدید علوم وفنون سے مرعوبیت اور قرآن کے مقصدِ نزول سے بے اعتنائی قرار دیا ہے۔

اختلاف کا ایک اور اہم سبب علماء اور مفسرین کی سہل انگاری ہے۔ انھوں نے آیات میں غور وتدبّر کا حق ادا نہیں کیا ہے، محض سرسری نظر ڈال کر جو کچھ سمجھ میں آگیا وہ لکھ دیا ہے۔ جن مفسرین نے تھوڑا بہت غور کیا ہے انھوں نے سیاقِ آیت اور نظائر پر زیادہ توجہ نہیں دی ہے۔ اس غفلت و بے توجہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کوشش کے باوجود متعدد آیات کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھ سکے ہیں۔

تفسیرِ قرآن میں اختلاف کا سدِّ باب اسی صورت میں ممکن ہے جب علماء اور مفسرین اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ قرآن اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح اور قطعی الدلالت ہے اور اس کے جملہ اجمالات کی شرح خود اللہ ربّ العزت نے کردی ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اگلے باب میں کی گئی ہے۔

---

[1] الموافقات، ج۲، ص۴۶

[2] تفسیر الفاتحہ، ص۹، ۱۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم:

احسن طریقۂ تفسیر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

احسن طریقۂ تفسیر

اس سے پہلے کہ ہم یہ بتائیں کہ قرآن کی تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ کیا ہے، چند بنیادی باتوں کا ذکر ضروری ہے، مثلاً قرآن کا لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے محفوظ ہونا، اور یہ کہ قرآن اپنے بنیادی مفہومات کی وضاحت کے لیے کسی خارجی ذریعے کا محتاج نہیں ہے، وہ خود اپنا شارح ہے۔

قرآن کی حفاظت

ماضی میں خدا کی طرف سے جو کتابیں بھیجی گئیں وہ گردشِ زمانہ کی نذر ہو گئیں یا ان میں مذہبی پیشواؤں نے تحریف کر دی۔ اور اس کی وجہ ان کی دنیا پرستی تھی۔ مثلاً یہود کے مذہبی پیشواؤں کی دین فروشی کا حال ملاحظہ ہو:

> ''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کہ خود نہ اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ دوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ تم بیواؤں کے گھر دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو۔ تمھیں زیادہ سزا ہوگی۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دوگنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔ اے اندھے راہ بتانے والو، تم پر افسوس......
>
> اے اندھے راہ بتانے والو، تم مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر لوٹ کھسوٹ اور ناپرہیزگاری سے بھرے ہیں۔

اے اندھے فریسی، پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرو تاکہ اوپر سے بھی صاف ہو جائے۔

اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اس طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔ اے ریا کار فقیہو اور فریسیو، تم پر افسوس کہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راستبازوں کے مقبرے آراستہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک نہ ہوتے ...... اے سانپو، اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے[1]۔

قرآن میں اہل کتاب کے علماء و مشائخ کی دنیا پرستی کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

یا ایھا الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ ط والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم ٥ (سورۂ توبہ: ۳۴)

اے ایمان والو، (اہل کتاب کے) اکثر علماء اور درویش لوگوں کا مال حرام طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے

---

[1] انجیل متی، باب ۱۲: ۱۳-۳۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انھیں روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں
اور ان کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک
عذاب کی خبر سنا دو۔"

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

واتلُ علیھم نبأ الّذی اتینٰہ ایٰتنا فانسلخ منھا فاتبعہ
الشیطان فکان من الغٰوین O ولو شئنا لرفعناہ بھا
ولٰکنّہ اخلد الی الارض واتّبع ھوٰہ ج فمثلہ کمثل
الکلب ج إن تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث ط

(سورۂ اعراف: ۱۷۵، ۱۷۶)

اور ان لوگوں کو اس شخص کا حال سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات کا
علم دیا تھا لیکن وہ اس کی پیروی سے نکل بھاگا۔ پس شیطان
اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گم راہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔ اور
اگر ہم چاہتے تو اس کو آیات کی بدولت بلندی عطا کرتے
لیکن وہ تو زمین (یعنی دنیا) کی طرف جھک گیا اور اس نے
اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔ پس اس کی مثال کتے کی سی
ہے کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تو بھی اور نہ کرو تو بھی اپنی (حرص
آلود) زبان باہر ہی کو نکالے رہتا ہے۔"

ایک اور جگہ ہے:

افرءیت من اتخذ الٰھہ ھوٰہ واضلّہ اللّٰہ علیٰ علم
وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشٰوۃً ط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فمن یھدیه من بعد اللّٰہ افلا تذکرون ○

(سورۂ جاثیہ: ۲۳)

"کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گم راہ کر دیا، اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اسے راہ ہدایت دکھائے۔ کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔"

اہلِ کتاب کے مذہبی پیشواؤں کے اس کردار کے پیشِ نظر جس کا اوپر ذکر ہوا، نہایت ضروری ہو گیا تھا کہ قرآن کو مذہبی طبقہ کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے بلکہ اس کی حفاظت کا غیبی انتظام ہو۔ چنانچہ خدا کی طرف سے یہ غیبی انتظام اس طرح ہوا کہ وہ بذاتِ خود ایک معجزہ بن گیا۔ آج دنیا میں قرآن کے علاوہ کوئی مذہبی کتاب ایسی نہیں جو اسی شکل و ترتیب سے محفوظ ہو جس شکل و ترتیب کے ساتھ وہ نازل ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر آج تک قرآن کا کوئی لفظ تو درکنار ایک شوشہ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوا اور نہ آیندہ ہوگا۔ قرآن کی اس معجزانہ حفاظت کا ذکر ان لفظوں میں ہوا ہے:

انّا نحن نزّلنا الذکر وانّا له لحفظون ○

(سورۂ حجر۔ ۹)

"ہم ہی نے ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں"۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ قرآن کی حفاظت سے مراد محض اس کے لفظوں کی حفاظت ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی حفاظت میں لفظوں کے ساتھ ان کے معنی کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حفاظت بھی شامل ہے اور یہ بات خود قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا گیا ہے:

انّ علینا جمعه وقرانه ○ فاذا قرانه فاتّبع قرانه ○ ثمّ
انّ علینا بیانه ○ (سورۂ قیامۃ: ۱۷-۱۹)

"ہمارے ہی ذمہ ہے قرآن (کی آیات) کی جمع وترتیب۔ پس جب ہم اس کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کر دیں تو تم اس جمع وترتیب کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت"۔

قرآن خود اپنا شارح ہے

سورۂ قیامہ کی مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن خود اپنا شارح ہے، اس کی شرح و وضاحت کے لیے کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ علماء نے اس واضح آیت کا یہ مطلب بیان کیا کہ قرآن کی شرح و وضاحت کا کام صالح علماء کے سپرد کیا گیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

"باز بر ما است توضیح قرآن ودر ہر عصرے علماء را توفیق بشرح غریب قرآن وبیانِ سبب نزول آں فرمائیم تا مصداقِ حکم آں بیان کنند[1]۔

"اس کے بعد قرآن کی شرح و وضاحت ہماری ذمہ داری ہے۔ جس کے لیے ہم ہر زمانے میں علماء کی ایک جماعت کو قرآن کے مشکل الفاظ اور سبب نزول کے بیان کی توفیق دیں گے کہ وہ حکم قرآن کا مصداق و مطلب بیان کریں۔"

بہت سے علماء اور مفسرین نے درج ذیل آیت کو بھی مذکورہ خیال کی تائید میں پیش کیا ہے:

---

[1] ازالۃ الخفاء، ج ۱، ص ۵۰، ۵۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للنّاس ما نزّل الیھم ولعلّھم یتفکرون (سورۂ نحل:۴۴)

''اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول دے لوگوں کے سامنے وہ چیز جو اتری ان کے واسطے۔'' (ترجمۂ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

اس آیت کی بنیاد پر علماء کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ نبوت میں یہ بات شامل تھی کہ وہ قرآن کے معنی ومفہوم کی وضاحت فرمائیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام بحسن وخوبی انجام دیا اور آپ کی یہ توضیحات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے شیخ الہندؒ کے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر مذکورہ بالا آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یادداشت سے مراد قرآن ہے...... آپ کا کام یہ ہے کہ تمام دنیا کے لوگوں کے لیے اس کتاب کے مضامین خوب کھول کر بیان فرمائیں اور اس کی مشکلات کی شرح اور مجملات کی تفصیل کردیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مطلب وہی معتبر ہے جو احادیث رسول کے موافق ہو۔''

یہ ٹھیک وہی مغالطہ ہے جس کا ذکر سورۂ قیامہ کی آیت ۱۹ کی تشریح کے ذیل میں آچکا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس تشریح کے مطابق قرآن کے معنی ومراد کو متعین کرنے کا کام علماء کے سپرد کیا گیا ہے اور سورۂ نحل کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں تبیین کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ اس طرح تشریحِ قرآن کے دو ماخذ قرار پائے، ایک علماءِ کرام اور دوسرے احادیثِ رسولؐ، جیسا کہ اوپر مولانا شبیر احمد عثمانی کی تحریر سے بالکل واضح ہے۔ اور یہ خیال محلِ نظر ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اگر سورۂ نحل کی زیر بحث آیت کا وہ مفہوم ہے جو اوپر بیان ہوا، تو پھر ماننا ہوگا کہ قرآن ایک غیر واضح کلام ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اللہ کے کلام کو غیر واضح سمجھنا سوئے ادب اور اس کی توہین کے مترادف ہے۔ اس کتاب کو غیر واضح کون کہہ سکتا ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے (سورۂ نحل: ۱۰۳) اور جس میں معنی و بیان کے اعتبار سے کوئی کجی نہیں ہے (سورۂ زمر: ۲۸)۔

سورۂ نحل کی مذکورہ آیت کا جو مفہوم علماء و مفسرین نے بیان کیا ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اور اس غلطی کی وجہ لفظ 'تبیین' کی غلط تشریح ہے۔ تبیین کے ایک معنی کسی بات کو بے کم و کاست بیان کرنے کے ہیں اور یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہر رسول کے فریضۂ رسالت میں یہ بات داخل تھی کہ وہ خدا کے پیغام کو اس کے بندوں تک جوں کا توں پہنچا دے، اس میں کوئی کمی نہ ہو، جیسا کہ ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

یا ایّھا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلّغت رسالته (سورۂ مائدہ: ۶۷)

"اے رسول، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اسے (اس کے بندوں تک) پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کا پیغام (ٹھیک طور پر) نہیں پہنچایا۔"

معلوم ہوا کہ اگر پیغام حق پورے کا پورا خدا کے بندوں تک نہیں پہنچایا گیا تو اس پر تبیین کا اطلاق نہ ہوگا۔ علماء یہود تورات کی بہت سی باتوں کو چھپاتے تھے۔ اس کتمان کو عدمِ تبیین کہا گیا ہے۔ فرمایا:

انّ الّذین یکتمون ما انزلنا من البیّنات والھدیٰ من

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بعد ما بیّنّٰہ للناس فی الکتٰب ط اولٰٓئک یلعنھم اللّٰہ
ویلعنھم اللّٰعنون o الا الذین تابوا واصلحوا وبیّنوا
فاولٰٓئک اتوب علیھم ج وانا التواب الرحیم o

(سورۂ بقرہ: ۱۵۹-۱۶۰)

''جو لوگ ہمارے نازل کردہ واضح احکام وہدایات کو چھپاتے ہیں درآں حالیکہ ہم نے انھیں کتاب (تورات) میں صراحت کے ساتھ بیان کر دیا تھا، ان پر خدا کی لعنت ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ البتہ جو لوگ توبہ واصلاح کر لیں اور (جن باتوں کو پہلے چھپاتے تھے ان کو) جوں کا توں بیان کر دیں تو ان کی توبہ میں ضرور قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہوں۔''

مذکورہ آیت میں 'وبیّنوا' کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ تورات کی باتوں کو من وعن بیان کریں اور ان میں سے کوئی بات چھپائیں نہیں۔

ان مثالوں سے واضح ہو گیا کہ سورۂ نحل اور دوسری سورتوں میں بھی جہاں تبیین کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے وہاں اس کے معنی شرح و وضاحت کے نہیں کہ خدا کا کلام بالکل واضح ہے، بلکہ وحی کو جوں کا توں یعنی کسی کمی وبیشی کے بغیر بیان کرنے کے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص تبیین کی اس معنوی وضاحت کو تسلیم نہ کرے اور اس پر مصر ہو کہ اس کا وہی مفہوم صحیح ہے جو بہت سے علماء اور مفسرین نے بیان کیا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کے مفہوم ومدعا کو خود واضح فرما دیا ہے۔ چلیے، تھوڑی دیر کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تبیین وتشریح فرمائی ہے جیسا کہ علماء کہتے ہیں۔ اس صورت میں لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا رسول اللہ نے قرآن کی تمام یا معتدبہ آیات کی تفسیر کر دی ہے اور اس کو محفوظ بھی کرا دیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع قرآن کی تفسیر بیان کر دی ہوتی اور اس کو محفوظ بھی کرا دیا ہوتا تو پھر وہی سب کے لیے مرجع اور حجت ہوتی اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف دیکھنے کی حاجت ہی نہ ہوتی۔

لیکن یہ کام آپ نے نہیں کیا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت تفسیری اختلافات ہیں۔ یہ اختلافات ان علماء کی تفسیروں میں بھی پائے جاتے ہیں جو تفسیر بالحدیث کے قائل ہیں۔ اگر بقول علماء رسول اللہ نے پورے قرآن کی تفسیر کر دی ہے اور وہ محفوظ بھی ہے تو پھر قرآن کی تفسیر میں اختلاف کیوں ہوا اور مفسرین نے موضوع روایات کیوں بیان کیں؟

حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پورے قرآن کی تبیین وتفسیر کا انتساب تو بڑی چیز ہے، آپ سے چند سورتوں کی تفسیر بھی ثابت نہیں ہے۔ حدیث کی معروف کتابوں میں جو ابواب التفسیر ہیں ان میں چند ہی مرفوع روایتیں ہیں، جن میں بعض آیات کی تفسیر کی نسبت رسول اللہ کی طرف کی گئی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف چند آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے[1]۔ سوال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے قرآن کی تفسیر کیوں نہیں کی کہ اُمت میں اختلافِ فکر وعمل واقع نہ ہوتا؟

اگر تھوڑا سا غور وفکر سے کام لیں تو وجہ معلوم ہو جائے گی۔ پہلی بات تو یہ ذہن نشین کر لیں کہ قرآن اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے بالکل واضح اور قطعی الدلالت ہے۔

---

[1] تفسیر طبری، ج۱، ص۲۱، مزید دیکھیں، تفسیر القرطبی، ج۱، ص۳۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری بات یہ کہ جن آیات میں ایجازِ بیان یا کسی اور وجہ سے اجمال یا ابہام ہے اس کی وضاحت کا کام کسی اور کے سپرد نہیں کیا گیا ہے جیسا کہ بہت سے علماء کا خیال ہے اور اس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، بلکہ خود اللہ نے یہ وضاحت کردی ہے۔ اور یہ اس کا بڑا کرم اور احسانِ عظیم ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

الرٰ کتٰب احکمت اٰیٰتہ ثم فصّلت من لدن حکیم خبیر (سورۂ ہود:۱)

''الٓـرا، یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں (پہلے) محکم کی گئی ہیں، پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر قرآن کی کوئی آیت ایک جگہ مجمل ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کردی گئی ہے تاکہ مفہوم واضح ہو جائے۔ مختلف سورتوں میں احکام کے ذکر کے بعد یہ جملہ ضرور آتا ہے: کذٰلک یُبیّن اللّٰہُ لکم اٰیٰتہ (سورۂ بقرہ:۲۴۲) ''اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کو کھول کر بیان کرتا ہے۔'' دوسری جگہ ہے: یبیّن اللّٰہُ لکم ان تضلوا واللّٰہُ بکل شیئٍ علیم (سورۂ نسآء:۱۷۶) ''اللہ تمہارے لیے (اپنے احکام کو) صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ مبادا تم گم راہ ہو جاؤ۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

اس تبیین کا تعلق جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، آیاتِ احکام سے ہے۔ عام آیات کی تبیین کے لیے قرآن نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کا نام 'تصریفِ آیات' ہے۔ اس کا مطلب ہے ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ واسالیب میں بار بار بیان کرنا تاکہ اس کا مفہوم بالکل واضح ہو جائے، کوئی اشکال باقی نہ رہے اور مخاطب اس کو اچھی طرح سمجھ لے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اُنظر کیف نصرّف الاٰیٰت لعلھم یفقھون0

(سورۂ انعام: ٦٥)

"دیکھو، ہم کس طرح اپنی آیتیں مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ لیں۔"

ایک غلط استدلال

قرآن میں بہت سے احکام کی تفصیلات نہیں ہیں۔ اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ قرآن کی بہت سی آیات بالخصوص آیاتِ احکام غیر واضح ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ مثال میں نماز اور زکوٰۃ کو پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں ان کی تفصیل نہیں کی گئی ہے۔

لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ تمام کلّی احکام کی نظری تبیین خود قرآن نے کردی ہے، البتہ ان کی عملی تبیین نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلی احکام کے عملی جزئیات (Practical Derivatives) مقرر نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عملی جزئیات کا تعلق زمانے کے احوال وظروف سے ہے اور وہ برابر بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی ایک متعین صورت ہر دور کے لیے کافی نہیں ہوسکتی ہے۔ چنانچہ یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کیا گیا اور آپ نے بصیرت نبوی سے کام لے کر اس دور کے حالات اور عربوں کے عرف وعادات کا لحاظ کرتے ہوئے قرآن کے کلی احکام کے عملی جزئیات متعیّن فرمائے۔ ظاہر ہے کہ اس کو معروف معنی میں تبیین وتشریح نہیں کہا جائے گا۔ یہ تو کلّی احکام سے ان کے عملی جزئیات کی تخریج ہے، دوسرے لفظوں میں ان کی اطلاقی صورتوں (Practical Applications) کا تعیّن ہے۔ آیندہ حالات وظروف کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تبدیلی کے ساتھ ان اطلاقی صورتوں میں تبدیلی ناگزیر ہوگی کیوں کہ کلی احکام کی طرح ان کے عملی جزئیات ناقابلِ تغیر نہیں ہیں اور اس بات کو علماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔

تعبدی احکام کی عدم تفصیل کی وجہ اس سے قدرے مختلف ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن میں وضو کا طریقہ تو بیان کیا گیا لیکن نماز کے دوسرے اجزائے ترکیبی کی تفصیل نہیں کی گئی۔ کیا چند جملوں میں ان کو بیان نہیں کیا جاسکتا تھا؟ اسی طرح زکوۃ کے مصارف بیان کردیے گئے لیکن اس کا نصاب مقرر نہیں کیا گیا۔ آخر کیوں؟ ان سوالات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نماز کی ادائیگی کی شکل وصورت متعین نہ کرکے اہل ایمان کو اس امر کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ خدا کی عبادت میں کسی خاص شکل کو نہیں بلکہ اس کی روح وغایت کو اصل اہمیت حاصل ہے۔ ہر نبی کی نماز کا طریقہ الگ الگ رہا ہے۔ اگر عبادت کی ظاہری شکل کو اہمیت حاصل ہوتی تو پھر سارے انبیاء کا طریقۂ نماز ایک ہی ہوتا۔ قرآن کی درج ذیل آیت میں اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الخ

(سورۂ بقرہ: ۱۷۷)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا الخ۔"

اسی سورہ میں دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

ولکلٍ وجهةٌ هو مولّيها فاستبقوا الخيرات

(بقرہ: ۱۴۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''ہر گروہ کے لیے ایک سمت (یعنی قبلہ) ہے جس کی طرف
وہ (بوقت عبادت) اپنا رخ کرتا ہے۔ اس لیے نیکی میں ایک
دوسرے سے سبقت لے جاؤ۔''

زکوٰۃ کا نصاب اس لیے مقرر نہیں کیا گیا کہ اس کا تعلق معاشی حالات سے ہے اور اس میں تغیّر ناگزیر ہے۔ کوئی ایک نصاب تمام ادوار کے لیے کفایت نہیں کرسکتا ہے۔

اس گفتگو سے واضح ہوگیا کہ آیاتِ احکام مجمل کیوں ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی جو تفصیل فرمائی ہے ان کی نوعیت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن اس معنی میں تفسیر کا محتاج نہیں ہے کہ وہ غیر واضح ہے اور جب تک کوئی عالم ومفسر اس کو واضح نہ کرے وہ ناقابلِ فہم ہے۔ اللہ کی کتاب کے بارے میں اس طرح کا گمان رکھنا قلتِ علم وفہم کی دلیل ہے۔ وہ بالکل واضح اور قابلِ فہم ہے۔ فرمایا ہے:

کتاب فصّلت ایٰته قرانا عربیاً لقوم یعلمون○

(سورۂ حٰم سجدہ۔۳)

''یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کی آیات کو کھول دیا گیا
ہے (یعنی باعتبار معنی ومفہوم بالکل واضح ہیں)، عربی قرآن کی
شکل میں (کسی اور زبان میں نہیں)، ان لوگوں کے لیے جو
جاننا (اور سمجھنا) چاہیں''۔

قرآن میں جس خوبی کے ساتھ اس کے اجمالات وابہامات کو مختلف اسالیب و الفاظ میں مکرّر کھولا گیا ہے وہ حددرجہ حیرت انگیز ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ یہ بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس غیر معمولی ربانی اہتمام کے باوجود قرآن کے معنی و مفہوم کی تشریح میں علماء اور مفسرین کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ اور ان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اکثر اختلافات کی وجہ نظم قرآن سے غفلت و بے توجہی ہے۔ اس لیے تفسیرِ قرآن میں اختلاف سے محفوظ رہنے کی ایک ہی صورت ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے کہ وہ خود اپنا شارح ہے۔ اور یہی احسن طریقۂ تفسیر ہے۔ آگے اس اجمال کی تفصیل کی گئی ہے۔

تفسیرِ قرآن بالقرآن

علماء کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقۂ تفسیر قرآن بالقرآن ہے یعنی قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، اور اس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے:

أن اصحّ الطریق فی ذلک ان یفسر القرآن بالقرآن، فما اجمل فی مکانه فانه قد فُسّر فی موضع اخر، وما اختصر فی مکانه فقد بسط فی موضع اخر۔[1]

"تفسیر کا سب سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے، اس لیے کہ جو بات ایک جگہ مجمل ہے وہ دوسری جگہ واضح کر دی گئی ہے۔ اسی طرح جو چیز ایک جگہ اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہے، دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے۔"

حافظ ابن کثیرؒ نے ٹھیک یہی بات اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھی ہے:

فان قال قائل، فما احسن طرق التفسیر؟ (فالجواب) أن اصحّ

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الطریق فی ذلک ان یفسر القرآن بالقرآن، فما اجمل فی مکانہ فانّہ بسط فی موضع آخر[1]۔

''اگر کوئی پوچھے کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے۔ اس لیے کہ ایک جگہ جو بات مجمل ہے وہ دوسری جگہ کھول دی گئی ہے۔''

یہ طریقۂ تفسیر اس لیے احسن اور محمود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی: الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم فاولٰئک لھم الامن وھم مھتدون (انعام:۸۲) ''جولوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انہی کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یاب ہیں،'' تو صحابۂ کرامؓ پریشان ہوگئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: یارسول اللہ، اینا لم یظلم نفسہ الخ ''یا رسول اللہ، ہم میں سے کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا ہے، یعنی وہ کسی گناہ کا مرتکب نہ ہوا ہو۔ اس آیت کے مطابق ہم میں سے کوئی نہ عذاب الٰہی سے مامون ہے اور نہ ہی ہدایت سے بہرہ ور ہے''۔ آپؐ نے فرمایا: لیس ذلک، انما ھو الشرک، الم تسمعوا قول لقمان لابنہ: یا بنی لا تشرک باللّٰہ ؕ انّ الشرک لظلم عظیم[2] (سورۂ لقمان:۱۳) ''یہ مطلب نہیں، ظلم سے مراد شرک ہے۔ کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو لقمان نے اپنے بیٹے سے کہی تھی کہ اے میرے بیٹے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔''

---

[1] تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳

[2] رواہ البخاری عن عبداللہ بن مسعودؓ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تشریح سے قطعیت کے ساتھ معلوم ہوا کہ قرآن کا وہی مفہوم معتبر ہے جس کی تائید اس کے نظائر سے ہوتی ہو۔ قرآن کے کسی اجمال کی تفصیل کے لیے کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن امت نے بہت جلد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقۂ تعلیم کو بھلا دیا اور تفہیم قرآن کے دوسرے طریقے اختیار کر لیے۔

ایک بڑا مغالطہ

علماء یہ تو تسلیم کرتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے، لیکن یہ حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو پھر سنّت سے کی جائے اور سنّت سے بھی نہ ہو سکے تو صحابہ اور تابعین کے اقوال سے مدد لی جائے۔ اس کا ذکر تفسیرِ ماثور کے بیان میں ہو چکا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فان اعیاک ذلک فعلیک بالسنّة، فانها شارحة للقرآن وموضحه له، ...... وحینئذ اذا لم تجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة رجعنا فی ذلک الی اقوال الصحابة فانهم ادریٰ بذلک...... اذا لم تجد التفسیر فی القرآن ولا فی السنة ولا وجدته عن الصحابة فقد رجع کثیر من الائمة فی ذلک الی اقوال التابعین کمجاهد بن جریر فانه کان آیة فی التفسیر الخ [1]

"اگر قرآن سے تفسیر نہ کر سکو تو سنت سے کرو۔ اس لیے کہ وہ قرآن کی شارح اور مفسر ہے ...... اور جب تم قرآن اور سنت دونوں سے تفسیر کرنے

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۳؛ تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۴،۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے قاصر ہو تو ایسی حالت میں ہم اقوالِ صحابہ کی طرف رجوع ہوتے ہیں
کیوں کہ وہ سب سے زیادہ قرآن کو جانتے تھے...... اور جب تم قرآن
وسنت اور اقوالِ صحابہ سے بھی تفسیر نہ کر سکو تو اس صورت میں بہت سے ائمہ
نے اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کیا ہے، جیسے مجاہد بن جریر جو تفسیر میں
نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔"

راقم کو اس طریقۂ تفسیر سے اتفاق نہیں ہے اور اس پر گفتگو ہو چکی ہے۔ یہ ایک بڑا مغالطہ ہے۔ ایک طرف یہ کہنا کہ تفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ تفسیرِ قرآن بالقرآن ہے اور دوسری طرف یہ بھی فرمانا کہ اگر قرآن سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنّت وغیرہ سے کی جائے، دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ تفسیرِ قرآن بالقرآن کا طریقہ عمدہ تو ہے لیکن ناکافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی دروازے سے قرآن کی تفسیر میں غیر محمود چیزوں کو داخل ہونے کا موقع ملا ہے، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

مذکورہ طریقۂ تفسیر کے حق میں امام صاحب نے جو دلائل دیے ہیں وہ محلِّ نظر ہیں۔ ان کی پہلی دلیل امام شافعیؒ کا یہ قول ہے:

قد قال الامام ابو عبد الله محمد بن ادريس الشافعي: كل ما
حكم به رسول الله فهو مما فهمه من القرآن [1]

"امام شافعی کا قول ہے کہ رسول اللہ نے جو حکم بھی دیا ہے وہ قرآن ہی
سے ماخوذ ہے۔"

امام شافعیؒ کا یہ قول نہایت عمدہ اور مبنی برحق ہے۔ بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بھی دیا ہے وہ نصِ قرآن کے مطابق ہے، اپنی عقل اور رائے سے کوئی بات

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہی ہے اور اس پر قرآن کی یہ آیت شاہد ہے: وما ینطق عن الھویٰ الا وحیٌ یوحیٰ (سورہ نجم: ۳،۴) ''وہ اپنے جی سے کچھ نہیں بولتا، وہی بولتا ہے جو اس پر وحی کی جاتی ہے۔''

امام شافعیؒ کا مذکورہ قول واضح طور پر قرآن کے کلی احکام سے جزئی احکام کے استخراج کے اصول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب نے 'حکم' کا فعل استعمال کیا ہے، یہ نہیں کہا کہ ''کل ما فسّرہ فھو من القرآن''۔

امام ابن تیمیہؒ نے دوسری دلیل قرآن سے دی ہے اور اس سلسلے میں سورۂ نسآء اور سورۂ نحل کی آیات نقل کی ہیں[1]۔ سورۂ نسآء کی آیت ہے:

> انّا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ (آیت ۱۰۵)
>
> ''ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب بھیجی ہے تاکہ تم (اس کے مطابق) اس بصیرت کی روشنی میں جو اللہ نے تمھیں عطا کی ہے، لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔''

اس آیت سے بالکل واضح ہے کہ اس کا تعلق تفسیر قرآن سے نہیں بلکہ فصلِ مقدمات سے ہے۔ آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ جو کتاب انھیں دی گئی ہے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کریں اور اس کام میں اس نبوی بصیرت سے مدد لیں جو اللہ نے انھیں بخشی ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ہے:

---

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبیّن لھم الّذی

اختلفوا فیہ الخ (آیت ٦٤)

''اور ہم نے اتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے تو ان کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں۔''

(ترجمہ شیخ الہند)

اس آیت کا بھی تفسیر قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ شیخ الہندؒ نے 'لتبیّن' کا ترجمہ ''کھول کر سنا دے'' کیا ہے نہ کہ ''واضح کر دے''۔ اور یہ ترجمہ صحیح ہے۔ اس آیت میں نزولِ قرآن کی ایک بڑی غرض یہ بیان کی گئی ہے کہ جن مذہبی امور میں لوگوں کے درمیان اختلاف ہے اور ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ حق کیا ہے، رسول اللہ قرآن کے ذریعے سے ان اختلافی امور کی اصل حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان کر دیں تا کہ وہ حق کو خوب اچھی طرح پہچان لیں۔

امام صاحب نے تیسری دلیل کے طور پر 'حدیث معاذ' پیش کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنایا تو ان سے پوچھا:

بما تحکم؟ قال: بکتاب اللہ، فان لم تجد؟ قال: بسنة رسول اللہ، قال: فان لم تجد؟ قال: اجتھد برائی، فضرب رسول اللہ فی صدرہ وقال: الحمد للہ الّذی وفق رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ۔[1]

''کس چیز سے فیصلہ کرو گے؟ کہا، اللہ کی کتاب سے، فرمایا: اگر اس میں نہ پاؤ؟ کہا، رسول اللہ کی سنّت سے، فرمایا: اگر اس میں بھی نہ پاؤ؟ کہا: اپنی

[1] مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۵ (اس روایت کو ترمذی، ابوداؤد اور دارمی نے اپنی سنن میں حارث بن عمرو سے روایت کیا ہے)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رائے سے حل نکالوں گا۔ (یہ سن کر) رسول اللہ نے ان کے سینے کو تھپکا اور فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے قاصد کو اس بات کے کہنے کی توفیق بخشی جس سے وہ راضی ہے۔"

اس روایت کا تعلق تفسیر قرآن کے بجائے قضا سے ہے کہ قاضی معاملات کے فیصلے کے لیے سب سے پہلے اللہ کی کتاب کو دیکھے، پھر سنت کو اور ان دونوں سے رہ نمائی نہ ملنے کی صورت میں رائے (یعنی قیاس) سے فیصلہ کرے۔ دیکھیں، حضرت معاذؓ نے قرآن و سنت کے بعد 'رائے' کا ذکر کیا ہے یعنی قیاس۔ اگر اس کا تعلق قرآن کی تفسیر سے ہوتا تو قرآن و سنت کے بعد صحابہ اور تابعین کے اقوال کا ذکر ہوتا، جیسا کہ امام ابن تیمیہؒ کے طریقۂ تفسیر کے ذیل میں بیان ہو چکا ہے۔

جہاں تک مذکورہ روایت کی صحت کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں راقم کی تحقیق یہ ہے کہ اس کا آخری حصہ (اجتھد برای) الحاقی ہے اور یہ اضافہ اس لیے کیا گیا ہے تا کہ فقہ کے اصولِ قیاس کو استناد مل جائے۔ اس کے الحاقی ہونے کی ایک بڑی دلیل حدیث ذیل ہے، جس میں ''رائے'' کی نفی کی گئی ہے:

عن علی قال، قلت یارسول اللّٰہ ان عرض لی امرلم ینزل قضاء فی امرہ ولا سنۃ کیف تامرنی، قال ،تجعلونہ شوری بین اھل الفقہ والعابدین من المومنین ولاتقض فیہ برائک خاصۃ[1]

حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ آئے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو نہ سنّت میں تو اس سلسلے میں آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، اس کو اہل بصیرت

---

[1] الطبرانی فی الاوسط، مزید دیکھیں، سنن دارمی، باب التورع عن الجواب فیما لیس فی کتاب ولاسنۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور صالح اہل ایمان کے مشورے سے حل کرو اور اس میں محض اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو"۔

اس کے علاوہ بعض محدثین نے حدیثِ معاذ کی اسناد میں کلام کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے 'تاریخ الاوسط' میں لکھا ہے: ولا یعرف الحارث الا بھذا، ولا یصح[1] "حارث ایک غیر معروف راوی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری حدیث اس سے مروی نہیں ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔" امام ترمذیؒ نے لکھا ہے: ھذا حدیث لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ ولیس اسنادہ عندی متصل[2] "ہم اس حدیث کو صرف اسی سند سے جانتے ہیں (کسی اور واسطے سے یہ مروی نہیں ہے)، ہمارے نزدیک اس کی اسناد متصل نہیں ہیں۔"

مزید برآں، اس خط کو ملاحظ فرمالیں جو حضرت عمر فاروقؓ نے قاضی شریح کو قضا سے متعلق ان کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا تھا:

ان اقض بما في كتاب الله، فان لم يكن في كتاب الله فبسنة رسول الله، فان لم يكن في كتاب الله ولا في سنة رسول الله فاقض بما قضى به الصالحون، فان لم يكن في كتاب الله ولا في سنة رسول الله ولم يقض به الصالحون فان شئت فتقدم وان شئت فتاخر ولا ارى التاخر الا خير لك، والسلام عليكم[3]

"تم کتاب اللہ کے مطابق (لوگوں کے معاملات کا) فیصلہ کرو۔ اگر وہ معاملہ کتاب اللہ میں مذکور نہ ہو تو رسول اللہ کی سنت کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ اور سنت رسول دونوں میں موجود نہ ہو تو ان فیصلوں

---

1. مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۵، مزید دیکھیں، الاحکام فی اصول الاحکام، ابن حزم، ص ۷۰۳

2. مقدمہ فی اصول التفسیر، ص ۹۵ 3. دیکھیں سنن نسائی، کتاب آداب القضاۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے مدد لو جو (امت کے) صالح لوگوں نے کیے ہیں۔ لیکن اگر کتاب اللہ، سنت رسول اور نظائرِ صلحاء میں بھی اس مسئلے کے بارے میں کچھ مذکور نہ ہو تو اگر چاہو تو آگے بڑھو (یعنی اپنی رائے سے فیصلہ کرو) اور چاہو تو معاملے کو مؤخر رکھو (یعنی اپنی رائے سے فیصلہ نہ کرو)، لیکن میرے نزدیک تاخیر میں تمہارے لیے بہتری ہے۔ والسلام علیکم۔"

دیکھیں، اس مذکورہ بالا روایت اور حدیثِ معاذ بن جبلؓ میں صریحاً تضاد ہے۔ حدیثِ معاذؓ میں کتاب اللہ اور سنّتِ رسول میں مسئلے کا حل نہ ملنے کی صورت میں اجتہاد کرنے یعنی رائے سے فیصلہ کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی ہے، لیکن حضرت عمرؓ نے قاضی شریح کو لکھا ہے کہ قرآن وسنّت میں مسئلہ کا حل نہ ملنے کی صورت میں صلحاء کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور جب وہاں بھی ناکامی ہو تو پھر قیاس سے کام لیا جائے لیکن بہتر یہ ہے کہ فیصلہ کرنے میں تاخیر کی جائے۔

یہی طریقہ خلیفۂ اوّل کا بھی تھا۔ چنانچہ جب انھیں کسی مسئلہ میں قرآن وسنّت سے رہ نمائی نہیں ملتی تھی تو وہ ذی علم اصحابِ رسول کو جمع کر کے اس معاملے میں مشورہ کرتے تھے اور پھر فیصلہ کیا جاتا تھا۔ ان سب امور کو پیش نظر رکھ کر غور کریں تو ماننا ہوگا کہ حدیثِ معاذ کا آخری حصہ الحاقی ہے۔ اگر کوئی اس کو الحاقی نہ مانے تو بھی اتنا واضح ہے کہ اس روایت کا تفسیرِ قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ قضا سے متعلق ہے جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے۔

بہر حال، اس گفتگو سے کسی اشتباہ کے بغیر معلوم ہوگیا کہ قرآن کی تفہیم وتفسیر کا سب سے عمدہ طریقہ تفسیرِ قرآن بالقرآن ہے اور یہ خود مکتفی ہے۔ لیکن اس کا یہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مطلب نہیں کہ تفسیر کے دوسرے ماخذوں سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کے آخری باب میں کی گئی ہے۔

تفسیر بالقرآن کے اصول

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تفسیر کا سب سے احسن طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے، یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس طریقۂ تفسیر کے اصول وضوابط کیا ہیں، کیونکہ کسی اصول و قاعدہ کے بغیر تفسیرِ قرآن بالقرآن میں بھی متعدد خطرات ہیں، جیسا کہ ان لوگوں کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے جو خود کو اہلِ قرآن کہتے ہیں۔ پاکستان کے غلام پرویز مرحوم کی تحریریں اس خطرنا کی کی ایک واضح مثال ہیں۔ اس لیے ضروری خیال کیا گیا کہ اس طریقۂ تفسیر کے لیے کچھ ایسے مضبوط اصول مقرر کیے جائیں جو اس طرح کے خطرات کا سدِّ باب کریں۔ چنانچہ میں نے پہلے خوب غور وفکر کیا اور پھر بعض محقق علماء کی تحریروں سے استفادہ کر کے اس کے چند بنیادی اصول مقرر کیے ہیں۔ ان اصولوں کی تفصیل آگے ملاحظہ فرمائیں۔

اخلاصِ نیت

تفسیر قرآن میں سب سے مقدم چیز اخلاصِ نیت ہے، یعنی یہ کام کسی دنیوی فائدہ یا شہرت و ناموری کے جذبہ سے نہ لیا جائے۔ اس کی غرض محض علمی اور لسانی تحقیق بھی نہ ہو۔ اس کی واحد غرض یہ ہو کہ اللہ کی کتاب کا واقعی مفہوم اور اس کا حقیقی منشاء معلوم کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اللہ کے ہر حکم و ہدایت پر حتی الوسع عمل کا جذبہ دل میں ہر آن بیدار ہو۔ مجرد علم بے فائدہ چیز ہے۔ اس کا فائدہ عمل ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر میں جماعتی اور مسلکی تعصب سے اجتناب لازمی ہے۔ یہ بات اخلاصِ نیّت کے منافی ہے کہ قرآن کی آیات میں وہ بات تلاش کی جائے جو اس میں نہ ہو۔ فہمِ قرآن میں یہ بہت بڑا حجاب ہے۔ اس راہ کا یہ ایسا سنگِ گراں ہے جس کو ہٹائے بغیر قرآن کے حقائق و معارف تک رسائی تو درکنار، ہدایت کی نعمت بھی نہیں مل سکتی ہے۔ قرآن کی تفسیر میں جو بہت سے اختلافات ہوئے ہیں ان کا ایک بڑا سبب مسلکی تعصب ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں:

> "جب سے اُمتِ محمدیہ نے مذہب میں فرقہ داریت اختیار کی ہے، ہر فرقہ نے ایک خاص مذہب اختیار کر لیا ہے جو فروعات میں دوسرے فرقہ سے بالکل الگ ہے۔ اس نے یہ بھی مان لیا ہے کہ اگر اس فرقہ کے مذہب کی مخالفت میں کچھ کہا جائے گا تو وہ باطل محض ہوگا۔ چنانچہ تمام فرقوں نے قرآن کی تاویل بھی اپنے اپنے مذہب کے مطابق کر دی۔ وہ قرآن کی طرف دل کی سادہ لوح کے ساتھ نہیں آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفسرین کی تفسیریں ایک دوسرے کی مخالف ہو گئیں۔ ایک مفسر کے لیے واجب ہے کہ تفسیر کرنے سے پہلے وہ کوئی مخصوص مذہب نہ رکھتا ہو۔ ایک مقلّد کے لیے قرآن میں غور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔"[1]

اس راہ میں طبیعت کا انکسار و تواضع بھی ایک بڑا علمی زادِ سفر ہے۔ غرورِ علم سمِ قاتل ہے۔ کسی مغرور کو خواہ وہ اپنے عہد کا افلاطون اور ابن سینا ہی کیوں نہ ہو، اس بزمِ عرفان میں باریابی کی اجازت نہیں ہے۔ اگر وہ زبردستی اس بزم میں داخل ہوگا تو خسران کے سوا اور کوئی چیز اس کو حاصل نہ ہوگی، کیونکہ اللہ غرور کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتا ہے (سورۂ حدید ۲۳)۔

---

[1] تفسیر قرآن کے اصول، ص ۲۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیرِ قرآن میں محض اپنی عقل اور علمی جستجو پر تکیہ کرنا بھی سخت مضر ہے۔ توفیقِ ایزدی کی طلب سے دل کسی حال میں خالی نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو چیز اس راہ میں چراغ کی حیثیت رکھتی ہے وہ بکثرت رجوع الی اللہ ہے۔ مطالعۂ قرآن کے دوران میں بار بار خشوع و خضوع اور للّٰہیت کے ساتھ دعا کی جائے اور قرآن کی یہ آیت وردِ زبان ہو: رَبِّ زِدْنِی عِلْماً (سورۂ طٰہٰ:۱۱۴) ''اے رب، میرے علم میں اضافہ فرما۔'' ان شاءاللہ یہ دعا رائگاں نہیں جائے گی۔ اس کا وعدہ ہے:

والّذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا ؕ وانّ اللہ لَمَعَ المحسنین (سورۂ عنکبوت:۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جاں فشانی کریں گے، ہم انہیں اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔ بے شک اللہ نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

تدبّر

تفسیرِ قرآن کا دوسرا اصول آیات میں تدبّر کرنا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبّروا اٰیٰتہٖ ولیتذکر اولوا الالباب (سورۂ صٓ۔۲۹)

''ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب نازل کی ہے جو بڑی مبارک ہے، تاکہ وہ اس کی آیتوں میں غور و تدبر کریں اور جو اہلِ دانش ہیں وہ اس سے یاددہانی حاصل کریں۔''

اس آیت میں قرآن میں تدبّر کی دعوت ان لوگوں کو دی گئی ہے جو اہلِ زبان تھے، وہ نہ صرف اپنی زبان کے الفاظ و معانی اور اسالیبِ بیان سے خوب اچھی طرح

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

واقف تھے بلکہ شانِ نزول بھی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ پھر اس دعوتِ تدبّر کا کیا مطلب؟ ضروری ہے کہ اس کو ٹھیک طور پر سمجھا جائے۔

انسانی علوم میں سے تین علم ایسے ہیں جن میں غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے، ایک فلسفہ، دوسرے سائنس اور تیسرے اعلیٰ درجہ کی شاعری۔ فلسفہ میں غور و فکر کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس میں حیات و کائنات کے مشکل مسائل زیرِ بحث آتے ہیں یعنی مابعد الطبعیاتی مسائل۔ فلسفہ کی بنیاد ہی عقلی استدلال پر قائم ہے۔

سائنس کا موضوع علمِ فطرت ہے، یعنی اس میں پوشیدہ قوتوں اور اس کے قوانینِ عمل کو سمجھنا۔ یہ بھی ایک مشکل کام ہے۔ اس راہ کا پہلا مرحلہ مشاہدہ ہے، جس کا تعلق حواس اور عقل دونوں سے ہے۔ اس مرحلہ میں ایک سائنسداں سب سے پہلے فطرت سے متعلق کسی مسئلہ پر خوب غور و فکر کرتا ہے اور پھر ایک مفروضہ (Hypothesis) قائم کرتا ہے۔ اس کے بعد اس مفروضہ کی بنیاد پر تجربات کا عمل شروع ہوتا ہے۔

شاعری میں اگر حکمت اور گہرے مشاہدہ و تجربہ پر مبنی مضامین بیان کیے گئے ہیں تو ان کو غور و فکر ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر شاعری کا سارا معنوی نظام علامات اور استعارات وغیرہ پر قائم ہے۔ اس لیے اس کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام کے سارے اجزائے ترکیبی سے پوری واقفیت حاصل ہو۔ پھر اس میں تخیّل کی بلند پروازی اور نازک خیالی بھی ہوتی ہے اور وہ بغیر غور و فکر کے ہاتھ نہیں آتی۔ میں یہاں غالب کے کلام سے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔ پہلی مثال کا تعلق ایک دقیق مضمون سے اور دوسری کا تعلق نازک خیالی سے ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ شعر غور و فکر کا طالب ہے کیونکہ اس میں تصوف یعنی مسئلہ وجود پر شاعرانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جب تک قاری فلسفۂ وجود کے مختلف مکاتبِ فکر سے واقف نہ ہو وہ اس شعر کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا ہے۔ غالب کا دوسرا شعر ہے ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

شاعر کہتا ہے کہ شہد کی مکھی کو باغ میں ہرگز نہ جانے دو۔ کیوں۔؟ شاعر نے اس کا جواب محذوف کر دیا ہے۔ مگس کو اس لیے باغ میں نہ جانے دیا جائے کہ اگر وہ وہاں پہنچ گئی تو پھر وہ شہد کے چھتے بنائے گی اور ان چھتوں سے موم حاصل ہوگی اور پھر اس موم سے شمع بنائی جائے گی اور اس طرح بالآخر پروانوں کی ہلاکت کا سامان فراہم ہوگا۔ اسی کا نام شاعرانہ نازک خیالی ہے۔

اس وضاحت کی روشنی میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن میں تدبّر کی دعوت کیوں دی گئی ہے۔ قرآن کوئی معمولی کتاب نہیں ہے۔ وہ کلاسیکی عربی ادب کا بلند ترین نمونہ ہے، ایک ایسا بلند و نادر نمونہ جس میں عربی خطابت اور شاعری کے تمام محاسن جمع ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں متنوع اعلیٰ مضامین کی کثرت ہے، جن کا سلسلہ انسانی زندگی سے لے کر کائناتِ مادّی کے اسرار و حقائق اور ماورائے کائنات تک پھیلا ہوا ہے۔ پھر قرآن میں یہ تمام اعلیٰ مضامین ایک ایسے اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں جس میں ایجاز کا رنگ غالب ہے۔ ان سب وجوہ سے قرآن کی آیات کی صحیح تفہیم غور و تدبّر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اب میں اس اجمال کی تفصیل کروں گا تاکہ تدبّر کے تمام اطراف و جوانب واضح ہو جائیں۔

معلوم ہے کہ قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک کو متشابہ اور دوسری کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

محکم کہا گیا ہے (سورہ آل عمران ۔ ۷)۔ ان دونوں کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ متشابہات میں غور و فکر سے منع کیا گیا ہے کیونکہ ان آیات میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ہے اور معنیٔ مراد کا صحیح تعینّ مشکل ہے۔ اس لیے غور و فکر کا محل صرف آیاتِ محکمات ہیں۔

آیاتِ محکمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ ہے جس کی نوعیت تذکیری ہے۔ اس میں زیادہ تر معروف (مکارمِ اخلاق) اور منکر کا بیان ہے اور اہل عرب ان سے اچھی طرح واقف تھے۔ اہل عرب ہی پر کیا موقوف، دنیا کی ہر قوم کو اجمالاً معلوم ہے کہ معروف کیا ہے اور منکر کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ چوری، قتل، زنا، غصبِ مال، جبر و ظلم، بہتان طرازی وغیرہ برے افعال ہیں۔ اس کے برخلاف سچ بولنا، حرمتِ جان کا پاس و لحاظ، عفّت و عصمت کی حفاظت، غربا کی اعانت، مظلوموں کی دست گیری، والدین کی خدمت اور پاسِ عہد وغیرہ نیکی کے کام ہیں۔ اس حصۂ محکمات پر غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف تذکیر یعنی یاد دلانا کافی ہے، انسانی نفس ان دونوں طرح کے افعال سے بخوبی واقف ہے۔ نفس کی ایک بڑی کمزوری نسیان ہے (سورۂ طٰہٰ ۔ ۱۱۵)۔ اس کے تدارک کا ذریعہ تذکیر ہے۔ اسی لیے قرآن میں جگہ جگہ تذکیر کا حکم دیا گیا ہے، مثلاً فرمایا گیا ہے:

فذکر انّما انت مذکر ۝ لست علیھم بمصیطر ۝

(سورۂ غاشیہ ۔ ۲۱، ۲۲)

''پس یاد دلاؤ، بے شک تمہارا کام یاد دلانا ہے، تم ان پر داروغہ مقرر نہیں کیے گئے ہو (کہ وہ نہ مانیں تو ان سے زبردستی منواؤ)''

محکمات کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کے مختلف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

امور و مسائل سے ہے، مثلاً سماجی، سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی مسائل۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جو کلی احکام دیے ہیں ان کی حکمتوں پر غور کر کے ان سے جزئی احکام مستنبط کرنا ہر دور میں ضروری ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزّل الیھم
ولعلھم یتفکرون (سورۂ نحل۔۴۴)

"ہم نے تمہاری طرف ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے تاکہ
جو چیز لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے تم اس کو کھول کر بیان کردو
اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔"

محکمات کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق مادی کائنات کی تخلیق، اس کے قوانینِ جاریہ (Prevailing laws)، اس کی غایتِ تخلیق اور اس میں پھیلی ہوئی متنوع نعمتوں پر غور و فکر سے ہے۔ اس تفکر کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خالقِ کائنات کی معرفت حاصل ہوگی، آخرت کی زندگی پر یقین میں اضافہ ہوگا، محسنِ حقیقی کی شکر گزاری کا دل میں سچا جذبہ بیدار ہوگا، اور فطرت کی پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل ہوگا، جس سے انسانی تمدن کی تہذیب و تعمیر میں مدد ملے گی۔ قرآن کی مختلف آیات میں غور و فکر کے ان پہلوؤں کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

انّ فی خلق السمٰوت والارض واختلاف الّیل والنھار
لاٰیٰت لاولی الالباب ○ الذین یذکرون اللہ قیٰما و
قعودا وّعلیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت
والارض ج ربنا ما خلقت ھذا باطلا ط سبحٰنک فقنا
عذاب النار ○ (سورۂ آل عمران۔۱۹۰۔۱۹۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

''زمین اور آسمانوں کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے جانے میں عقل مندوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمان کی ترکیب میں غور و فکر کرتے ہیں، (اس غور و فکر سے وہ اصل حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب، تو نے اس عالم کو بے مقصد نہیں بنایا ہے، تیری ذات اس عیب سے پاک ہے۔ پس ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا۔''

دوسری جگہ ہے:

اللّٰہ الّذی رفع السمٰوٰت بغیر عمد ترونھا ثم استویٰ علی العرش وسخر الشمس والقمر ط کل یجری لاجل مسمًّی ط یدبر الامر یفصّل الأیٰت لعلکم بلقآء ربکم توقنون ○ وھوالذی مدّالارض وجعل فیھا رواسی وانھرا ط ومن کلّ الثمرات جعل فیھا زوجین اثنین یغشی الّیل النھار ط انّ فی ذلک لأیٰت لقوم یتفکرون ○ وفی الارض قطع متجورٰت و جنّٰت من اعناب وزرع ونخیلٌ صنوان غیر صنوان یُسقیٰ بماء واحد قف و نفضّل بعضھا علیٰ بعض فی الاکل ط انّ فی ذلک لأیٰت لقوم یعقلون○

(سورۂ رعد: ۲۔۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو کسی ستون کے بغیر بلند کر رکھا ہے اور تم اس کو (اپنی آنکھوں سے) دیکھتے ہو۔ پھر وہ اپنے تختِ (اقتدار) پر متمکن ہوگیا، اس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنایا، ان میں سے ہر ایک مقررہ مدت تک کے لیے (اپنی اپنی معیّنہ راہ میں) چل رہا ہے۔ وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ وہ اپنی نشانیوں کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تمھیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین حاصل ہو۔ وہ اللہ ہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا (اور اس کو ہموار کیا)، اس میں پہاڑ نصب کیے اور ندیاں جاری کیں، اور ہر پھل کو جوڑا جوڑا بنایا، دن پر رات کو ڈھانکتا ہے (یعنی دن کے بعد رات لاتا ہے)۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں۔ اور زمین میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے بہت سے خطے ہیں، اور انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن میں کچھ اکہرے (ایک تنہ والے) اور کچھ دوہرے (دو تنہ والے) ہیں، سب کو ایک ہی پانی سیراب کرتا ہے مگر باعتبار مزہ ہم ایک کو دوسرے پر برتری دیتے ہیں۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔"[1]

قرآن میں غور وفکر کا دوسرا اہم پہلو اس کی لفظیات اور اسالیبِ بیان کا فہم ہے۔ اور اس کا تعلق بھی آیاتِ محکمات سے ہے۔ قرآن انتہائی فصیح وبلیغ زبان میں

[1] مزید دیکھیں، سورۂ نحل۔ ۱۱، ۶۹، سورۂ روم۔ ۲۱، سورۂ زمر۔ ۴۲، سورۂ جاثیہ۔ ۱۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نازل ہوا ہے۔اس میں الفاظ کے انتخاب اور پھران کی ترکیب میں بڑی جدّت اور حیرت انگیز ندرت پائی جاتی ہے۔ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت کے معیاری سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔اس فصاحت و بلاغت کے مختلف پہلوؤں کا صحیح فہم غوروفکر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن میں کوئی لفظ بے محل اور مترادف کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے اور غوروفکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ ہر آیت اور اس کا ہر لفظ اپنے ماقبل اور مابعد کے لفظ و آیت سے گہری معنوی مناسبت رکھتا ہے۔تدبّر ہی سے ان کے معنوی مناسبات کو ٹھیک طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔بہت سے مفسرین نے اس معاملے میں سہل انگاری کا ثبوت دیا ہے۔مثلاً قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

افلاینظرون الی الابل کیف خلقت ۝ والی السمآء
کیف رفعت ۝ والی الجبال کیف نصبت ۝ والی
الارض کیف سطحت ۝ (سورۂ غاشیہ۔۱۷۔۲۰)

"کیا وہ غور نہیں کرتے کہ بادل کیسے بنائے گئے، آسمان کو کس طرح بلند کیا گیا، پہاڑوں کو کس طرح (زمین میں) نصب کیا گیا ہے اور زمین کو کس طرح مسطح کیا گیا ہے؟"

تمام ہی مفسرین نے مذکورہ آیت میں 'ابل' کا ترجمہ اونٹ کیا ہے جو اس کا معروف معنی ہے۔کسی مفسر نے ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچا کہ اونٹ کی تخلیق اور رفعِ آسمان کا ذکر ایک ساتھ کیوں کیا گیا ہے؟اس کا ذکر تو زمین کے ساتھ مناسب تھا اور اس کا بیان اگلی آیت میں ہے۔اگر وہ آیت کے دونوں فقروں کی اس معنوی عدمِ مناسبت پر غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ یہاں 'ابل' کا لفظ اونٹ کے بجائے بادل کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معنی میں استعمال ہوا ہے، گو کہ یہ شاذ معنی ہے[1]۔

قرآن کے اسلوب کا ایک نمایاں وصف اس کا ایجاز ہے اور اس کا ذکر مکرّر ہو چکا ہے۔ اس اسلوب بیان کی وجہ سے قرآن کی ہر سورہ میں بکثرت محذوفات ہیں جو سیاقِ کلام پر غور و فکر ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان محذوفات میں الفاظ بھی ہیں، حروف بھی ہیں اور مکمل جملے بھی۔ اس طرح کے محذوفات کا ذکر اسالیب قرآن کے عنوان کے تحت ہو چکا ہے۔

سیاقِ کلام (نظم)

تفسیرِ قرآن کا یہ تیسرا اہم اصول ہے۔ قرآن کی ہر آیت اپنے ماقبل اور مابعد کی آیت سے معنوی ربط و اتصال رکھتی ہے۔ اس طرح ہر سورہ کی تمام آیات ایک سلسلۂ نظم میں پروئی ہیں۔ اس بنا پر راقم یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہے کہ اگر سورہ کے مجموعی نظم اور آیات کے سیاق و سباق کو ملحوظ رکھا جائے اور اس سے کسی صورت میں انحراف نہ ہو تو معنی کے فہم میں ہرگز کوئی دشواری نہ ہوگی۔ ہمارے اکثر مفسرین نے تفسیر کے اس زرّیں اصول کا بہت کم پاس و لحاظ کیا ہے۔ تفسیرِ ماثور اور تفسیرِ غیر ماثور دونوں میں یہ عیب موجود ہے۔ تفسیرِ ماثور کے قائل علماء کی کمزوری یہ تھی کہ ان کو روایات سے غیر معمولی شغف تھا اور اس کی وجہ سے انہوں نے دوسری چیزوں کی طرف بہت کم توجہ دی ہے تفسیرِ غیر ماثور کے قائلین عقل اور لغت پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تفسیر کا کوئی اور اصول ان کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں گروہ کے علماءِ تفسیر نے

---

[1] دیکھیں، لسان العرب، طبع بیروت ۱۹۵۲/ ۱۳۷۷ھ، ج ۱۱، ص ۶، لسان العرب کی وضاحت کے مطابق ابل (بالتثقیل) کے معنی بادل کے ہیں جو بارش کے پانی سے بوجھل ہو، اور بالتخفیف اس کے معنی اونٹ کے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بہت سی آیات کا وہ مفہوم بیان کیا جس کی تائید سیاقِ کلام سے نہیں ہوتی ہے۔

اس معاملے میں اہلِ بدعت کی ستم رانیوں کی کوئی حد نہیں ہے۔ انہوں نے ان آیات کے ساتھ بھی مذاق کیا ہے جن کا تعلق واضح طور پر عقاید سے ہے۔ انہوں نے سیاق و سباق اور دوسرے امور کو نظر انداز کر کے آیات کا وہ مطلب بیان کیا ہے کہ اسلامی عقائد کی بنیاد ہی متزلزل ہو گئی ہے۔

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند تفسیری لغزشوں کی نشاندہی کی جائے جو نظم کلام اور سیاق و سباق کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہیں تاکہ اس اصول کی اہمیت بالکل واضح ہو جائے۔

(۱) سورۂ بقرہ میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے: انّ اللّٰہ لا یستحی ان یضرب مثلاً ما بعوضۃ فما فوقھا ط (آیت ۲۶)۔ اس تمثیل کو سمجھنے میں اکثر علماء نے صرف اس وجہ سے غلطی کی ہے کہ انہوں نے آیت کے سیاق پر غور نہیں کیا۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے:

> ''یہاں تک اس شبہہ کے جواب کا سلسلہ تھا جو کہ کفار نے پیش کیا تھا کہ کلام الٰہی میں ایسی کم قدر چیزوں کا ذکر کیوں آیا؟''

مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی اس آیت کا مفہوم نہیں سمجھ سکے اور صرف اتنا لکھ کر آگے بڑھ گئے ہیں: ''سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وحی کا کلام انسانی بول چال کے مطابق ہوتا ہے اور بیانِ حقائق کے لیے مثالیں ضروری ہیں[۱]۔''

مولانا مودودیؒ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ ہو:

> ''یہاں ایک اعتراض کا ذکر کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ قرآن میں

۱۔ ترجمان القرآن، ج ۲، ص ۲۰ (سورۂ بقرہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

متعدد مقامات پر توضیح مدعا کے لیے مکڑی، مکھی، مچھر وغیرہ کی جو تمثیلیں دی گئیں ہیں ان پر مخالفین کو اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلام الٰہی ہے، جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں[1]۔"

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"فرض کیجیے تمثیل میں مکھی یا مچھر کا ذکر آگیا ہے تو خواہ وہ تمثیل کتنی ہی حقیقت افروز ہو لیکن وہ کہیں گے کہ "یہ کیا فضول تمثیل ہے۔ اگر یہ خدا کا کلام ہے تو کیا خدا کو تمثیل کے لیے مکھی اور مچھر ہی ملتے ہیں[2]۔"

لیکن تمثیل کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے۔ اس تمثیل کا تعلق اس سے ماقبل کی آیت سے ہے جس میں جنت کی نعمتوں (باغات وازواج) کا ذکر ہوا ہے۔ جب یہ آیات نازل ہوئیں تو یہودیوں نے اعتراض کیا کہ بھلا آخرت میں جو ایک عالم روحانی ہوگا، مادّی دنیا کے سامانِ عیش و راحت کے ذکر کا کیا مطلب؟ یہ تو بالکل غلط بات ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے۔ ملحوظ رہے کہ اس سے پہلے قرآن کی تحدّی کا ذکر ہوا ہے۔ وہ اس سے معارضہ کی جرأت تو نہ کر سکے، صرف بات بنانے کے لیے یہ اعتراض کر دیا۔ اسی اعتراض کا اس آیت میں جواب دیا گیا ہے۔

انھیں بتایا گیا کہ اس آیت میں جنت کی جن نعتوں کا ذکر تمثیل کے پیرائے میں ہوا ہے ـــــ اور یہ تمثیل بھی ان نعتوں کی قدر و قیمت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے

---

1. تفہیم القرآن، ج۱، ص۵۹
2. تدبر قرآن، ج۱، ص۱۴۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ــــ وہ اس سے کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ ہیں۔ ان کا تصور بھی انسان کے لیے محال ہے (سورۂ سجدہ۔۱۷)۔ رہی تمثیل تو خواہ وہ مکھی اور مچھر جیسی حقیر چیزوں کی ہی کیوں نہ ہو، مقصود بالذات نہیں، مقصود وہ حقیقت ہے جس کا اظہار تمثیل کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

(۲) سورۂ طٰہٰ کی آیت ہے اور اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے: ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکاً ونحشرہ یوم القیامۃ اعمٰی (آیت ۱۲۴)۔ اس آیت میں ذکر سے کیا مراد ہے، اس کے بارے میں بہت سے اقوال تفسیر کی کتابوں میں ملتے ہیں جو سیاقِ کلام سے مطابقت نہیں رکھتے۔ یہاں ذکر سے مراد ہدایت یعنی قرآن ہے اور ماقبل کی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا ہے: فمن اتبع ھدای فلایضل ولا یشقٰی ''جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ صحیح راہ سے بھٹکے گا اور نہ ہی تکلیف میں پڑے گا۔'' دوسرے مقامات پر بھی قرآن کو ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے، مثلاً فرمایا ہے: انا نحن نزلنا الذکر وانالہ لحفظون (سورۂ حجر۔۹) ''ہم ہی نے ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

(۳) سورۂ بقرہ کی آیت: یسئلونک عن الشھر الحرام الخ (آیت ۲۱۷) کو بہت سے علماء نے قاتلوا المشرکین کافۃ (سورۂ توبہ۔۳۶) سے منسوخ مانا ہے۔ لیکن سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ محترم مہینوں میں جنگ ایک قبیح فعل ہے، لیکن کفر و شرک کا فتنہ اس حرمت سے کہیں زیادہ شنیع ہے۔ اس لیے اس کے استیصال کے لیے محترم مہینوں میں جنگ جائز ہے۔[1]

(۴) والضحیٰ والیل اذا سجیٰ (سورۂ ضحیٰ) کے بارے میں اہلِ بدعت کہتے ہیں اور اس کا مختصر ذکر ہو چکا ہے، کہ اس میں 'ضحیٰ' سے مراد آنحضور کا چہرہ اور

---

[1] دیکھیں، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص ۳۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

'لیل' سے مراد آپ کی زلفیں ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس تاویل کی بنیاد کس نص یا دلیلِ عقلی پر ہے تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں معنوی ربط واتحاد ضروری ہے پہلی آیت میں اگر بالفرض مقسم بہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زلف ورخسار کو مانا جائے تو پھر مقسم علیہ 'وماودعک ربک وماقلی' سے اس کا معنوی رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ ضحیٰ اور لیل کے معروف معنی سے عدول کیا جائے۔

دراصل آیت میں اس قانونِ قدرت کو بطور شہادت پیش کیا گیا ہے کہ دن کے بعد تاریکی آتی ہے اور پھر دن نمودار ہوتا ہے۔یہی معاملہ نزولِ وحی کا ہے۔اگر کچھ دنوں کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع ہوگیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صبحِ وحی دوبارہ طلوع نہیں ہوگی اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نبی اُمّی سے ناراض ہے۔

(۵) یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللّٰہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ الخ (سورۂ مائدہ۔ ۳۵) اس آیت میں 'وسیلہ' سے اہلِ بدعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کا وسیلہ مراد لیتے ہیں اور سیدھے سادے مسلمانوں کو گم راہ کرتے ہیں۔

اہلِ بدعت نے وسیلہ کا مفہوم متعین کرنے میں پہلی غلطی یہ کی کہ اس کو ذریعہ کے معنی میں لیا۔اردو میں تو وسیلہ کا لفظ بلاشبہ ذریعہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن عربی میں اس کے یہ معنی نہیں ہیں۔اس پر گفتگو آگے آرہی ہے۔انھوں نے دوسری غلطی یہ کی کہ آیت کے سیاق وسباق کو نظر انداز کردیا جس سے اس مفہوم کی تردید ہوتی ہے۔

عربی میں وسیلہ کے ایک معنی تقرب کے ہیں۔ توسل الی بکذا، ای تقرب یعنی وہ میرے قریب ہوا۔مفردات راغب[1] اور صحاح جوہری[2] میں بھی اس کے

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، ص ۵۴۵ [2] صحاح جوہری، ج۵، ص ۱۸۴۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہی معنی لکھے ہیں۔ لسان العرب میں ہے[1]: الوسیلة، المنزلة عندالملک والوسیلة، الدرجة، والوسیلة، القربة ''وسیلہ بادشاہ کے یہاں منزلت، درجہ اور قربت کے معنی میں ہے۔'' قاموس[2] اور اقرب الموارد[3] میں بھی وسیلہ کے یہی معنی بیان کیے گئے ہیں۔

وسیلہ کے دوسرے معنی ذریعۂ تقرب کے ہیں۔ لسان العرب میں ہے[4]: وتوسل الیه بوسیلة، ای تقرب الیه بعمل، یعنی عمل کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کیا۔

اور زیر بحث آیت میں وسیلہ کے یہی معنی مراد ہیں، یعنی عمل کے ذریعہ خدا کا تقرب۔ سیاق وسباق سے اس معنی کی تائید ہوتی ہے۔ پہلے فرمایا کہ اے ایمان والو، اللہ کی نافرمانی سے بچو (اتقوا اللہ)، پھر فرمایا کہ اس کے تقرب کا ذریعہ ڈھونڈو (وابتغوا الیه الوسیلة)، اور پھر اس ذریعۂ تقرب کی نشان دہی کر دی کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے (وجاهدوا فی سبیله)۔ گویا خدا کی قربت کے دو ذریعے ہوئے، ایک خدا کی نافرمانی سے پرہیز (واتقوا اللہ) اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔

اکثر مفسرین نے وسیلہ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے یعنی اعمال کے ذریعہ خدا کا قرب حاصل کرنا، کسی مفسر نے ذریعۂ تقرب سے اشخاص مراد نہیں لیے ہیں۔ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

> واطلبوا القربة الیه بعمل بمایرضیه، والوسیلة هی الفعلیة من قول القائل، توسل الی فلان بکذا، ای تقرب الیه منه، قول عنترہ:

---

[1] لسان العرب، ج ۱۱، ص ۷۲۴

[2] قاموس، ج ۴، ص ۶۴

[3] اقرب الموارد، ج ۲، ص ۱۴۵۲

[4] لسان العرب، ج ۱۱، ص ۷۲۴، مزید دیکھیں، تاج العروس، ج ۸، ص ۱۵۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انّ الــرجـــال لهــم اليـک وسيـلة

ان يـا خـذوک تـکـحـلـی وتخضّبی

یعنی بالوسیلة القربة[1]

''اللہ کے پسندیدہ عمل کے ذریعہ اس کا قرب حاصل کرو۔ وسیلۃ ،فعیلۃ کے وزن پر ہے ۔توسل الی فلان بکذا، یعنی اس نے کسی واسطے سے اس کا قرب حاصل کیا۔ عنترہ کہتا ہے : ''بے شک مردوں کو تیرے قرب کی حاجت ہے، جس سے وہ تیری طرف جھکتے ہیں ،تو سرمہ اور مہندی لگا ، یعنی وسیلہ، قرب۔''

امام راغب نے لکھا ہے[2] : ''اللہ نے فرمایا ہے: وابتـغـوا الیـه الوسیلة۔ اللہ کی طرف وسیلہ کی حقیقت یہ ہے کہ علم وعبادت اور مکارمِ شریعت پر عمل کیا جائے اور یہی قربت کے معنی ہیں۔''

اہلِ بدعت نے ٹھیک یہی غلطی ایک دوسری آیت کی تفہیم میں کی ہے جس میں وسیلہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا ہے: اولٰـئـک الـذیـن یـدعـون یبتـغون الـی ربهم الوسلیة ايّهم اقرب ويرجون رحمته ويخافون عذابه (بنی اسرائیل ۔۵۷)''جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کے قرب کے خواہاں ہیں کہ ان میں سے کون سب سے زیادہ اس کے قریب ہوجائے۔ وہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔'' یہ لوگ 'یبتغون الیٰ ربهم الوسلیة' سے اللہ تک پہنچنے کے لیے بزرگانِ دین کا وسیلہ ڈھونڈنا مراد لیتے ہیں۔ سیاقِ کلام سے اس معنی کی تردید ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر طبری، ج ۵ ،ص ۲۲۶

[2] مفردات راغب، ص ۵۴۵ ،مزید دیکھیں، تفسیر کبیر، ج ۱۱ ،ص ۲۲۰ ،تفسیر نسفی ، ج ۱، ص ۲۸۲ ،تفسیر بیضاوی، ج ۱، ص ۲۲۴ ، روح المعانی، ج ۶ ،ص ۱۲۴ ،تفسیر جلالین، ص ۹۳ ،مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۱، ص ۵۱۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہودیوں میں دوسری مذہبی خرابیوں کے ساتھ ایک بڑی خرابی اولیاء پرستی تھی۔ وہ اپنی قوم کے بزرگانِ دین کو جن میں زندہ اور وفات یافتہ دونوں طرح کے لوگ شامل تھے، خدا کے یہاں تقرّب اور مشکل کشائی کا وسیلہ خیال کرتے تھے۔ اس خیال کی تردید کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

قل ادعوا الذین زعمتم من دونه فلا یملکون کشف الضرّ عنکم ولا تحویلا (بنی اسرائیل۔۵۶)

''ان لوگوں سے کہہ دو کہ پکاریں جن کو وہ اللہ کے سوا (کارساز) سمجھتے ہیں (کہ وہ ان کی مشکل کشائی کریں)، وہ اختیار ہی نہیں رکھتے کہ تمہاری تکلیف کو دور کرسکیں اور تمہاری بری حالت کو اچھی حالت سے بدل دیں۔''

آگے بتایا گیا ہے کہ خدا کے جن نیک بندوں کو یہ لوگ (یعنی یہودی) نادانی میں اپنا وسیلہ سمجھ کر پکارتے ہیں وہ خود یہ چاہتے ہیں کہ کس طرح اچھے عمل کے ذریعہ سے خدا کے زیادہ قریب ہوجائیں[1]۔

---

[1] اس آیت (بنی اسرائیل۔۵۷) کے ترجمہ میں شیخ الہند ؒ سے تسامح ہوا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے ''وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں وہ خود ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون سا بندہ بہت نزدیک ہے۔'' آیت میں 'ایھم' کی ضمیر مجرور کا مرجع ''الّذین یدعون ؓ'' ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ وہ کسی بندے کو نہیں ڈھونڈتے ہیں کہ وہ ان کو خدا سے قریب کردے بلکہ خدا کے یہ نیک بندے باہم مسابقت کرتے ہیں کہ کون اعمال نیک کے ذریعہ خدا کے زیادہ قریب ہوجائے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے وہ بھی غلط ہے اور اس سے اہلِ بدعت کی تائید ہوتی ہے۔ ترجمہ و تفسیر کی یہ غلطی ان دو بڑے عالموں سے صرف اس لیے ہوئی کہ انھوں نے آیت کے سیاق وسباق کو غور سے نہیں دیکھا۔ (مصنف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۶) انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا (سورۂ احزاب۔۳۳)۔ اس آیت میں 'اہل بیت' سے ایک گروہ صرف اولادِ نبی کو مراد لیتا ہے۔ سیاق کلام سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ اس سے کسی اشتباہ کے بغیر معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کے مفہوم میں سب سے پہلے ازواجِ مطہرات داخل ہیں، اس کے بعد دوسرے اہلِ خانہ آتے ہیں۔ اس سورہ کا تیسرا رکوع ازواجِ مطہرات کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہے۔ اس کا آغاز ان جملوں سے ہوا ہے: یا ایھا النبی قل لازواجک الخ، اور پھر اسی سلسلۂ کلام میں دوبارہ براہ راست ازواجِ مطہرات کو خطاب کیا گیا ہے: یانسآء النبی لستن کاحد من النسآء الخ، اور زیر بحث آیت کے بعد یہ آیت ہے: واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من اٰیٰت اللہ والحکمۃ (آیت ۳۴)۔

آیت کے اس سیاق و سباق میں کون کہہ سکتا ہے کہ اہل بیت میں ازواج داخل نہیں ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ آیت میں اہل بیت سے مراد ازواجِ مطہرات ہی ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل بیت کے عام مفہوم میں بیویوں کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں وغیرہ بھی داخل ہیں۔

(۷) الرحمٰن O علّم القرآن O خلق الانسان O علّمہ البیان (سورۂ رحمٰن ۱۔۴)۔ اس آیت کی تشریح ایک شیعی عالم نے ان لفظوں میں کی ہے:

> "ان آیات میں دو باتوں کی صراحت ہے۔ پہلی تو یہ کہ اللہ نے براہِ راست کسی کو قرآن تعلیم کیا ہے، اور دوسری یہ کہ قرآن کی یہ تعلیم انسان کی تخلیق سے قبل ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علم الٰہی سے قرآن کا پہلا نزول نورِ محمد پر ہوا ہے[1]"

---

[1] تفسیر احسن الحدیث، علامہ طالب جوہری، ص ۱۱ (حرف آغاز)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیت کی یہ تشریح صحیح نہیں ہے اور اس بھیانک غلطی کی وجہ سیاقِ کلام کی عدمِ رعایت ہے۔ اس سورہ سے پہلے سورۂ قمر ہے جس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوا ہے : عند ملیک مقتدر ۔ اسی بادشاہِ عالی مقام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ غیر معمولی طاقت وشوکت کے باوجود بے اندازہ مہربان ہے (الرحمٰن)۔ سورۂ قمر میں قوموں کی ہلاکت کا ذکر ہے۔ اس سے خوف کا ماحول پیدا ہوا۔ اسی ماحول کو ختم کرنے کے لیے سورۂ رحمٰن میں خدا کی متنوّع نعمتوں کا ذکر ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے حق میں بہت زیادہ رحیم وکریم ہے۔

اس سورہ کی ابتدائی آیات میں خدا کی تین اہم عنایتوں کا ذکر ہوا ہے۔ پہلی عنایت یہ ہے کہ اس نے قرآن کی تعلیم دی یعنی اس کے ذریعہ بندوں کو کتاب وحکمت کا علم عطا کیا اور اپنی مرضی اور منشاء سے انھیں آگاہ کیا۔ اس عنایت کو اگلی دو عنایتوں یعنی تخلیقِ انسان اور قوتِ بیان پر مقدم کر کے بتایا گیا ہے کہ قرآن کوئی معمولی کتاب نہیں ہے، وہ اس کے لطف وکرم کا ایک بڑا مظہر اور اس کے بے نہایت علم وحکمت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن انسان ہے کہ خدا کی ان عظیم عنایات کے اعتراف کے لیے تیار نہیں ہے اور ناشکری پر مصر ہے۔

نظائر

تفسیرِ قرآن بالقرآن کا یہ چوتھا اصول ہے۔ قرآن کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اگر کسی مقام پر کوئی بات مجمل ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ ان نظائر سے آیات کی تشریح وتوضیح میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میں اس کو چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) سورۂ فاتحہ کی آیت ہے: انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین۔ اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ 'منعم علیہم' 'مغضوب' اور 'ضالّین' سے کون لوگ مراد ہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۶۹ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'منعم علیہم' سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں: ومن یطع اللّٰہ والرسول فاولٰئک مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھدآء والصٰلحین۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۶۰ سے مغضوب کے معنی کی وضاحت ہوتی ہے: قل ھل انبّئکم بشر من ذلک مثوبۃ عنداللّٰہ ط من لعنہ اللّٰہ وغضب علیہ وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبدالطاغوت ط ''کہہ دو کہ کیا میں تمھیں بتاؤں، خدا کے نزدیک انجام کے اعتبار سے کون لوگ زیادہ برے ہیں۔ وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اس کا غضب نازل ہوا، جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے، جنھوں نے طاغوت کی اطاعت کی۔'' اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں روئے سخن یہودیوں کی طرف ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'مغضوب علیھم' سے مراد یہودی ہیں۔

'ضالّین' سے مراد عیسائی ہیں جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۷۷ میں فرمایا گیا ہے: قل یا اھل الکتاب لاتغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلّوا من قبل واضلّوا کثیرا وضلّوا عن سوآء السبیل، ''اے اہل کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو (یعنی حق کے معاملے میں اعتدال سے تجاوز نہ کرو) اور اس گروہ کی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گم راہ ہو چکا ہے اور اس نے بہتوں کو گم راہ کیا ہے، اور وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔''

(۲) سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ زندگی کو اجمالاً ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: ولنجعلہ ایۃ للنّاس ورحمۃ منا وکان امرا مقضیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(آیت ۲۱)۔ آیت کے اس اجمال بالخصوص 'اٰیۃ للنّاس' کے مفہوم کو سورۂ آل عمران میں کھول دیا گیا ہے۔ فرمایا ہے: انّی قد جئتکم بایٰۃ من ربکم انّی اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیراً باذن اللّٰہ ج وابری الاکمہ والا برص واحی الموتیٰ باذن اللّٰہ ج وانبّئکم بماتاکلون وماتدّخرون فی بیوتکم ط انّ فی ذٰلک لاٰیۃ لکم ان کنتم مومنین (آیت ۴۹)۔

(۳) الّذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الأمن (سورۂ انعام۔۸۲)۔ اس آیت میں ظلم کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ چنانچہ صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ ظلم سے مراد شرک ہے اور سورۂ لقمان کی یہ آیت تلاوت فرمائی: انّ الشرک لظلم عظیم (آیت ۱۳)۔

(۴) وقاتلوا ھم حتی لاتکون فتنۃ ویکون الدین للّٰہ ط (سورۂ بقرہ۔ ۱۹۳)۔ اس آیت میں 'فتنہ' کا مفہوم واضح نہیں ہے اور اسی عدم وضاحت کی وجہ سے بعض مفسرین نے اس کا غلط مفہوم بیان کیا ہے، مثلاً مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ ''سوسائٹی کی وہ حالت، جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں[1]۔''

اگر مولانا نے فتنہ کے نظائر پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو وہ اس غلط تشریح سے بچ سکتے تھے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے ماقبل کی آیت پر بھی غور نہیں کیا جس میں فتنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۵۱ (سورۂ بقرہ۔ ۱۹۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فتنہ کا مطلب محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے کسی کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنانا، اس کو گھر سے بے گھر کرنا اور اس کے قتل کے درپے ہونا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم والفتنۃ اشدّ من القتل (سورۂ بقرہ۔ ۱۹۱)، ''ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انہیں اس جگہ سے نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ فتنہ قتل سے زیادہ بری چیز ہے۔''

فتنہ کے اس مفہوم کو اسی سورہ میں آگے چل کر مزید واضح کر دیا گیا ہے، ارشاد ہے: یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ ط قل قتال فیہ کبیرٌ وصدٌ عن سبیل اللّٰہ وکفر بہ والمسجدالحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عنداللّٰہ ط والفتنۃ اکبر من القتل ط ولایزالون یقاتلونکم حتی یردو کم عن دینکم ان استطاعوا ط (سورۂ بقرہ۔ ۲۱۷)، ''وہ تم سے ماہ حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ اس میں جنگ کرنا نہایت برا ہے، مگر اللہ کے راستہ (یعنی توحید کی راہ) سے روکنا، خدائے واحد کا انکار، مسجد حرام (کی زیارت) سے روکنا اور اس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک ایک سنگین معاملہ ہے اور فتنہ قتل وخوں ریزی سے زیادہ برا ہے۔ وہ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا زور چلے تو وہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں''۔

اس آیت کے مطابق درج ذیل امور فتنہ میں داخل ہیں:

(۱) دینِ توحید سے روکنا

(۲) خدائے واحد کی اطاعت و بندگی سے انکار

(۳) مسجد حرام کی زیارت سے روکنا

(۴) مکہ کے اہل ایمان کو ظلم و زیادتی کر کے وہاں سے نکال باہر کرنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۵) مسلمانوں پر اس لیے جنگ مسلّط کرنا کہ وہ دینِ توحید چھوڑ کر دوبارہ دینِ شرک میں واپس آ جائیں۔

فتنہ کے اس مفہوم کو انگریزی میں Religious Persecution کہتے ہیں۔

ہم مضمون آیاتِ متفرقہ کا کلّی مطالعہ

تفسیرِ قرآن بالقرآن کا یہ پانچواں اصول ہے۔ قرآن نے اپنے مطالب کے بیان میں کتابی طریقہ اختیار نہیں کیا ہے کہ ایک مضمون کو ایک ہی جگہ اس کے جملہ اطراف و جوانب اور تمام عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ بیان کیا جائے بلکہ اس کے برخلاف طریقہ اختیار کیا ہے۔ میں شروع میں لکھ چکا ہوں کہ قرآن کے تین ہی بنیادی مضامین ہیں، توحید، رسالت اور آخرت۔ ہر سورہ میں یہی مضامین مختلف اسالیب و الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔

لیکن کسی ایک جگہ کوئی مضمون مکمل طور پر بیان نہیں کیا گیا ہے بلکہ موقع و محل اور مخاطب کی عادات و نفسیات کے لحاظ سے اس کا جو حصہ ضروری خیال کیا گیا وہ بیان ہوا ہے۔ اس لیے قرآن کے ان مضامین کی صحیح تفہیم اسی وقت ممکن ہے جب ان کے متفرق اجزاء کو یکجا کر کے ان پر ایک کلّی نظر ڈالی جائے اور پھر ان کا حتمی مفہوم متعین کیا جائے۔

تفہیم قرآن کے اس مفید اصول کو اختیار نہ کرنے کی وجہ سے قرآن کے مضامین کو سمجھنے میں متعدد غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور اس سے بعض بڑے علماء اور جلیل القدر مفسرین کی تحریریں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ ان غلطیوں نے مسلمانوں کو مختلف فرقوں اور جماعتوں میں بانٹ دیا ہے اور وہ ایک عرصۂ دراز سے ایک دوسرے کی تردید بلکہ تضلیل و تکفیر میں مصروف ہیں۔ ان میں سے چند غلطیوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) قرآن کی مختلف سورتوں میں ایمان و عمل کے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہوا ہے۔ کسی جگہ ایمان کے ایک جزء کا بیان ہے تو دوسری جگہ اس کے کسی دوسرے جزء کا۔ کہیں ایمان کا علیحدہ ذکر ہوا ہے اور کہیں اس کے ساتھ عمل کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ان متفرق آیات کی وجہ سے ایمان و عمل میں تعلق کی نوعیت کو سمجھنے میں اختلافات پیدا ہوئے۔ علماء کا ایک گروہ ایمان و عمل کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ اس لزوم کو نہیں مانتا۔ اس کا خیال ہے کہ عمل کے نہ ہونے سے ایمان معدوم نہیں ہوتا، کیونکہ عمل ایمان سے ایک زائد چیز ہے۔

احناف کا یہی نقطۂ نظر ہے۔ اشاعرہ بھی ان کے ہم خیال ہیں۔ یہ نقطۂ نظر دراصل اس مسئلے میں خوارج و معتزلہ اور مرجیہ کے خیالات کا ردِ عمل ہے۔ اس کے علاوہ ان کے عہد کے مسلمانوں کی ایمانی حالت کا عکس بھی اس میں نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایمان و عمل سے متعلق قرآن کی تمام متفرق آیات کو کلی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمان میں عمل داخل ہے۔ بطورِ مثال چند آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) او کلما عٰهدوا عهدا نبذه فريق منهم ط بل اكثرهم لايومنون (سورۂ بقرہ۔ ۱۰۰)

''اور جب کبھی انہوں نے کوئی عہد و پیاں کیا تو ان کے ایک فریق نے ضرور اسے پسِ پشت ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں رکھتے۔''

(۲) اتقوا اللّٰه وذروا مابقی من الربوا ان كنتم مومنين٥ (سورۂ بقرہ۔ ۲۷۸)

''اللہ سے ڈرو اور جس قدر سود (کی ادائیگی کسی کے ذمہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باقی ہو اس کو چھوڑ دو، اگر تم واقعی مومن ہو۔"

(۳) فاوفوا الكيل والميزان ولا تبخسوا الناس اشیآء هم ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مومنین O (سورۂ اعراف۔ ۸۵)

"تم پورا پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کے مال میں کمی نہ کرو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فتنہ و فساد برپا نہ کرو، اگر تم واقعی مومن ہو۔"

(۴) سبحٰنک هذا بهتان عظیم O یعظکم الله أن تعودوا لمثله ابداً ان کنتم مومنین O

(سورۂ نور۔ ۱۶، ۱۷)

"معاذ اللہ، یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمہیں تنبیہ کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسی حرکت دوبارہ نہ کرنا، اگر فی الواقع تم ایمان والے ہو۔"

(۵) افمن کان مومناً کمن کان فاسقاً لا یستون O

(سورۂ سجدہ۔ ۱۸)

"تو کیا جو شخص مومن ہے وہ اس شخص کی مانند ہو جائے گا جو فاسق (یعنی بدعمل) ہے۔ وہ برابر نہیں ہو سکتے۔"

مذکورہ بالا آیات میں عہد شکنی، سود خوری، ناپ تول میں کمی، بہتان تراشی اور فسق و فجور جیسے اعمالِ بد کو ایمان کے منافی بتایا گیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے اجتناب کی تلقین کی گئی ہے، کیونکہ ایمان کے ساتھ اعمالِ بد کا اجتماع ممکن نہیں ہے (سورۂ حجرات۔ ۷)۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایمان کا محل قلب ہے۔اس کے صدق و کذب کی کسوٹی مقرِّ ایمان کے اعمال ہیں۔ان ہی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا کہ وہ حقیقی معنی میں مومن ہے یا نہیں۔اعمال میں کمی ممکن ہے لیکن سرے سے کوئی اچھا عمل ہی نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔اور اگر ایسا ہے تو پھر خدا کی نظر میں وہ شخص مومن نہیں ہوگا ،زیادہ سے زیادہ اس کو قولی مسلمان کہا جاسکتا ہے۔دیکھیں ،مدینہ کے اعرابیوں (دیہاتی مسلمانوں) کا دعویٰ تھا کہ وہ ایمان رکھتے ہیں (قالت الاعراب اٰمنا) لیکن کہا گیا کہ وہ مومن نہیں ہیں،انھوں نے محض ظاہری اطاعت قبول کی ہے،ابھی ان کے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا ہے (قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم ط سورۂ حجرات:۱۴)۔ اعرابیوں کے ایمان کی نفی کی وجہ بالکل واضح ہے،یعنی ان کا عمل ان کے دعوائے ایمان سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔

ایمان کے صحیح ہونے کی جو کسوٹی مقرر کی گئی ہے وہ شرک سے توبہ، قیامِ نماز اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے :فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین (سورۂ توبہ۔۱۱)،''اگر وہ (شرک سے) توبہ کرلیں،نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔''

قرآن میں ان ہی لوگوں کو مومن کہا گیا ہے جو قیام نماز اور ایتائے زکوٰۃ پر جو ایمان کے لازمی تقاضے کی حیثیت رکھتے ہیں (سورۂ بقرہ۔۳) ، سچے دل سے کاربند ہوں۔مثلاً ایک جگہ ہے :

انّما ولیکم اللّٰہ ورسولہ والّذین اٰمنوا الذین یقیمون
الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم راکعون ٥

(سورۂ مائدہ۔۵۵)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

''بے شک تم لوگوں کا حامی و مددگار تو بس اللہ ہے اور اس کا رسول اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور عاجزی کرنے والے ہیں۔''

دوسری جگہ ہے:

طٰسٓ تلک اٰیٰت القرآن و کتاب مبین ○ ھدیً وبشریٰ للمومنین ○ الذین یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم بالأخرۃ ھم یوقنون○

(سورۂ نمل۔۳)

''طٰسٓ، یہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی، ہدایت اور بشارت ہیں ایمان والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

ایک اور جگہ ہے:

الّذین یومنون بالغیب ویقیمون الصلوٰۃ و ممارزقناھم ینفقون○ (سورۂ بقرہ۔۳)

''(اللہ سے ڈرنے والے وہ لوگ ہیں) جو اللہ پر پوشیدگی میں ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

کیا ان متذکرہ بالا آیات کی موجودگی میں کوئی شخص جس کے دل میں خدا کا کچھ بھی خوف ہو، یہ کہہ سکتا ہے کہ ایمان میں اعمال داخل نہیں ہیں۔ ایمان کی مثال بیج کی ہے جو زمین کی آغوش میں پوشیدہ ہوتا ہے اور عمل کی مثال اس بیج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے تنوں اور شاخوں کی ہے۔ کیا تنے اور شاخوں کے بغیر بھی کسی درخت کا تصور ممکن ہے؟

(۲) مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ جس میں ہر مکتبِ فکر کے لوگ شامل ہیں، یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم روز آخرت گنہگار مسلمانوں کی شفاعت فرمائیں گے اور اللہ ان کے گناہ معاف کر دے گا۔ مسلمان کھلے عام، کیا عالم کیا جاہل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شافعِ محشر، شفیع المذنبین اور اسی طرح کے دوسرے وصفی الفاظ سے مخاطب کرتا ہے۔

قرآن میں شفاعت کا ذکر مختلف سورتوں میں ہوا ہے۔ شفاعت سے متعلق ساری آیات کو جمع کر کے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ خیال غلط ہی نہیں صریحاً گم راہ کن ہے۔ قرآن میں روز آخرت کا جو تصور دیا گیا ہے وہ دراصل خدا کے عدلِ بے لاگ کا تصور ہے، یعنی اس دن ہر شخص کے ساتھ مکمل طور پر انصاف ہوگا اور وہاں کوئی سعی و سفارش نہیں چلے گی۔ یہ آیت اس باب میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے:

وما ادرٰک مایوم الدینo ثم ما ادرٰک مایوم الدینo

یوم لاتملک نفس لنفس شیًا والامر یومیئذ للّٰه o

(سورۃ انفطار: ۱۷ تا ۱۹)

”تم کیا جانو کہ روز جزا کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کہ روز جزا کیا ہے، وہ دن ہے کہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور فیصلہ اس دن اللہ کے اختیار میں ہوگا۔“

مسلمانوں کی طرح یہودیوں میں بھی شفاعت کا تصور موجود تھا اور اب بھی ہے۔ وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قوم کے دینی بزرگوں اور اولیاء کی سفارش سے ان کے گناہ

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

معاف ہو جائیں گے اور وہ جنت میں داخل ہوں گے۔ ان کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

واتقوا یوماً لاتجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولاهم ینصرون ○

(سورۂ بقرہ۔ ۴۸)

"اس دن سے ڈرو کہ کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، کسی کی طرف سے کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی اور نہ ہی کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (رہائی کے بدلے میں) لیا جائے گا، اور نہ ان کو (کہیں سے) کوئی مدد پہنچے گی۔"

قرآن میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ کے علاوہ اس کے بندوں کا کوئی شفیع نہیں ہے۔ اس لیے یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی شفیع ہے اور شفاعت کا اختیار رکھتا ہے قرآن کی تکذیب ہے۔ فرمایا گیا ہے:

(۱) لیس لهم من دونه ولی ولا شفیع لعلهم یتقون ○

(سورۂ انعام۔ ۵۱)

"اللہ کے سوا نہ ان کا کوئی کارساز ہے اور نہ شفاعت کرنے والا، (یہ بات اس لیے بتا دی گئی ہے) تاکہ وہ (ارتکابِ گناہ سے) بچیں۔"

(۲) لیس لها من دون اللہ ولی ولا شفیع ج

(سورۂ انعام۔ ۷۰)

(۳) مالکم من دونه من ولی ولا شفیع (سورۂ سجدہ۔ ۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۴) ام اتخذوا من دون اللّٰه شفعآء ط قل اولو کانوا
لا یملکون شیئاً و لا یعقلون ○ قل للّٰه الشفاعة
جمیعاً ط له ملک السمٰوٰت والارض ط ثم الیه
ترجعون ○ (سورۂ زمر۔۴۴)

''کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو شفیع قرار دے لیا ہے، خواہ وہ کوئی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ ہی علم و عقل رکھتے ہوں، کہہ دو کہ ساری شفاعت اللہ کے اختیار میں ہے، آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، آخر الامر تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

قرآن کی بعض آیات میں کہا گیا ہے کہ روزِ آخرت اللہ کی اجازت سے کچھ لوگوں کو بولنے کا موقع ملے گا۔ بدباطن علماء عوام کو گم راہ کرنے کے لیے بالعموم اس قسم کی آیتیں نقل کرتے ہیں اور شفاعت کی تردید کرنے والی تمام آیتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ جن آیات میں شفاعت کی اجازت کا ذکر ہے ان کا تعلق دراصل انبیاء سے ہے۔ روزِ آخرت خدا کی عدالت میں ہر نبی کو اپنی قوم کے وکیل ہونے کی حیثیت سے بولنے کی اجازت دی جائے گی۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

لا یتکلمون الّا من اذن له الرحمن وقال صوابا○
(سورۂ نبا۔۳۸)

''صرف وہی شخص بول سکے گا جس کو رحمٰن (بولنے کی) اجازت دیدے اور وہ ٹھیک بات کہے۔''

اس اجازت کو 'صواب' کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، یعنی صرف وہ بات کہی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائے جو مطابقِ حق ہو، خلاف حق بات کہنے کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی۔ اس اجازت کے بعد خدا کی طرف سے جو بھی فیصلہ ہوگا وہ حق کے مطابق ہوگا، اس سے سرِ مُو انحراف نہ ہوگا (سورۂ سبا۔۲۳)۔ سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں اس معاملہ کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے:

ان تعذبهم فانهم عبادک وان تغفرلهم فانک انت العزیز الحکیم (سورۂ مائدہ۔ ۱۱۸)

"(اے اللہ)، اگر تو انھیں سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو معاف کر دے تو تو زبردست اور دانا ہے۔"

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

هذا یوم ینفع الصّٰدقین صدقهم ط (مائدہ۔۱۱۹)

"یہ وہ دن ہے کہ راست بازوں کو ان کی راست بازی نفع دے گی۔"

مذکورہ جواب کا صاف مطلب یہ ہے کہ آج کے دن ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا جنھوں نے اللہ اور اس کے رسولوں پر جھوٹ باندھا ہوگا۔ عیسائیوں کا اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا حقیقی معنی میں بیٹا اور کائنات کا رب (لارڈ) مانتے ہیں اور ان کو صاحب اختیار سمجھ کر مشکلات اور حاجتوں میں پکارتے ہیں۔

اسی جرم کے مرتکب بہت سے مسلمان بھی ہیں۔ قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ بات کہلوائی گئی ہے کہ وہ علم غیب نہیں رکھتے اور کسی کو نفع اور نقصان پہنچانا تو دور کی بات ہے، انھیں تو اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قل لا املک لنفسی نفعًا ولا ضرًا الا ماشاء اللّٰہ ط
ولو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر وما
مسّنی السوء (سورۂ اعراف۔۱۸۸)

"کہہ دو (اے محمد) کہ میں اپنی ذات کے نفع ونقصان کا اختیار
نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کا علم رکھتا تو بہت
ساری بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔"

قرآن کی اس خبر وہدایت کے باوجود اگر کوئی مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بالذّات عالم الغیب اور نفع ونقصان کا اختیار رکھنے والا سمجھتا ہے تو اس سے بڑا دروغ گو کون ہوگا اور اس کو خدا کی سزا سے کون بچا سکے گا۔

ایک روایت میں ہے کہ جب آیت: انذر عشیرتک الاقربین (سورۂ شعراء۔۲۱۴) "اپنے قرابت داروں کو (عذاب جہنم سے) ڈراؤ" نازل ہوئی تو آپ نے سب سے پہلے اپنے خاندان والوں کو جمع کیا اور فرمایا:

"اے بنی عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ (رسول اللہ کی پھوپھی)، اے فاطمہ محمد کی بیٹی، تم لوگ خود کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی فکر کرو، میں تمہیں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے (بوجہ رشتہ داری) تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔" اسی طرح صبح سویرے صفا کے سب سے اونچے مقام پر کھڑے ہوکر قبیلۂ قریش کے لوگوں سے یوں خطاب کیا: "اے قریش کے لوگو! اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار ہے تو کیا میری بات سچ مان لو گے؟ سب نے کہا، ہاں ہم سچ مان لیں گے، اس لیے کہ ہمارے تجربہ میں تم کبھی جھوٹ نہیں بولے۔ آپ نے فرمایا، اچھا تو میں عذاب الٰہی آنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کچھ کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی لوگ ہوں گے۔ دیکھو، کہیں ایسا نہ ہو کر دوسرے لوگ تو اپنے دامن میں اعمال نیک لیے ہوئے آئیں اور تم لوگ اپنی پیٹھوں پر دنیا کو لادے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے یا محمد، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں[1]۔"

قرآن کی ایک سے زیادہ آیات میں واضح کر دیا گیا ہے کہ روز آخرت چار طرح کے لوگوں کے حق میں کسی کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، ایک مشرک کہ اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے (سورۂ مائدہ۔ ۷۲)، دوسرے منافق (نسآء۔ ۱۴۵)، تیسرے ظالم: ماللظلمين من حميم ولا شفيع يطاع (سورۂ مومن۔ ۱۸) "ظالموں کا نہ کوئی حامی و مددگار ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا کہ اس کی بات مانی جائے"، چوتھے عادی مجرم (Criminals)۔ فرمایا گیا ہے:

> ويوم تقوم الساعة يبلس المجرمون ○ ولم يكن لهم من شركائهم شفعٰٓؤا وكانوا بشركائهم كفرين○
>
> (سورۂ روم۔ ۱۳)
>
> "جس دن (قیامت کی) گھڑی آئے گی، مجرم لوگ مایوسی کا شکار ہوں گے اور وہ جن لوگوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے تھے ان میں سے کوئی بھی ان کی سفارش نہ کرے گا۔ اور وہ (ان کی ناطاقتی دیکھ کر) اپنے شریکوں کا انکار کر دیں گے۔"

لیکن وہ اہل ایمان جو نہ مشرک و منافق ہوں گے اور نہ ہی ظالم و مجرم، مگر بشر

---

[1] بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی وغیرہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہونے کے ناطے ان سے چھوٹے موٹے گناہ سرزد ہو گئے ہوں گے اور انھوں نے دنیا میں توبہ و استغفار کر کے اصلاح حال کی کوشش کی ہوگی، توقع ہے کہ ایسے اہل ایمان اللہ کی رحمت و مغفرت کے حق دار ہوں گے اور ان کے حق میں انبیاء کی التجا کو بھی شرف قبولیت عطا کیا جائے گا۔ فرمایا گیا ہے:

فمن تاب من بعد ظلمہٖ واصلح فانّ اللّٰہ یتوب الیہ ط
انّ اللّٰہ غفور الرحیم ٥ (سورۂ مائدہ۔ ۳۹)

''جس نے ظلم (گناہ) کے بعد توبہ کی اور اپنے عمل کو درست کر لیا تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ولو انّھم اذظلموا انفسھم جاءوک فاستغفروا اللّٰہ
و استغفرلھم رسول اللّٰہ لوجدوا اللّٰہ توابًا رحیما٥
(سورۂ نساء۔ ۶۴)

''اور اگر جس وقت وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے اس وقت وہ تمہارے پاس آ جاتے، پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔''

قرآن کی درج ذیل آیات میں ایسے ہی لوگوں کے معاملے کا ذکر ہوا ہے:

- یومئذ لاتنفع الشفاعۃ الاّ من اذن لہ الرحمٰن (سورۂ طٰہٰ۔ ۱۰۹)

''اس دن سفارش اسی کے حق میں نافع ہوگی جس کے بارے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں زحمٰن سفارش کرنے کی اجازت دے۔"

- ولا تنفع الشفاعة عنده الالمن اذن له (سورۂ سبا۔۲۳)

(۳) قرآن کی متعدد سورتوں میں قدیم قوموں کا ذکر ہوا ہے لیکن ان کے قصہ کو کسی ایک جگہ بیان نہیں کیا گیا ہے، تذکیر و موعظت کے لحاظ سے جس مقام پر داستان کا جو حصہ مناسب معلوم ہوا اس کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح مختلف انبیاء کی دعوتوں کو بھی کسی ایک جگہ تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا ہے، کہیں اس کا ایک پہلو نمایاں کیا گیا ہے تو کہیں دوسرا پہلو۔ ان واقعات اور دعوتوں کو ٹھیک طور پر اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جب ان کے تمام اجزا پر کلّی نظر ڈال کر غور کیا جائے۔

ہمارے بہت سے علماءؒ نے یہ کیا ہے کہ واقعہ یا دعوت کے کسی ایک یا دو جزء کو لے لیا اور بقیہ اجزاء کو چھوڑ کر اس جزئی علم پر اپنے فکر و فلسفہ کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔ ماضی اور حال دونوں میں اس جزئی مطالعہ کی مثالیں موجود ہیں۔ اس کی ایک افسوس ناک مثال درج ذیل آیت قرآنی کی تشریح ہے:

شرع لکم من الدین ماوصّٰی به نوحاً والذی اوحینا
الیک وما وصّینا به ابراهیم و موسیٰ و عیسیٰ ان
اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیه ط کبر علی المشرکین
ماتدعوهم الیه ط (سورۂ شوریٰ۔۱۳)

"اللہ نے تمہارے لیے وہی دین ٹھہرایا ہے جس کا حکم اس
نے نوح کو دیا اور اسی کی وحی اس نے تمہاری طرف کی ہے،
اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا (اور وہ حکم یہ
تھا) کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ جس چیز کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرف تم انہیں بلا رہے ہو وہ مشرکین پر بہت گراں ہے۔"

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر واضح کر دیا گیا ہے کہ اصولی طور پر دین سے مراد توحید ہے اور یہی تمام انبیاء کا متفق علیہ دین تھا۔ خود مذکورہ بالا آیت کا آخری فقرہ 'کبر علی المشرکین ماتدعوھم الیه' اس مفہوم کی تائید کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس چیز کی طرف عرب کے کفار و مشرکین کو بلا رہے تھے وہ دینِ توحید ہی تو تھا، جیسا کہ درج ذیل آیت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے:

قل یا ایھا الناس ان کنتم فی شک من دینی فلا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ ولکن اعبداللہ الذی یتوفکم ج وامرت ان اکون من المومنین ○ وان اقم وجھک للدین حنیفا ج ولاتکونن من المشرکین ○ ولا تدع من دون اللہ مالا ینفعک ولا یضرک ج فان فعلت فانک اذاً من الظلمین ○

(سورۂ یونس: ۱۰۴، ۱۰۶)

"کہہ دو (اے محمد) کہ اے لوگو، اگر تم میرے دین کے بارے میں کوئی شک رکھتے ہو تو (جان لو) میں ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم اللہ کو چھوڑ کر کرتے ہو بلکہ میں صرف اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تم کو وفات دیتا ہے، مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اس پر یقین رکھنے والا ہوں، اور یہ کہ اپنے آپ کو اس دین (یعنی توحید خالص) کی طرف متوجہ رکھنا بالکل یکسو ہو کر، اور (مجھے یہ حکم بھی ملا ہے کہ) کبھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مشرک نہ ہونا۔ اور اللہ کو چھوڑ کر ان کو ہرگز نہ پکارو جو تمہیں
فائدہ پہنچا سکیں اور نہ نقصان۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا شمار
ظالموں (یعنی مشرکوں) میں ہوگا۔"

لیکن اس وضاحت کے باوجود کئی علماء نے دین کی تشریح مختلف طور پر کی ہے۔ مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے لکھا ہے کہ "قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم 'الدین' کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لیے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر و عمل مراد لیا ہے[۱]۔"

جب دین کو نظام اور اسٹیٹ کے معنی میں لیا گیا[۲] تو پھر اقامتِ دین کا مطلب لازماً اقامتِ شریعت ہوگا۔ فرماتے ہیں:

"جس نبی کی اُمت کو جو شریعت بھی اللہ نے دی تھی وہ اس امت کے لیے
دین تھی اور اس کے دورِ نبوت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب
چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ہے اس لیے اُمتِ محمدیہ کو جو
شریعت دی گئی ہے وہ اس دور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین
کا قائم کرنا ہے[۳]۔"

قرآن کے تصورِ دین میں جس کی وضاحت اوپر کی گئی ہے، یہ ایک واضح اضافہ ہے۔ یہاں اس پر مزید گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ جو قارئین تفصیل کے خواہاں

۱۔ دینِ حق، ص ۷، ۸، مزید دیکھیں، تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۱۹۰، حاشیہ: ۳۲
۲۔ قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں، ص ۹۲، ۹۳
۳۔ تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۴۹۰، ۴۹۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوں وہ راقم کی دوسری کتابوں کا مطالعہ کریں[1]۔

گزشتہ صفحات میں تفسیرِ قرآن بالقرآن کے جن اصولوں کا تعارف کرایا گیا ہے وہ لاریب تفسیر کے نہایت عمدہ اصول ہیں۔ اگر ایمان داری کے ساتھ ان اصولوں کی پیروی کی جائے تو فہم آیات میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور اس کی تشریح و توضیح میں بھی ان شاء اللہ کوئی اختلاف واقع نہ ہوگا اور نہ ہی کہیں حق کے ساتھ باطل کو اختلاط کا موقع ملے گا:

لا یاتیه الباطل من بین یدیه و لا من خلفه ط

(سورۂ حم سجدہ۔۴۲)

''باطل نہ تو اس کے آگے سے آسکے گا اور نہ ہی پیچھے سے۔''

۱۔ دیکھیں، احیائے ملّت اور دینی جماعتیں، ص ۱۶۴ تا ۱۷۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم:

تفسیر کے ثانوی ماخذ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفسیر کے ثانوی ماخذ

تفسیر قرآن کے بنیادی اصولوں کے بیان کے بعد اس کے ثانوی ماخذ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ تفسیر کے ثانوی ماخذ میں شانِ نزول، حدیث، قدیم مذہبی صحائف، قدیم اقوام کی تاریخ، جاہلی ادب، عربی لغات اور کتب تفسیر شامل ہیں۔ آگے ان ماخذ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

شانِ نزول

شانِ نزول کا مطلب عام مفسرین نے یہ لیا ہے کہ ہر آیت کے نزول کا سبب کوئی نہ کوئی واقعہ یا مسئلہ تھا، گویا وہ آیت اسی واقعہ یا مسئلہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جیسا کہ درج ذیل آیات کے بارے میں کہا گیا ہے:

(۱) آیتِ ظہار (مجادلہ۔۲)، ثابت بن قیس بن شماس کی عورت کے بارے میں نازل ہوئی[۱]۔

(۲) لا ترفعوا اصواتکم (حجرات۔۲)، یہ آواز بلند کرنے والے ثابت بن قیس بن شماس تھے[۲]۔

(۳) آیتِ لعان (نور:۶، ۹)، عویمر عجلانی یا ہلال بن اُمیہؓ کے بارے میں نازل ہوئی[۳]۔

(۴) آیتِ کلالہ (نساء۔۱۷۶)، جابر بن عبداللہ کے بارے میں نازل ہوئی[۴]۔

بہت سے علماء نے شانِ نزول کے اس مطلب سے اختلاف کیا ہے۔ شاہ

۱۔ تفسیر طبری، ج ۲۸، ص ۲، تفسیر قرطبی، ج ۱۷، ص ۲۷۰، تفسیر ابن کثیر، ج ۴، ص ۳۲۰

۲۔ رواہ البخاری و مسلم عن انسؓ

۳۔ تفسیر طبری، ج ۱۸، ص ۸۲، تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۲۶۵، مزید دیکھیں، فتح الباری، ج ۸، ص ۳۶۲

۴۔ تفسیر طبری، ج ۹، ص ۴۳۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ولی اللہ دہلویؒ نے لکھا ہے کہ "حضرات صحابہ و تابعین اکثر فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی مگر ان کا مقصود صرف اس آیت کے افراد و مصداق اور بعض ایسے مخصوص واقعات کا ذکر ہے جو آیت کے اپنے عموم حکم میں شامل ہیں، خواہ وہ واقعہ جس کو سبب نزول کہا گیا ہے، نزول آیت سے مقدم ہو یا مؤخر، اسرائیلی ہو یا جاہلی یا اسلامی، آیت کے تمام قیود کو حاوی ہو یا بعض کو۔"[1]

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اپنے مقدمۂ تفسیر میں شان نزول کے اس دوسرے مفہوم کی تائید کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"شانِ نزول کا مطلب، جیسا کہ بعض لوگوں نے غلطی سے سمجھا ہے، یہ نہیں ہے کہ وہ کسی آیت یا سورہ کے نزول کا سبب ہوتا ہے، بلکہ اس سے مراد لوگوں کی وہ حالت و کیفیت ہوتی ہے جس پر وہ کلام برسر موقع حاوی ہوتا ہے۔ کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس میں کسی خاص امر یا چند خاص امور کو مدِّ نظر رکھے بغیر کلام کیا گیا ہو، اور وہ امر یا امور جن کو کسی سورہ میں مدّ نظر رکھا جاتا ہے، اس سورہ کے مرکزی مضمون کے تحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر تم کو شان نزول معلوم کرنی ہو تو اس کو خود سورہ سے معلوم کرو کیونکہ کلام کا اپنے موقع و محل کے مناسب ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہر طبیب دوا کے نسخہ سے اس شخص کی بیماری معلوم کر سکتا ہے جس کے لیے نسخہ لکھا گیا، اسی طرح تم ہر سورہ سے اس کی شان نزول معلوم کر سکتے ہو۔"[2]

مولانا نے آگے امام جلال الدین سیوطیؒ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

---

1. الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، فصل پنجم، ص ۷۶، ۷۷
2. تفسیر نظام القرآن (مقدمۂ تفسیر نظام القرآن)، ص ۳۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"زرکشی نے 'برہان' میں لکھا ہے کہ صحابہ و تابعینؒ کا یہ معروف طریقہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں کے بارہ میں نازل ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ بعینہٖ وہ بات اس آیت کے نزول کا سبب ہے...... میں کہتا ہوں کہ سبب نزول اس واقعہ کو کہیں گے جس کے زمانۂ وقوع میں آیت نازل ہوئی۔"[۱]

اس سلسلے میں راقم کا خیال ہے کہ خواہ شانِ نزول کا یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی آیت کسی مخصوص واقعہ کے پیش آنے پر نازل ہوئی، یا یہ مفہوم لیا جائے کہ واقعہ کے زمانۂ وقوع میں آیت نازل ہوئی، فہمِ آیات میں اس سے کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی، زیادہ سے زیادہ واقعہ کی تفصیل معلوم ہوجاتی ہے اور وہ زمانہ بڑی حد تک متعیّن ہوجاتا ہے جس میں آیات نازل ہوئیں۔ لیکن مقصود نہ تو نفسِ واقعہ ہے اور نہ ہی زمانۂ وقوع بلکہ وہ حکم ہے جو اس واقعہ کے ذیل میں دیا گیا ہے۔

بطور مثال سورۂ تحریم کو لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعض بیویوں کی خوشی کا لحاظ کرتے ہوئے کسی خاص غذا کے نہ کھانے کا عہد کرلیا تھا، حالانکہ وہ حلال وطیّب تھی۔ قرآن میں نہ تو یہ مذکور ہے کہ وہ بیویاں کون تھیں اور نہ یہ بتایا گیا کہ کس چیز کے نہ کھانے کا آپ نے عہد کیا تھا۔ شانِ نزول کی روایتوں سے اس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، اگرچہ ان میں بھی اختلاف ہے، لیکن ان تفصیلات سے قاری کو کیا حاصل ہوتا ہے۔ اصل چیز جس کو اہمیت حاصل ہے وہ سورہ کی غایتِ نزول ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کو بھی یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی حلال چیز کو کسی وجہ سے اپنے اوپر حرام کرے، کیونکہ اس کا فعل امّت کے لیے حجّت ہوتا ہے۔ اور

۱۔ تفسیر نظام القرآن (مقدمۂ تفسیر نظام القرآن)، ص ۲۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ چیز متعلقہ آیات پر غور و تدبر سے حاصل ہو جاتی ہے۔

اکثر مفسرین کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر آیت کی شانِ نزول بیان کرتے ہیں، خواہ آیت کا سیاق و سباق اس کو قبول نہ کرتا ہو۔ اس کی ایک مثال سورۂ نساء کی آیت ۵۸ ہے: ان اللّٰہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الی اھلھا۔ منقول ہے کہ "فتح مکہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور عثمان بن طلحہ، کلید بردارِ خانۂ کعبہ، نے کنجی دینے سے انکار کیا تو حضرت علیؓ نے ان سے چھین کر دروازہ کھول دیا۔ آپؐ فارغ ہو کر جب باہر تشریف لائے تو حضرت عباسؓ نے آپ سے درخواست کی کہ یہ کنجی مجھ کو دی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور کنجی عثمان بن طلحہ ہی کے حوالہ کی گئی[۱]۔"

یہ شانِ نزول کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اور سیاقِ کلام سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اس سے پہلے یہودیوں کا ذکر ہے۔ ان کی دینی اور دنیوی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذہبی اور قومی قائد وہ لوگ تھے جو منصبِ قیادت کے اہل نہیں تھے۔ عام یہودی اس خرابی کے باوجود اپنے بدقماش لیڈروں کی اطاعت کرتے تھے (آیت ۵۱)۔ اس پس منظر میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ امانتیں یعنی ذمہ داریاں ان ہی لوگوں کے سپرد کریں جو ان کے اہل ہوں۔ ان ذمہ داریوں میں بالخصوص حکومت کے اعلیٰ مناصب اور عہدۂ قضا شامل ہیں، جیسا کہ 'ان اللّٰہ یامرکم' الخ کے بعد فرمایا گیا ہے:

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ط ان اللّٰہ نعمّا یعظکم بہ ط ان اللّٰہ کان سمیعاً بصیرا ○ یا ایھا

---

[۱] موضح فرقان، شیخ الہندؒ (برحاشیہ)، سورہ نساء۔ ۵۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الـذیـن امـنـوا اطیعوا اللّٰـہ و اطیعوا الرسول
واولوا الامر منکم ؎ (سورۂ نسآء۔ ۵۸،۵۹)
''اور جب لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرو تو انصاف سے
فیصلہ کرو۔ اللہ تمہیں اچھی بات کی نصیحت کرتا ہے۔ بے شک
اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اے ایمان والو، اللہ کی اطاعت کرو اور
اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں
سے صاحب امر (یعنی حاکم) ہوں۔''

اسی طرح بخاری کی وہ روایت بھی محلِ نظر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہے۔ اس میں اس قصہّ کا ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ابی کے پاس گئے اور آپ کے ساتھ انصار کے کچھ مسلمان بھی تھے۔ ابن ابی نے رسول اللہ کی اہانت کی یعنی اس نے کہا کہ میرے قریب نہ آؤ، تمہارے گدھے کی بدبو نے (رسول اللہ گدھے پر سوار ہو کر گئے تھے) مجھے اذیت میں ڈال دیا ہے۔ یہ سن کر ایک انصاری مسلمان کو غصہ آ گیا اور پھر کیا تھا دونوں طرف سے مار پیٹ اور جوتم پیکار ہوئی ؎۔

کہا گیا ہے کہ سورۂ حجرات کی آیت ۹: وان طـائـفتان من المومنین اقتتلوا فـاصـلحوا بینهما الخ کی شانِ نزول مذکورہ واقعہ ہے۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ واقعہ غزوۂ بدر کے پہلے کا ہوسکتا ہے کیونکہ عبداللہ ابن ابی فتح بدر کے بعد ایمان لایا تھا۔ اور یہ بات اہل علم کے درمیان متفق علیہ ہے کہ سورۂ حجرات فتح خیبر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ آیت اور قصہّ میں معنوی مطابقت نہیں ہے۔ آیت میں دو مسلمان گروہوں کے درمیان لڑائی کا ذکر ہے جب کہ مذکورہ واقعے میں لڑائی کا تعلق مسلمانوں کی ایک

؎ مزید دیکھیں، سنن ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ المائدہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جماعت اور اہل کفر سے ہے۔ان وجوہ سے اس قصہ کو آیت کی شانِ نزول نہیں کہا جاسکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سرے سے یہ روایت ہی محلِ نظر ہے۔

اسی قسم کی غلطی سورۂ مائدہ کی آیت ۱۰۶ : یا ایھا الذین امنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ الخ کی شان نزول متعین کرنے میں ہوئی ہے۔ صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ خاندان ابی سہم کا ایک شخص تمیم داری اور عدی بن بداء کے ساتھ تجارت کی غرض سے شام گیا تھا۔ دوران سفر ہی اس شخص کا انتقال ہوگیا۔ اس کی وصیت کے مطابق اس کے ساتھیوں نے اس کا متروکہ سامان اس کے گھر والوں کو دے دیا لیکن چاندی کا ایک گلاس اور چند دوسری چیزیں غائب تھیں۔ جب یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آیا تو آپ نے ان دونوں (تمیم داری وعدی) کو قسم دلائی۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ وہ گلاس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ملحوظ رہے کہ اس وقت یہ دونوں غیر مسلم تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے جھوٹی قسم کھائی تھی اور گلاس فلاں آدمی کو بیچا گیا ہے۔اس انکشاف کے بعد قبیلہ سہم کے دو لوگوں نے اٹھ کر قسم کھائی کہ تمیم اور عدی کے مقابلے میں ان کی شہادت زیادہ لائقِ قبول ہے۔ یہ گلاس ہمارے آدمی کا ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا کہ سورہ مائدہ کی یہ آیت ان ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اب دیکھیں کہ سورۂ مائدہ کی آیت میں جو مضمون ہے اس کا تعلق وصیت سے ہے۔ ہدایت کی گئی ہے کہ جب کسی مسلمان کا آخری وقت آجائے اور وہ اپنے مال کے بارے میں وصیت کرنا چاہے تو دو ثقہ گواہوں کی موجودگی میں یہ کام انجام دے۔ لیکن مذکورہ قصہ میں وصیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔اس لیے اس واقعے کو سورۂ مائدہ کی مذکورہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آیت کی شانِ نزول کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ ماننا ہوگا کہ اس سلسلے میں حضرت ابن عباسؓ کی طرف جو قول منسوب کیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ وہ بھلا ایسی غلط بات کس طرح کہہ سکتے تھے کہ وہ قرآن کے ایک بڑے عالم تھے۔[۱]

اتنا ہی نہیں کہ مفسرین نے بہت سے آیات کی غیر مناسب شان نزول بیان کی ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، بلکہ بعض آیتوں کی وہ شان نزول بیان کی ہے جو ان کے حقیقی مفہوم کے سمجھنے میں صریحاً حارج ہیں۔ مثلاً آیت: الرجال قوّامون علی النسآء الخ (سورۂ نسآء۔۳۴)، ''مرد عورتوں پر قوام ہیں'' کے بارے میں ابن مردویہ حضرت علیؓ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی ایک عورت کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اس نے رسول اللہ سے شکایت کی کہ اس کے شوہر نے اسے ایسا طمانچہ مارا ہے جس سے چہرہ پر نشان پڑ گیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو اس کا حق نہیں ہے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: الرجال قوامون علی النسآء۔[۲]

اس روایت نے قرآن اور پیغمبر اسلام کی تصویر جس طرح بگاڑی ہے وہ واضح ہے۔ اس روایت کے مطابق رسول خدا تو یہ فرماتے ہیں کہ انصاری عورت کے شوہر نے اس طرح ضرب لگا کر برا کیا ہے لیکن وحی کا فیصلہ ہے کہ شوہر نے مار کر کوئی غلط کام نہیں کیا۔ اس کو مارنے کا ہر طرح حق حاصل ہے کیونکہ مرد عورتوں پر حاکم بنائے گئے ہیں۔ ہمارے بہت سے مفسرین نے 'قوام' کا ترجمہ حاکم ہی کیا ہے۔[۳]

معلوم ہوا کہ ہر آیت کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ اس کی کوئی شان نزول

---

[۱] دیکھیں، صحیح بخاری کا مطالعہ، مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، ص ۶۲ تا ۶۷

[۲] تفسیر مظہری، ج ۱، ص ۹۸۔ مزید دیکھیں، تفسیر طبری والدّر المنثور للسیوطی

[۳] دیکھیں، صفوۃ التفاسیر، ج ۱، ص ۲۷۴، موضح فرقان (ترجمہ شیخ الہند)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ضرور ہوگی، ایک غلط خیال ہے۔ غیر محتاط مفسروں نے اس غلط خیال کو پھیلا کر فہم قرآن کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کھڑی کر دی ہے۔ انھوں نے ذرا بھی غور نہیں کیا کہ قرآن کے دو تہائی سے زیادہ حصے میں انبیاءِ سابقین اور اقوامِ ماضیہ کے واقعات، وقوعِ قیامت اور آخرت کے احوال و مناظر بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مضامین سے متعلق آیات کی کوئی شانِ نزول نہیں ہوسکتی ہے اور نہ تفسیر کی کتابوں میں ان کی شانِ نزول بیان کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کئی سورتیں بیک دفعہ نازل ہوئی ہیں تو ان کی ہر آیت کی الگ الگ شانِ نزول کس طرح ہوسکتی ہے۔ امام رازیؒ نے سورۂ انعام کی آیت 'واذاجاءک الذین یومنون بایٰتنا' الخ کی تفسیر میں لکھا ہے:

> "مجھے یہاں ایک سخت اشکال پیش آیا ہے۔ وہ یہ کہ لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ یہ پوری سورہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔ اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر ہر آیت کے بارے میں یہ کہنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے کہ اس کا سببِ نزول فلاں واقعہ ہے[1]۔"

معلوم ہوا کہ شانِ نزول کے معاملہ میں ہمارے علماء اور مفسرین نے افراط سے کام لیا ہے۔ تفہیمِ قرآن میں جس ماخذ کی حیثیت ثانوی تھی اس کو انھوں نے اصل بنا کر اس کی تفسیر کی، خود بھی جگہ جگہ بے راہ ہوئے اور طالبینِ حق کی بھی غلط رہنمائی کی۔ اس باب میں محتاط روش کی ضرورت ہے۔ حتی الوسع کوشش کی جائے کہ شانِ نزول کو خود سورہ کے اندر تلاش کیا جائے، پھر اس سے متعلق روایات کو دیکھا جائے۔ اگر دونوں میں مطابقت ہے تو بہت خوب، بصورت دیگر اس شانِ نزول کو ترجیح دی جائے جو خود کلام کی اندرونی شہادتوں پر قائم ہو۔ جو شانِ نزول سیاقِ کلام سے متعارض ہو وہ ہرگز اس لائق

---

[1] تفسیر کبیر، بحوالہ تفسیر نظام القرآن، مولانا حمید الدین فراہی (مقدمہ)، ص ۳۷

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا جائے۔

لیکن اگر قرآن سے شانِ نزول معلوم نہ ہو سکے اور اس کے بغیر آیت کی تفہیم ممکن نہ ہو تو پھر مستند روایات کی مراجعت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی ایک مثال سورۂ نسآء کی ۱۰۵ سے ۱۱۳ تک کی آیات ہیں۔ ان آیات میں جس واقعے کا اجمالاً ذکر ہوا ہے اس کے مختلف اجزاء کا مفہوم واضح نہیں ہے۔ آیت 'ولا تکن للخائنین خصیما' میں خائنین کون تھے اور نوعیت خیانت کیا تھی اور اہل ایمان نے کس طرح کا مجادلہ کیا تھا، واضح نہیں ہے۔ اسی طرح آیت 'لھمت طائفة منھم ان یضلوک' میں طائفہ سے کون لوگ مراد ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح راہ سے ہٹانے کا کیا مطلب ہے، غیر واضح ہے۔ ان سب سوالات کا جواب روایات میں بیان کردہ شانِ نزول سے ٹھیک طور پر مل جاتا ہے۔

حدیث

قارئین یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے تفسیر قرآن میں حدیث کو ثانوی ماخذ کی حیثیت دی ہے جب کہ بہت سے علماء کا خیال ہے کہ اس کے بغیر قرآن کی تفسیر ممکن نہیں ہے۔ اس خیال کو عام کرنے میں تفسیرِ ماثور کے قائل علماء نے اہم حصہ لیا ہے۔ اس معاملے میں انھوں نے اس درجہ مبالغہ سے کام لیا ہے کہ ہر اس تفسیر کو تفسیر بالرائے کہہ دیا جو تفسیر بالحدیث کے خلاف ہو۔ اس رائے کی غلطی میں تفصیل سے واضح کر چکا ہوں۔

تفسیرِ قرآن میں حدیث کی صحیح حیثیت کے تعیّن کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ قرآن لفظاً اور معناً دونوں طرح محفوظ ہے، تواتر کے ساتھ اُمت تک منتقل ہوا ہے اور اس میں کہیں کوئی ادنیٰ نقص و خلل بھی موجود نہیں ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن اور اسلام کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن لفظ و معنیٰ کی صحت کے اعتبار سے مرتبۂ یقین پر فائز ہے۔ حدیث کو یقین کا یہ درجہ حاصل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث لفظاً نہیں، معناً روایت ہوئی ہیں۔ اور ان کا بڑا حصہ اخبار آحاد پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے علاوہ کچھ بھی لکھنے سے منع کر دیا تھا: لاتکتبوا عنّی غیر القرآن شیئاً[1] "قرآن کے علاوہ مجھ سے کوئی چیز نہ لکھو۔"

اس ہدایت کے باوجود رسول اللہ کی وفات کے بعد اور بہت بعد آپ کے اقوال کو زبانی روایت کی مدد سے جمع کیا گیا اور پھر ان کو رفتہ رفتہ مدوّن کیا گیا۔ چونکہ اقوالِ رسول معناً روایت کیے گئے تھے اور جامعینِ حدیث کے لفظوں میں قلم بند کیے گئے تھے اس لیے روایتِ حدیث میں کثرت سے اختلافات واقع ہوئے۔ اس سے بھی بڑا ستم یہ ہوا کہ مختلف مقاصد کے لیے حدیثیں گھڑی گئیں اور اس طرح صحیح اور غلط روایات کے نام سے ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔

امام مالک کی 'مؤطا' میں کل ۶۰۰ حدیثیں مسند ہیں، مرسل (۲۲۲)، موقوف (۶۱۳)، اور اقوالِ تابعین (۲۵۰) اس کے علاوہ ہیں۔ ملحوظ رہے کہ امام مالکؒ نے دس ہزار حدیثوں میں سے چھانٹ کر انہی روایات کو لیا ہے جو ان کے نزدیک صحیح اور تعاملِ اہلِ مدینہ کے موافق تھیں۔

امام بخاری کی کتاب 'صحیح بخاری' کا علم حدیث میں جو درجہ ہے اس سے اہل علم واقف ہیں۔ یہ کتاب بھی مؤطا ہی کی طرح فقہی طرز پر مرتب کی گئی ہے۔ اس مجموعۂ حدیث میں حدیثوں کی تعداد مکرّرات کے ساتھ سات ہزار دو سو چھتر[2] ہے،

---

[1] ترمذی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مکررات کے بغیر ان کی تعداد چار ہزار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے چھانٹ کر ان کو لیا ہے۔ انھوں نے جن حدیثوں کو اپنی صحیح میں نہیں لیا وہ کہیں غائب نہیں ہوگئیں، وہ آج بھی حدیث کی کم درجہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔

جامعینِ حدیث کی سخت احتیاط اور بلند معیارِ انتخاب کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں جو روایتیں ہیں وہ ہر عیب و نقص سے پاک ہیں۔ ان کتابوں میں ایسی متعدد حدیثیں موجود ہیں جو درست نہیں ہیں، مثلاً حضرت ابراہیم کے جھوٹ بولنے کی حدیث وغیرہ۔ ہندوستان کے مشہور عالم اور محقق حدیث مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی نے ایسی تیس حدیثوں کی نشاندہی کی ہے جو موضوع ہیں اور بخاری میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسی سیکڑوں حدیثوں کا ذکر کیا ہے جن میں جزدی نقائص پائے جاتے ہیں[1]۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ زیادہ تر احادیث اخبارِ آحاد کی حیثیت رکھتی ہیں، یعنی چند ہی راویوں سے مروی ہیں۔ اصولیین کے قول کے مطابق اور امام غزالیؒ کے حوالہ سے اس کا ذکر ہو چکا ہے، یہ حدیثیں مفیدِ یقین نہیں ہیں، یعنی ان سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا، ان میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہے۔ علماء حدیث اس بات کو نہیں مانتے اور مختلف دلیلوں سے اس خیال کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت وہ بھی نہیں کرتے کہ صحت و یقین کے اعتبار سے قرآن اور حدیث مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس بنا پر تسلیم کرنا ہوگا کہ یقینی (قرآن) کی تفسیر صرف اسی چیز سے ہوسکتی ہے جو قرآن ہی کی طرح یقینی ہو۔ کسی ایسی چیز سے قرآن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی ہے جو یقینی نہ ہو بلکہ اس میں ظنّیت موجود ہو، خواہ اس کی مقدار کثیر ہو یا قلیل۔

---

[1] دیکھیں، صحیح بخاری کا مطالعہ، جزء اول و دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس بحث سے ہمارا مقصود یہ ثابت کرنا نہیں کہ قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مطلق کوئی دخل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے گا تو وہ یقیناً غلطی پر ہوگا۔ قرآن کی تفسیر میں ذخیرۂ حدیث سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ یہ استفادہ ناگزیر ہے۔ لیکن اصل کی حیثیت سے نہیں کہ یہ حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے، بلکہ فرع کی حیثیت سے۔ اس کی تفصیل کی ضرورت ہے تاکہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

حدیث کی ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ تاریخ اسلام ہے۔ اس سے عربی عہد کے حالات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے شب و روز اور حق و باطل کی کشاکش کے مختلف ادوار اور ان میں پیش آنے والے واقعات و حوادث کا علم حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں عہد نبوی کے جن واقعات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے ان کی تفصیل حدیث و آثار سے کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ موضوع حدیثوں کی ایک بڑی تعداد کا تعلق اس عہد کے تاریخی واقعات ہی سے ہے۔ اس لیے اس باب میں غایت درجہ احتیاط لازمی ہے۔

حدیث کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس میں دین کے متعدد جزئی احکام بیان ہوئے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ دین اسلام کی فقہ ہے جیسا کہ مؤطا اور بخاری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہے کہ قرآن میں زیادہ تر احکام کے اصول و کلیات دیے گئے ہیں، ان کے عملی جزئیات بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ اس لیے آیاتِ احکام کی تفسیر میں حدیث کے فقہی حصہ کی مراجعت مفید ہے۔

لیکن یہ بات فراموش نہ ہو کہ حدیثوں میں بیان کردہ عملی جزئیات، تعبدی امور کو مستثنیٰ کرکے، دائمی اور ناقابلِ تغیر نہیں ہیں۔ دائمی حیثیت صرف قرآن کے کلی اصولوں کو حاصل ہے۔ معلوم ہے کہ عہدِ خلافت میں دورِ نبوی کے کئی جزئی احکام میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بقدر حاجت تبدیلی کی گئی ہے اور اس کو صحابہ کی جماعت نے تسلیم کیا۔ یہاں صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار سو اونٹ اور نقد کی شکل میں ۸۰۰ دینار مقرر کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس کو بڑھا کر ایک ہزار دینار کر دیا اور فرمایا کہ اونٹوں کی قیمت اب کافی بڑھ گئی ہے۔

حدیث کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی اخلاقیات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے اور یہ حصہ بہت قیمتی ہے۔ اس میں علم و حکمت کے گہرہائے تابدار ملتے ہیں۔ قرآن بذاتِ خود حکمت و اخلاق کا خزانہ ہے۔ اس میں اسلام کے فلسفۂ اخلاق کو بڑے جامع اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ حدیث کا یہ حصہ دراصل قرآنی حکمت و اخلاق کی تفصیل ہے۔ قرآن کی آیاتِ حکمت کی تفسیر میں حدیث کے اس بے بہا حصے کو تائید و تفصیل کے طور پر لانا بہت مفید ہوگا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تفسیر میں گو کہ حدیث کو ثانوی حیثیت حاصل ہے لیکن وہ غایت درجہ قابلِ لحاظ ہے اور تفسیر کے دوسرے ثانوی ماخذوں پر اس کو برتری حاصل ہے۔ جو لوگ تفسیرِ قرآن میں حدیث کی اس حیثیت کے منکر ہیں وہ کم اندیشی اور نادانی میں ایک مفید شے سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔

دین میں ساری خرابیوں کی جڑ افراط و تفریط کی روش ہے۔ اس معاملے میں راہِ اعتدال یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے اور اس کو تفسیرِ ماثور کے قائل علماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے بعد حدیث و آثار کو دیکھا جائے۔ اگر وہاں بھی وہ چیز مل جائے جو تفسیرِ قرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کر کے حاصل ہوئی ہے تو نورٌ علیٰ نور۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو قرآن کے نظائر اور متعلقہ آیات کے سیاق و سباق کو ایک سے زیادہ بار دیکھا جائے۔ اگر اس کوشش کے بعد روایت سے مطابقت ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائے تو ٹھیک ورنہ روایت کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے اور تفسیرِ قرآن بالقرآن سے حاصل شدہ چیز کو قرآن کا منشاءِ مراد سمجھا جائے۔

قدیم مذہبی صحائف

قرآن کی تفسیر میں قدیم مذہبی صحائف بالخصوص تورات اور انجیل سے استفادہ نہ صرف جائز بالکل مفید ہے۔ تفاسیرِ منقول میں فضول اسرائیلی روایات کو دیکھ کر بہت سے اہل علم نے تفسیر قرآن کے اس ثانوی ماخذ سے چشم پوشی کی ہے۔ انھوں نے اہلِ کتاب کی مذہبی تاریخ اور ان کی مذہبی کتابوں سے براہِ راست واقفیت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس عدمِ التفات کی ایک بڑی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اہل کتاب کی مذہبی تاریخ اس طور پر اس وقت مرتب نہیں ہوئی تھی جس طرح وہ آج مرتب صورت میں موجود ہے۔ اس بے توجہی میں مذہبی تعصب اور احساسِ برتری کو بھی دخل رہا ہے کہ قرآن کے بعد کسی اور مذہبی کتاب کی طرف دیکھنا بے سود ہے۔

لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں قدیم مذہبی صحائف کی بعض تعلیمات اور اس دور کے چند اہم واقعات کا اجمالاً ذکر ہوا ہے۔ جب تک ان صحیفوں کی مراجعت نہ کی جائے واقعات سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ان کتابوں کی مراجعت سے قاریِ قرآن کو ذہنی اور قلبی تشفی حاصل ہوتی ہے اور اس کے یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ قرآن بلاشبہ خدا کا کلام ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

(۱) ولقد فتنا سلیمان والقینا علیٰ کرسیہ جسدا ثم اناب (سورۃ صٓ۔ ۳۴)۔ اس آیت میں حضرت سلیمان کے امتحان کا ذکر ہے، یعنی ان کی کرسی پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک 'جسد' ڈال دیا گیا تھا[1]۔

اس آیت سے 'القائے جسد' اور حضرت سلیمان کے امتحان کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ ان کے بعد ان کا بیٹا رُحعام تخت حکومت پر بیٹھے۔ لیکن ان کا یہ بیٹا حکم رانی کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا، گویا وہ ایک جسدِ بے روح تھا۔ ان کی کرسی پر ایک 'جسد' کے ڈالنے سے اسی بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود تھا۔ حضرت سلیمان اس کا مطلب سمجھ گئے اور اپنے خیال سے تائب ہو گئے۔

تاریخی طور پر ثابت ہے کہ انھوں نے اپنی جانشینی کے سلسلے میں کوئی وصیت نہیں کی تھی، اس معاملے میں مکمل طور پر سکوت اختیار کیا تھا۔ اس لیے ان کے انتقال کے بعد دستور کے مطابق ان کا بیٹا رحعام ہی تخت نشین ہوا۔ لیکن نہایت قلیل مدت میں اس عظیم سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ بنی اسرائیل کے دس قبائل نے بغاوت کر دی اور وہ شمالی فلسطین کے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ صرف یہوداہ کے قبیلے نے مرکز کا ساتھ دیا اور بیت المقدس کے قرب و جوار کا علاقہ ہی اس کا تابع دار رہا۔

(۲) ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر انّ الارض یرثھا عبادی الصّالحون (انبیآء۔۱۰۵)۔ اس آیت میں زبور کے حوالہ سے کہا گیا ہے کہ زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہوں گے۔ اس کی تفصیل زبور میں اس طرح ہے:

"کیونکہ بدکار کاٹ ڈالے جائیں گے، لیکن جن کو خداوند کی آس ہے وہ

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں جو بے ہودہ قصہ تفسیر کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے اس کو پڑھ کر سخت افسوس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں بخاری اور مسلم میں جو روایت بیان کی گئی ہے وہ بھی ناقابلِ یقین ہے۔ اسی طرح کی روایتوں کو دیکھ کر حدیث کی صحت کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ملک کے وارث ہوں گے...... تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا، تو اس کی جگہ کو دیکھے گا پر وہ نہ ہوگا۔ لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے...... شریروں کے بازو توڑے جائیں گے لیکن خداوند صادقوں کو سنبھالتا ہے، ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہوگی...... صادق رحم کرتا ہے اور دیتا ہے کیونکہ جن کو وہ برکت دیتا ہے وہ زمین کے وارث ہوں گے اور جن پر وہ لعنت کرتا ہے وہ کاٹ ڈالے جائیں گے۔...... خداوند انصاف کو پسند کرتا ہے اور اپنے مقدسوں کو ترک نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوں گے۔ پر شریروں کی نسل کاٹ ڈالی جائے گی۔ صادق زمین کے وارث ہوں گے۔ اور اس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔ صادق کے منہ سے دانائی نکلتی ہے اور اس کے منہ سے انصاف کی باتیں۔ خدا کی شریعت اس کے دل میں ہے ...... شریر صادق کی تاک میں رہتا ہے اور اسے قتل کرنا چاہتا ہے...... خداوند کی آس رکھ اور اسی کی راہ پر چلتا رہ، وہ تجھے سرفراز کرے گا، زمین کا وارث بنائے گا۔[1]"

زبور کی اس تفصیل سے زمین کی وراثت کا مفہوم واضح ہو گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خدا کے صالح بندے (عبادی الصالحون) جو زمین کے وارث ہوں گے، وہ کن اوصاف و خصائل کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے ہی صالح لوگوں کو قرآن میں متقی اور محسن کہا گیا ہے۔

(۳) وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتب لتفسدن فی الارض مرتین الخ (بنی اسرائیل: ۴۔۷)۔ اس آیت میں اجمالاً بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل دوبار خدا کی زمین میں سرکشی کریں گے اور خدا اپنی سنّت کے مطابق انہیں بدترین سزا دے گا۔ ان

---

[1] بائبل، زبور، باب: ۳۷، مزید دیکھیں، انجیل متی، باب ۵:۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دو سرکشیوں کی تفصیل نہیں کی گئی ہے۔ انبیاءِ بنی اسرائیل بالخصوص داؤد[1]، یسعیاہ[2]، یرمیاہ[3]، اور حزقیل[4] علیہم الصلوٰۃ کے صحیفوں میں ان دو بڑے فسادات اور ان کے عبرت ناک انجام کی واضح خبر دی گئی ہے۔ انجیل متی[5] اور لوقا[6] میں آخری بربادی کا ذکر ہوا ہے۔

پہلی بربادی ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nabuchad nezzar) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس حملے میں یہودیہ (Judea) کی ریاست تباہ و برباد ہوگئی، ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا گیا اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ دوسری بربادی سنہ ۷۰ عیسوی میں ہوئی جب رومی فوج نے ٹیٹس (Titus) کی قیادت میں حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کر کے زبردست قتل عام کیا، ایک لاکھ سے زائد یہودی مقتول ہوئے اور ۷۰ ہزار کے قریب غلام بنا لیے گئے۔ یروشلم کے ساتھ ہیکل سلیمانی کو بھی جلا کر پیوندِ خاک کر دیا گیا۔

(۴) محمد رّسول اللّٰہ ط والّذین معه اشدّآء علی الکفار رحمآء بینهم الخ ذٰلک مثلهم فی التوراة ج ومثلهم فی الانجیل کزرع اخرج شطأه الخ (سورۃ فتح۔۲۹)۔ اس آیت میں تورات اور انجیل کے حوالے سے نبی صلی علیہ وسلم کے رفقاء کی دو خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کفار کے حق میں سخت ہوں گے اور دوسری یہ کہ وہ آپس میں رحم دل اور خدا کی عبادت میں مصروف رہنے والے ہوں گے۔ تورات

---

[1] زبور، باب ۶: ۲۴۔۴۱

[2] یسعیاہ، باب ۳: ۱۶۔۲۶

[3] یرمیاہ، باب ۲: ۵۔۲۸

[4] حزقیل، باب ۲۲: ۳۔۱۶

[5] انجیل متی، باب ۲۴: ۳

[6] انجیل لوقا، باب ۲۳: ۲۸۔۳۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں پہلی خصوصیت کا ذکر اس طرح ہے:

''خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی[۱]۔''

دوسری خصوصیت کی وضاحت انجیل کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے:

''اس نے ایک اور تمثیل پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہی اس رائی کے دانے کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے آکر اپنے کھیت میں بو دیا۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا ہے لیکن جب بڑھتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں میں بسیرا کرتے ہیں[۲]۔''

(۵) ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (سورۂ صف۔۶)

اس آیت میں آخری رسول کی بعثت کا ذکر ان کے نام کے ساتھ ہوا ہے۔ موجودہ اناجیل میں اب ایسا کوئی لفظ موجود نہیں ہے جو 'احمد' کا مترادف ہو۔ عیسائیوں نے جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دی ہے۔ لیکن اب بھی آخری نبی کی بعثت کی شہادت انجیل میں موجود ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

''میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا

۱۔ کتاب استثناء، باب ۳۳: ۲۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں ''وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں''۔ (رحماء بینھم)

۲۔ انجیل متی، باب ۱۳: ۳۱، ۳۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا[1]۔"

اس عبارت میں 'مددگار' کا لفظ اضافی ہے اور دیدہ ودانستہ 'احمد' کی جگہ لایا گیا ہے۔ یونانی میں احمد کا مترادف لفظ برقلیطس (Periclytos) اور سریانی میں مُنْحمَنّا ہے جس کے معنی محمد کے ہیں[2]۔

ان چند مثالوں سے واضح ہوگیا کہ قرآن کی بعض آیات کی تفسیر میں قدیم مذہبی صحائف کی مراجعت مفید ہے۔

قدیم اقوام کی تاریخ و آثار

قرآن میں مذکور تاریخی واقعات کی تفسیر میں اقوام ماضیہ کی تاریخ اور ان کے آثار کے مطالعہ سے کافی مدد ملتی ہے۔ قرآن کی متعدد سورتوں میں ماضی کی بہت سی اقوام کے عروج و زوال کا اجمالی ذکر ہوا ہے۔ ان میں سے بعض وہ قومیں ہیں جن کا تعلق ماقبلِ عہد تاریخ (Pre-historic Period) سے ہے، مثلاً قوم نوح۔ آج اس قوم کے آثار دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں۔ اس کے بعد کی قوموں میں عاد و ثمود وغیرہ کا ذکر قرآن میں بکثرت ہوا ہے۔ ان کے بعض آثار آج بھی محفوظ ہیں۔ ان آثار کے مطالعہ سے ان قوموں کے بارے میں قرآن کے اجمالی بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔

قرآن میں غیر عربی اقوام کا بھی ذکر ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ میں قوم فرعون کا ذکر ایک سے زیادہ آیات میں ہوا ہے۔ اس میں اس فرعون بادشاہ کا بھی تذکرہ ہے جو بنی اسرائیل کے تعاقب میں سمندر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ اس کے بارے

---

1. انجیل یوحنا، باب ۱۴: ۲۵، ۲۶

2. سیرت ابن ہشام (السیرۃ النبویۃ)، ج ۱، ص ۲۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں قرآن میں خبر دی گئی ہے کہ اس کی لاش کو اہلِ جہاں کی عبرت کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے (سورۂ یونس۔۹۲)۔ قرآن کی یہ تاریخی خبر سترہویں صدی میں سچ ثابت ہو گئی۔ غرق شدہ فرعون کی لاش قاہرہ کے میوزیم میں محفوظ ہے اور ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

سورۂ روم میں ایک بڑی پیشین گوئی کا ذکر ہے، جس کا تعلق بادشاہ فارس کے ہاتھوں مغلوب رومی سلطنت (بازنطینی حکومت) کے دوبارہ غلبہ وعروج سے ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: الم٥ غلبت الروم٥ فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون٥ فی بضع سنین[1] (آیت ۱۔۴)، ''الم، قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے، لیکن اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں وہ غالب آجائیں گے۔'' اس غلبہ کی ٹھیک تصویر اس وقت سامنے آتی ہے جب بازنطینی عہد کی تاریخ دیکھی جائے۔ مشہور مؤرخ گبن نے اپنی کتاب میں ایرانیوں کے ہاتھوں رومی سلطنت کی مغلوبیت اور دوبارہ اس کے عروج کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ روم کی مذکورہ آیت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> At the time when this prediction is said to have been delivered, no prophecy could be more distant from its accomplishment, since the first twelve years of Heraclius announced the approaching dissolution of the empire.[1]

''جس وقت (رومیوں کے غلبہ کی) یہ پیشگی خبر دی گئی تھی، اس وقت اس طرح کی کسی پیشین گوئی کے پورا ہونے کا کوئی بعید امکان بھی نہیں

---

[1] Gibbon, Decline and Fall of the Roman Empire, Modern Library, New York, Vol .2, P.788

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھا، اس لیے کہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال نے بالکل ظاہر کر دیا تھا کہ جلد ہی یہ سلطنت نابود ہو جائے گی۔"

سورۂ کہف میں 'ذوالقرنین' نامی بادشاہ اور اس کی تین فوجی مہموں کا ذکر ہوا ہے۔ ایک مہم میں وہ مغرب کی طرف اور دوسری میں مشرق کی طرف گیا۔ تیسری مہم کا تعلق اس جگہ سے ہے جہاں کوئی وحشی قوم آباد تھی۔ قرآن کے اس اجمالی بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ذوالقرنین بادشاہ کون تھا اور ان تین فوجی مہموں میں اس کا سامنا کن قوموں سے ہوا۔ اس کے علاوہ یاجوج ماجوج (آیت ۹۴) اور 'بین الصدفین' (آیت ۹۶) کی حقیقت بھی نہیں معلوم ہوتی۔

لیکن اب عصری تاریخی تحقیقات اور قدیم آثار کے مطالعہ کے بعد یہ بات تقریباً طے ہوگئی ہے کہ ذوالقرنین سے مراد بادشاہِ فارس سائرس (۵۵۰ق م) یعنی خسرو ہے، جو زرتشتی مذہب کا پیرو تھا۔ اسی بادشاہ نے ان تین فوجی مہمات کو سر کیا تھا جن کا ذکر سورۂ کہف میں ہوا ہے اور اسی نے یاجوج ماجوج (Magog and Gog) جو منگول قبائل کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، کے حملوں کے سدِّ باب کے لیے وہ 'سد' یعنی آہنی دیوار تعمیر کی تھی جس کا ذکر آیت ۹۴ میں ہوا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ اس سد کا تعلق درّۂ داریال (Darial Pass) سے ہے جو قفقاز (Caucasus) کے بلند پہاڑی حصے میں واقع ہے، یعنی بحرِ خزر (Caspean Sea) سے ملحق۔ اس 'سد' کی تعمیر کے بعد مغربی ایشیا کا علاقہ یاجوج ماجوج کی غارت گری سے محفوظ ہوگیا۔[1]

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ سائرس بادشاہ کو ذوالقرنین کا خطاب یہودیوں نے دیا تھا کیونکہ اسی بادشاہ نے بابل پر حملہ کر کے یہودیوں کو غلامی سے نجات دی تھی

۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیں، ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد، ج ۴، ص ۴۳۰۔۵۴۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اسی کے عہد میں یروشلم دوبارہ آباد ہوا اور سلیمانی ہیکل کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ اس طرح وہ فارس اور لیڈیا دونوں علاقوں کا بادشاہ بن گیا تھا اور اسی نسبت سے ذوالقرنین کہلایا۔

ذوالقرنین بادشاہ اپنی پہلی فوجی مہم میں ایران سے نکل کر خشکی کے راستے سے ایشیائے کوچک (لیڈیا) کی طرف گیا جہاں کے بادشاہ کرولسس نے اس کی مملکت پر حملہ کیا تھا۔ اس فوجی مہم میں وہ ایشیائے کوچک کو فتح کرتا ہوا جس میں لیڈیا کا دارالحکومت سارڈیس بھی تھا، اس کے مغربی ساحل تک جو خشکی کی آخری حد تھی، پہنچ گیا۔ آگے بحر اٰیجین (Aegean Sea) بہت سی خلیجوں یا جھیل کی شکل میں موجود تھا۔ ملحوظ رہے کہ قرآن میں بھی 'عین' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر سائرس نے دیکھا کہ سورج اس گدلے پانی والی جھیل (خلیج) میں گویا ڈوب رہا ہے۔ یہ ایک نظری منظر تھا جو آج بھی ساحلِ سمندر پر کھڑے ہو کر دیکھا جا سکتا ہے۔

دوسری فوجی مہم اس وقت شروع ہوئی جب سائرس لیڈیا کی فتح سے فارغ ہو چکا تھا۔ مشرق کے بعض وحشی قبائل (گیڈروسیائی) اس کی مملکت کے مشرقی علاقوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ یہ دراصل خانہ بدوش قبائل تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سورج سے کوئی آڑ نہیں رکھتے تھے (آیت ۹۰)۔ یہ وہی علاقہ ہے جو آج کل مکران کہا جاتا ہے۔ انہی وحشی قبائل کی تادیب و تعذیب کے لیے اس نے یہ حملہ کیا تھا۔

تیسری فوجی مہم کا تعلق یاجوج اور ماجوج جیسے وحشی قبائل سے تھا جو کاکیشیا (قفقاز) کے سلسلۂ کوہ میں واقع درّہ سے ہو کر اس کی مملکت میں غارت گری کیا کرتے تھے۔ اسی درّہ میں اس نے وہ 'سد' تعمیر کی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔[1]

---

[1] دیکھیں، تفسیر ترجمان القرآن، ج ۳، ص ۴۵۶۔۴۵۹

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اشعارِ جاہلیت، عربی لغات، کتبِ تفسیر

تفسیر قرآن کے ثانوی ذرائع میں جاہلی دور کے مشہور شعراء کا کلام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ کی تحقیق کے لیے اس کی مراجعت ضروری ہے۔ صحابہؓ کے عمل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ نافع بن الازرق کے حوالے سے اس کی کئی مثالیں میں پہلے نقل کر چکا ہوں۔

عربی لغات سے الفاظِ قرآن کے معنی سمجھنے میں مدد تو ملتی ہے لیکن ان پر بالکلیہ انحصار مناسب نہیں ہے۔ ان کے وہی معنی لیے جائیں جن کی تائید نظائرِ قرآن سے ہوتی ہو۔ فہم قرآن میں کلام عرب اور لغات کی حیثیت پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ لکھتے ہیں:

> ''باقی رہے دوسرے الفاظ اور حقیقت و مجاز کے مختلف اسلوب تو اس باب میں ماخذ قدیم کلام عرب اور خود قرآن مجید ہے۔ لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہ نمائی نہیں کرتیں۔ ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے، نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے اور نہ لفظ کی جڑ ہی کا پتہ چلتا ہے کہ معلوم ہو سکے کیا اصل ہے، کیا فرع، اور کیا حقیقت ہے اور کیا مجاز؟ تو جو لوگ کلام عرب میں مہارت نہیں بہم پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات قرآن کے معنی سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ پھر قدیم کلام عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے اس میں بہت کچھ ملاوٹ ہے اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھی اس میں آمیزش ہے۔ لیکن ایک ناقد ماہر کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے اصل و نقل میں امتیاز کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ پس ضروری ہے کہ صرف وہ معنی لیے جائیں جو اصلی کلام عرب سے ماخوذ ہوں[1]۔"

لیکن یہاں یہ بات نظر انداز نہ ہو کہ قرآن کے اصطلاحی الفاظ کو سمجھنے کے لیے کلام عرب اور عربی لغات دونوں غیر مفید ہیں۔ اس مقصد کے لیے صرف قرآن کے نظائر کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ قرآن کلاسیکی عربی کا مستند ترین نمونہ ہے، اس لیے الفاظ کی تحقیق میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے خود قرآن سے اس کے معنی معلوم کیے جائیں۔ اگر تائید کے طور پر شعراءِ جاہلیت کا کلام بھی پیش کیا جائے تو مفید ہوگا اور معنی کی طرف سے اطمینان ہو جائے گا۔ اگر کسی لفظ کی کوئی نظیر قرآن میں موجود نہ ہو تو پھر اشعارِ جاہلیت اور مستند عربی لغات کی مراجعت ناگزیر ہے۔

جہاں تک کتبِ تفسیر کا تعلق ہے تو اس میں رطب و یابس سب موجود ہے۔ معلوم ہے کہ زیادہ تر تفسیریں ایک خاص زاویۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں اس لیے ان کی مراجعت میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کسی لفظ کی تحقیق کے لیے ان سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تفسیر طبری اور کشاف مفید ہیں۔ لیکن مفہوم آیت معلوم کرنے کے لیے ان کی طرف اسی وقت رجوع ہو جب تفسیرِ قرآن بالقرآن کے اصولوں کی روشنی میں آیت کا ایک قطعی مفہوم متعیّن ہو چکا ہو۔ تفاسیر سے تائید کی صورت میں مفہوم کی طرف سے مزید اطمینان حاصل ہوگا۔ لیکن اگر دونوں مفہومات میں اختلاف ہو تو قرآن سے براہ راست اخذ کردہ مفہوم کو ترجیح دی جائے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو متعلقہ آیات پر مزید تدبّر کی نگاہ ڈالی جائے۔ تفسیر کے ثانوی ماخذوں سے استفادہ کرنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔

---

[1] تفسیر قرآن کے اصول، ص ۹۲

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کتابیات

(۱) الاتقان فی علوم القرآن، امام جلال الدین سیوطی، طبع قاہرہ، ۱۹۷۴ء

(۲) البرهان فی علوم القرآن، علامہ بدرالدین زرکشی، قاہرہ، ۱۹۵۷ء

(۳) البیان فی علوم القرآن (مقدمہ تفسیر حقانی)، ابومحمد عبدالحق حقانی، طبع دہلی

(۴) البیان (ماہنامہ) امرت سر، دسمبر ۱۹۳۶ء

(۵) التفسیر والمفسرون، محمد حسین الذہبی، قاہرہ، ۱۹۶۱ء

(۶) التفہیمات الالٰهیة، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، طبع دہلی

(۷) التکمیل فی اصول التاویل، مولانا حمید الدین فراہیؒ، دائرہ حمیدیہ سرائے میر اعظم گڑھ، ۱۴۱۱ ہجری

(۸) الجواهر فی تفسیر القرآن الحکیم، شیخ طنطاوی جوہری، مصطفیٰ حلبی، ۱۳۴۰ھ

(۹) الجامع لاحکام القرآن، امام ابوعبداللہ قرطبی، دارالکتب مصر، ۱۳۵۳ھ

(۱۰) الاحکام فی اصول الاحکام، سیف الدین ابوالحسن علی آمدی، مطبعة المعارف مصر، ۱۳۳۲ھ

(۱۱) احکام القرآن، امام ابوبکر احمد جصّاص، المطبعة البهية المصرية، ۱۳۴۷ھ

(۱۲) الاحکام فی اصول الاحکام، ابومحمد علی بن احمد ابن حزم، طبع مصر

(۱۳) احیاء علوم الدین، امام ابومحمد غزالی، دارالکتب العربیة الکبریٰ مصر، ۱۳۳۴ھ

(۱۴) احیائے ملت اور دینی جماعتیں، الطاف احمد اعظمی، ادارہ تحقیقات واشاعت علوم قرآن،

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

علی گڑھ (یو پی)، ۱۹۹۹ء

(۱۵) الدّرا لمنثور فی تفسیر القرآن بالمأثور، امام جلال الدین سیوطیؒ، المطبعة المیمنیة مصر، ۱۳۱۴ھ

(۱۶) ازالة الخفاء، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مطبع صدیقی بریلی، ۱۲۸۶ھ

(۱۷) السیرة النبویة، ابن ہشام، قاہرہ، ۱۹۵۵ء

(۱۸) اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق رافعی، مصر، ۱۹۴۰ء

(۱۹) الفتوحات المکیه، شیخ محی الدین ابن عربی، دارالکتب العربیة الکبریٰ مصر

(۲۰) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اردو ترجمہ: مولوی رشید احمد، مکتبہ برہان، جامع مسجد دہلی۔

(۲۱) القاموس المحیط، مجد الدین فیروز آبادی، قاہرہ، ۱۹۱۳ء

(۲۲) المستدرك علی الصحیحین فی الحدیث، حاکم نیشاپوری، حیدر آباد، ۱۳۴۰ھ

(۲۳) المسند لامام احمد، احمد ابن حنبل، المطبعة المیمنیة مصر، ۱۳۱۳ھ

(۲۴) المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، المطبعة المیمنیة، مصر

(۲۵) الموافقات فی اصول الشرعیة، علامہ ابواسحاق شاطبی، المطبعة التجاریة الکبریٰ، مصر

(۲۶) ایمان وعمل کا قرآنی تصور، الطاف احمد اعظمی، ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ، ۱۹۸۶ء

(۲۷) بائبل، برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، لاہور، ۱۹۵۸ء

(۲۸) تاج العروس، سید محمد مرتضیٰ زبیدی، طبع کویت، ۱۹۶۶ء

(۲۹) تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی دہلی، ۱۹۸۹ء

(۳۰) تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، قاہرہ، ۱۹۳۶ء

(۳۱) تاریخ الرسل والملوک، محمد بن جریر طبری، طبع لیڈن، ۱۹۰۱۔۱۸۸۱ء

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

(۳۲) تاریخ قرآن، ڈاکٹر محمد رامیار، مؤسسہ انتشارات امیر کبیر، تہران، ۱۳۶۲ھ

(۳۳) تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیر)، حافظ ابن کثیر، المنار مصر، ۱۳۴۲ھ

(۳۴) تفسیر احسن الحدیث، طالب جوہری، نثار آرٹ پریس لاہور، ۲۰۰۲ء

(۳۵) تفسیر سورۃ الفاتحۃ، مفتی محمد عبدہ، المنار مصر، ۱۳۵۳ھ

(۳۶) تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار)، سید محمد رشید رضا، دار المنار مصر، ۱۳۶۵ھ

(۳۷) تفسیر القرآن، سر سید احمد خاں، خدا بخش لائبریری پٹنہ (عکسی اڈیشن)، ۱۹۹۵ء

(۳۸) تفسیر بیضاوی، قاضی بیضاوی شافعی، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۲۸۲ھ

(۳۹) تفسیر جلالین، جلال الدین محلی وجلال الدین سیوطیؒ، مطبع مجیدی کانپور (یوپی)

(۴۰) تفسیر فی ظلال القرآن، سید قطب شہیدؒ، طبع دار الشروق، ۱۹۸۵ء

(۴۱) تفسیر قرآن کے اصول، علامہ حمید الدین فراہیؒ، ترتیب وترجمہ: خالد مسعود، سنت اکیڈمی دہلی، ۲۰۰۳ء

(۴۲) تفسیر کبیر (مفاتیح الغیب)، امام رازی، المطبعۃ العامرۃ الشرفیۃ، ۱۳۰۸ھ

(۴۳) تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حیدر آباد دکن، ۱۱۹۶ھ

(۴۴) تفسیر نسفی، علامہ ابوالبرکات نسفی، دار احیاء الکتب العربیۃ، مصر

(۴۵) تفسیر نظام القرآن، مولانا حمید الدین فراہی، دائرہ حمیدیہ سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۹۹۰ء

(۴۶) تفہیم القرآن، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، دسمبر ۱۹۷۳ء

(۴۷) جامع البیان عن تاویل القرآن (تفسیر طبری)، محمد بن جریر طبری، قاہرہ، ۱۳۲۳ھ

(۴۸) جواہر القرآن، امام غزالی، کردستان، ۱۳۲۹ھ

(۴۹) حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، یونین پرنٹنگ پریس دہلی

(۵۰) خطبات اقبال، ایک مطالعہ، الطاف احمد اعظمی، دہلی، ستمبر ۲۰۰۱ء

(۵۱) دانش (فصل نامہ رایزنی فرہنگی، سفارت خانہ جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد پاکستان، ۱۹۸۴ میلادی

(۵۲) دائرۂ معارف اسلامیہ (اردو)، زیر اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۳۸۱/۱۹۶۲ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۵۳) دلائل النظام، مولانا حمید الدین فراہیؒ، دائرہ حمیدیہ سرائے میر، اعظم گڑھ، ۱۳۸۸ھ

(۵۴) دین حق، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۷۲ء

(۵۵) روح المعانی، علامہ آلوسی، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، مصر

(۵۶) سنن ابن ماجہ، ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ، طبع مصر

(۵۷) سننِ ابی داؤد، امام داؤد، قاہرہ، ۱۲۸۰ھ

(۵۸) سننِ بیہقی، امام ابوبکر بیہقی، حیدرآباد، ۱۳۴۴ھ

(۵۹) سنن الدارمی، ابومحمد عبداللہ الدارمی، دہلی، ۱۳۳۷ھ

(۶۰) سنن نسائی، امام نسائی، قاہرہ، ۱۳۱۲ھ

(۶۱) سیرت النبی، مولانا سید سلیمان ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۷ء

(۶۲) صحیح بخاری، امام بخاری، قاہرہ، ۱۳۴۸ھ

(۶۳) صحیح بخاری کا مطالعہ، مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی، فاؤنڈیشن فار اسلامک اسٹڈیز، رادھنہ کٹھور ضلع میرٹھ، ۲۰۰۲ء

(۶۴) صحیح مسلم، امام مسلم، قاہرہ، ۱۹۵۵ء

(۶۵) صفوۃ التفاسیر، محمد علی صابونی، طبع قطر، ۱۹۸۱ء

(۶۶) طبائع الاستعداد، سید عبدالرحمٰن کواکبی، مطبع الجمالیہ

(۶۷) عرائس البیان، ابومحمد روز بہان، طبع ہند، ۱۳۱۵ھ

(۶۸) فتح الباری، علامہ ابن حجر عسقلانی، قاہرہ، ۱۳۴۸ھ

(۶۹) قرآن مجید کی چار بنیادی اصطلاحیں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، (دوسرا اڈیشن) مکتبہ جماعت اسلامی، دارالسلام پٹھان کوٹ (پنجاب)

(۷۰) کشف بزدوی (کشف الاسرار)، علامہ علی بن محمد بزدوی، طبع بیروت، ۱۹۷۴ء

(۷۱) کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون، مصطفیٰ بن عبداللہ کاتب چلپی (حاجی خلیفہ)، مطبعۃ العام، ۱۳۱۰ھ

(۷۲) لسان العرب، ابن منظور، بولاق ۱۳۰۰ھ و طبع بیروت، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۶ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۷۳) مختصر تفسیر ابن کثیر، حافظ ابن کثیر، بیروت،۱۴۰۲/۱۹۸۱ء

(۷۴) مشکوٰۃ المصابیح، ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی، مطبع احمد دہلی، ۱۲۶۷ھ

(۷۵) المستصفیٰ ،امام غزالی ،طبع امیریہ،۱۳۲۴ھ

(۷۶) معالم التنزیل ،ابو محمد حسین الفراء بغوی، المطبعة التقدم العلمية مصر،۱۳۳۲ھ

(۷۷) مقدمة التفسیر،امام راغب اصفهانی، طبع الجمالية،۱۳۲۹ھ

(۷۸) مظاہر فطرت اور قرآن ،ڈاکٹر سید عبدالودود، مطبوعہ لاہور، اپریل ۱۹۸۸ء

(۷۹) مقدمہ ابن خلدون، عبدالرحمٰن ابن محمد ابن خلدون ،قاہرہ، ۱۹۵۷ء

(۸۰) مقدمه فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیة، طبع دمشق،۱۹۷۱ء

(۸۱) نظرية اعجاز القرآن عند عبدالقاهر الجرجانی: اسرار البلاغة و دلائل الاعجاز ، محمد حنیف فقیهی ،طبع قطر (الطبعة الاولیٰ)،۱۴۰۱/۱۹۸۱ء

(۸۲) نقوش لاہور (شخصیات نمبر)، مرتب: محمد طفیل ،مضمون: علامہ مشرقی ،از غلام جیلانی برق، اکتوبر ۱۹۵۶ء

(۸۳) وجود خدا کا اثبات قرآن اور سائنس کی روشنی میں ،الطاف احمد اعظمی، مطبوعہ جونپور، یوپی (انڈیا) ۱۹۷۸ء

(۸۴) Decline and Fall of the Roman Empire, by Gibbon, Modern Library, New York

(۸۵) The Hero as Prophet, by Thomas Carlyle, Islamic Service League, Bombay

(۸۶) The Life of Mahomet, by William Muir, ESQ,1957

3/299

www.kitabosunnat.com

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

ہماری نئی کتب

1۔اسلامی ناموں کا انسائیکلو پیڈیا

2۔روحانی بیماریوں کا قرآنی علاج

3۔جسمانی بیماریوں کا قرآنی علاج

4۔سفیرانِ رسول ﷺ

5۔مردوں عورتوں کی بیماریاں اور اُن کا علاج

6۔غازی علم دین شہید

7۔اصحابِ رسول ﷺ (جنہیں دُنیا میں ہی جنت کی خوشخبری دے دی گئی)(زیرِطبع)

8۔قرآن اور انسان (زیرِطبع)

9۔ایمان اور آخرت (زیرِطبع)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

ہماری دیگر مطبوعات

اسلامی ناموں کا انسائیکلوپیڈیا
مصنف: سعدیہ جاوید شیخ

روحانی بیماریوں کا قرآنی علاج
مصنف: علامہ محمد جاوید

جسمانی بیماریوں کا قرآنی علاج
مصنف: علامہ محمد جاوید

سفیرانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف: ابوالثاقب قادری

297.1229 656 ت ا
31299-EU-64

ISBN 969651005-5
9789696510055

حمزہ بک
17- الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور
Ph:042-37241723-0320-4161982
HAMZA BOOKS PUBLISHER